جنوری سنہ ۱۹۸۲ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ: بیس روپے

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت [illegible] اسلام کا اقتصادی نظام [illegible] قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ [illegible]
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام [illegible] سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام [illegible] اخلاق و فلسفۂ اخلاق [illegible] فہم قرآن [illegible] تاریخ ملت [illegible] صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد [illegible] بین الاقوامی سیاسی [illegible] حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم [illegible] اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم) [illegible] تاریخ [illegible]
[illegible] خلافت راشدہ [illegible]

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن [illegible] اسلام کا نظام حکومت [illegible] خلافت [illegible]

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد [illegible] قرآن کا [illegible] جلد اول

۱۹۴۵ء قصص القرآن [illegible] تعلیمات اسلام [illegible] اسلام کا اقتصادی نظام [illegible]

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد [illegible] جمہوریہ یوگوسلاویہ [illegible]

۱۹۴۷ء [illegible] حضرت [illegible] خلافت [illegible]
[illegible] لغات القرآن [illegible]

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ [illegible] خلافت [illegible]

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں [illegible] اسلام کے شاندار [illegible]
[illegible] تاریخ ملت [illegible]

۱۹۵۰ء تاریخ ملت [illegible] قرآن [illegible] اسلام کا نظام [illegible]
[illegible]

۱۹۵۱ء لغات القرآن [illegible] تاریخ ملت [illegible] خلافت [illegible]

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام [illegible] بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد [illegible]
[illegible] اور مرتب [illegible] کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت [illegible] قرآن [illegible] مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۸۸ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق جنوری ۱۹۸۲ء ، شمارہ نمبر ۱

نظرات

خوشی کی بات ہے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا بل جو کم و بیش دس برس سے امید و بیم کی منزل سے گذر رہا تھا اور جس کی وجہ سے یونیورسٹی کے اندر اور باہر بڑے بڑے ہنگامے ہوئے اور فسادات ہوئے اور جس کا غلغلہ ملک کے گوشہ گوشہ میں تو تھا ہی، بعض بیرونی ملکوں میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنی جاتی تھی، وہ پارلیمنٹ کے حالیہ اجلاس میں منظوری کی آخری منزل سے بخیر و خوبی گذر گیا اور قانون بن گیا، یونیورسٹی ایکٹ کی اس تیسری ترمیم (Third Amendment) میں یہ بات واضح طور پر کہہ دی گئی ہے کہ "یونیورسٹی کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کے لیے تعلیمی اور تہذیبی ترقی کا سر و سامان کرنا ہوگا" اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے جو ذرائع اور وسائل ہیں ان میں یونیورسٹی کو بہت کچھ خود مختاری دی گئی ہے، مثلاً یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یونیورسٹی کی مجالس حاکمہ (ایگزیکیٹو کونسل اور کورٹ) کو مزید اختیارات ہوں گے، ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی جو مسلمانوں کے مختلف اداروں کے نمائندے ہوں گے، البتہ جہاں تک طلباء اور اساتذہ کا تعلق ہے ان میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق و امتیاز نہیں ہوگا، سرسید کے زمانہ میں بھی اس درس گاہ کا دروازہ کبھی غیر مسلموں پر بند نہیں ہوا، تو اب کیوں بند ہوتا؟ اور یوں بھی پوری تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم اور رفاہ عام کے دوسرے کاموں میں کبھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں جانا۔

بڑی خوشی اس بات کی بھی ہے کہ تمام ممبروں نے (دو کمیونسٹ ممبروں کے علاوہ) پارٹی اور آئیڈیالوجی کے اختلاف کے باوصف اس بل کا خیر مقدم کیا، اور جب چار گھنٹے کی مختصر بحث و گفتگو

کرکے اس نے منظور کرلیا تو مجلس نے اس پر اپنی مسرت دلی کا اظہار چیئرز دے کر کیا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اس کو مسلمانوں کے لیے سال نو کا تحفہ قرار دیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسز اندرا گاندھی نے ۱۹۸۰ء میں الکشن کے وقت جس بات کا وعدہ مسلمانوں سے کیا تھا وہ اس خوبی سے پورا کرسکیں یا کر اس سے زیادہ نا ممکن تھا۔ مسلمانوں کو ان کا شکر گذار رہنا چاہیے اور ساتھ ہی یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جو بڑے صبر و استقلال اور عزم و حزم کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہی اور اس کی تکمیل کے لیے جد و جہد سے کبھی غافل نہیں ہوئی۔

لیکن مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سمجھنا اور یاد رکھنا چاہیے کہ اس بل کی منظوری کے بعد ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اب دنیا دیکھے گی کہ مسلمانانِ ہند نے یونیورسٹی کے مقصد کے مطابق اپنے اس عظیم الشان قومی و ملی ادارہ کو تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے کیا واقعی اتنا اونچا کر دیا ہے کہ ایک طرف وہ علوم و فنون اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم اور ان میں ریسرچ کے اعتبار سے ملک کی کسی بھی بڑی مشہور و نامور یونیورسٹی سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے اور دوسری جانب تہذیبی اعتبار سے یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء سب اعلیٰ اسلامی اخلاق و تہذیبی اقدار کے حامل ہیں جس کے باعث ان کا وجود نہ صرف اپنی ملت کے لیے بلکہ پوری قوم اور ملک کے لیے سرتاسر خیر و برکت ہو، جس طرح آج ہم آکسفورڈ اور کیمبرج کا نام لیتے ہیں تو معاً ذہن میں ان دونوں یونیورسٹیوں کے مخصوص علمی و تعلیمی معیار اور تہذیبی خصوصیات و امتیازات کا تصور ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے، دنیا دیکھے گی کہ انتظامی امور و مسائل اور معاملات دررولیست میں خودمختاری (Autonomy) حاصل ہونے کے بعد کیا مسلمانوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرح ایک مثالی یونیورسٹی بنانے کی غرض سے مخلصانہ اور سرگرم جد و جہد کا ازسرِ نو آغاز کر دیا ہے۔

ہمیں اس امر کا برملا اعتراف و اقرار کرنا چاہیے کہ گزشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی میں جو حالات و واقعات پیش آتے رہے ہیں انھوں نے یونیورسٹی کی شہرت و عظمت اساس کو دیرینہ روایات کو شدید مجروح کیا اور عظیم نقصان پہنچایا ہے، یونیورسٹی کا تعلیمی معیار افسوسناک حد تک پست ہوگیا ہے، ڈسپلن اساتذہ اور طلبہ دونوں میں مفقود ہے، انتظامیہ میں فرض شناسی کا جذبہ مضمحل اور کمزور ہے، کورٹ جو یونیورسٹی کی اعلیٰ اور با اختیار بہ حیثیت حاکمہ ہوگی اس کا فرض ہوگا کہ وہ روشن دماغی اور دقتِ نظر سے ان تمام حالات و واقعات اور ان کے وجوہ و اسباب کا جائزہ لے اور یونیورسٹی کی تعمیر نو کا ایک وسیع اور ہمہ گیر پروگرام لے کر عملی قدم کرے، لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ خود کورٹ کے ممبروں میں یونیورسٹی کے تعلیمی اور تہذیبی معاملات و مسائل کے بارہ میں اتحاد خیال و یک جہتی ہو، خلوص و دیانت اور مقصد کی تکمیل کے لیے دل میں تڑپ اور لگن ہو، مسلمان بے شبہ اقلیت میں ہیں لیکن اگر غیرت قومی اور حمیت ملی ہو تو یہی اقلیت میں ہونا فضل الٰہی ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس سے جوشش، ولولۂ کار اور اکثریت کے ساتھ تنازع للبقا کے میدان میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جنوبی ہند میں مسلمانوں کے بڑے بڑے ادارے جو ایجوکیشن اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے کس خاموشی اور جوشش سے کام کر رہے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان سے سبق لے سکتے ہیں، دنیا میں وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جو آئے دن نعرہ بازی، آہ زنی اور شکوے شکایت سے دور رہ کر اپنے تعمیری کاموں میں خلوص اور دیانت کے ساتھ معروف رہتی اور احتساب نفس کرتی رہتی ہے۔

خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں :

عصرِ جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اسکی نوعیت

از مولوی شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور ۵۔

تہذیب جدید کی ناکامی اور اس کا علاج :

لیکن سوال یہ ہے کہ ان فلسفوں اور ازموں نے انسانیت کو کیا دیا اور کون سے تمدنی و اجتماعی مسائل حل کر دیے ؟ ہاں اگر کچھ دیا ہے تو مایوسی، بے چینی، خود غرضی، عیاشی، رقابت اور بے مقصدیت دی ہے اور قسمہا قسم کے معاشرتی، قومی، لسانی، صوبائی اور بین الاقوامی جھگڑے فسادات پیدا کئے ہیں، جن کے بوجھ سے انسانیت کراہ رہی ہے۔

کوئی بھی فلسفہ اور نظام کائنات کے معموں کو کھول نہیں سکا اور خدا اور بندے کے درمیان حقیقی تعلقات کی گتھیوں کو سلجھا نہیں سکا، جس طرح کہ خود ساختہ سائنسی علوم انسان اور کائنات کے درمیان کوئی صحیح رشتہ دریافت کرنے میں ناکام رہے تھے۔

یہ مختلف فلسفے کیا ہیں ؟ ایک دوسرے کی تردید کرنے والے [illegible] کا مجموعہ اور متصادم نظریات کا مجموعہ مرکب ہیں۔ زندگی کے اصل مسائل کو کسی نے [illegible] کے دکھوں کا مداوا تلاش نہیں کیا، بلکہ سب کے سب [illegible] مفروضات [illegible] کھیل تماشوں میں الجھے ہوئے بلا وجہ اور بلا دلیل دعویٰ کرتے منتہائے مقصود تصور کئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر الکسس کیرل تہذیب جدید کی ناکامی اور موجودہ معاشرے سے اس کی عدم مطابقت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے :

" جدید تمدن اس لیے بہت مشکل ہوگیا ہے کہ وہ ہمارے مزاج کے موافق نہیں ہے اور ہماری حقیقی فطرت کا لحاظ کیے بغیر اس کی تخلیق ہوئی ہے ۔ یہ تمدن سائنس دانوں کے خیالی منصوبوں اور لوگوں کی دلی خواہشوں، موہوم خیالوں، نظریوں اور آرزوؤں کا پیدا کیا ہوا ہے ۔ اگرچہ یہ تمدن ہماری کوششوں سے بنا ہے تاہم وہ ہماری وضع قطع اور شکل وصورت کے مطابق نہیں ہے[1] "

تہذیب جدید کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب اس کے مذکورۂ بالا غلط اور متضاد فلسفے ہیں جنکو ہٹائے بغیر معاشرے کا سدھار نہیں ہوسکتا مگر یہ کام ہو تو کیوں کر ؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ جدید علوم وفنون کو مادہ پرستوں اور دہریوں کے قبضے سے نکال نہ لیا جائے ۔ بالفاظ دیگر ان غلط فلسفوں اور گمراہ کن ازموں کا صحیح مقابلہ اور استیصال کرنے اور صحیح نتائج پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے عوام سائنس اور علوم جدیدہ کو " مسلمان " بنایا جائے اور ان کی تشریح وتوجیہ خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اس طرح کی جائے کہ انسان اور کائنات کے تعلق سے تمام طبیعی (نیچرل) اور مابعد الطبیعی (سُوپر نیچرل) مسائل حل ہوجائیں[2] اور اس سے موجودہ عقلی واستدلالی ذہن مطمئن ہوجائے ۔ اس عظیم اور تجدیدی عمل کے ذریعہ مادیت کے تمام قلعے مسمار ہوجائیں گے ۔ مگر یہ کام اس وقت تک انجام نہیں پاسکتا جب تک کہ ان " غیر جانبدار علوم " کو غیروں کے تسلط اور چنگل سے چھڑا کر انھیں اپنی تولیت میں نہ لے لیا جائے اور ہم ان علوم کو اس وقت تک اپنی تولیت میں نہیں لے سکتے جب تک کہ ہم اُن پر پوری طرح قابض نہ ہوجائیں ۔ بالفاظ دیگر جب تک

---

[1] انسان نامعلوم، ترجمہ از پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری ایم اے، ص ۳۳، مطبوعہ حیدرآباد یونیورسٹی ۱۳۵۳ھ ۔

[2] یعنی ان کی تشفی بخش توجیہ ہو جائے جو عقل وذہن کو مطمئن کرسکے ۔

ہم ان علوم کے صحیح معنی میں وارث بن کر پھر سے علمی سیادت اور درجۂ امامت حاصل نہ کرلیں ہم علمی اعتبار سے کوئی ٹھوس اور پائیدار مرتبہ اقوام عالم کے درمیان حاصل نہیں کر سکتے۔ اور بغیر اس عمل کے کوئی ہمہ گیر فکری انقلاب لانا ممکن نہیں ہے۔ یہی خلافتِ ارض کا بنیادی فلسفہ اور اس کا پیغام ہے کہ جب تک اس کے روحانی اور مادّی دونوں حصوں کو اکٹھا نہیں کیا جاتا اس راہ میں ٹھوس اور مثبت کامیابی ممکن نہیں ہو سکتی۔

درحقیقت یہ ملحدانہ فلسفے اور نظامات اس لیے پیدا ہوئے کہ معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کو مظاہر فطرت اور اُن کے نظاموں کو من مانی تاویلات کرنے کا موقع مل گیا اور بالآخر تہذیب کے نام پر "بد تہذیبی" کے وہ گل کھلے جن کے خوفناک نتائج سے آج ہم سب دوچار ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے غلط رجحانات کو رد کرنے اور فکر انسانی کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لیے ایک بہت زیادہ مؤثر اور طاقتور عامل کی ضرورت ہے۔ یہ طاقتور عامل سوائے دین و مذہب کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور آج روئے زمین پر سوائے اسلام کے کسی بھی مذہب میں اتنی استعداد اور دم خم ہی نہیں ہے کہ دین اور فطرت کے صحیح حدود قائم کرکے معاشرے کو مختلف میدانوں میں ترقی کی راہ پر ڈالے اور اس کے ذہن و دماغ کو قابو میں رکھے۔ یہ صرف قرآن عظیم ہی کی ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ آج بھی یہ رہبرانہ کردار پوری کامیابی کے ساتھ اور احسن طریقے پر ادا کرکے نہ صرف پوری ملت اسلامیہ بلکہ سارے عالم انسانی کو قابو میں رکھنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن ہر دور کے لیے فیصلہ کن کلام:

امام ابن تیمیہ اپنی بے نظیر کتاب "موافقۃ صحیح المعقول لصحیح المنقول" (جو عقل و نقل کے حدود و ضوابط اور اُن دونوں کے درمیان معارضہ و محاکمہ کے سلسلے میں ایک عجیب و غریب کتاب ہے) میں اس مسئلے میں کہ "غیر منقولی چیزوں میں خوض جائز ہے یا نہیں

اور اگر جائز ہے تو اس کے وجوب کے کیا دلائل ہیں ؟" قرآن اور حدیث کے بہت سے نصوص پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ان تمام نصوص کی تفصیلات کتاب وسنت میں تلاش و تفحص اور بحث و استقراء کے بعد ان مسائل کے جاننے کے سلسلے میں واضح ہو جائیں گے لہذا جو شخص بھی انھیں کتاب وسنت میں تلاش کرے گا وہ انھیں قطعی نصوص کی شکل میں پائے گا۔ جو کہ غایت درجہ ہدایت، وضاحت اور شفا ہوں گی۔ اور یہ بات دو چیزوں سے متعلق ہے (۱) کتاب وسنت کے معانی کی معرفت (۲) ان الفاظ کے معنی کی معرفت جن کو اختلاف پیدا کرنے والے لوگ بولتے اور استعمال کرتے ہیں۔[له] اس طرح جب اُن دونوں اقوال (معانی قرآن اور معانی اہل غرض) کے درمیان مقابلہ وموازنہ کیا جائے گا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ کتاب الٰہی لوگوں کے مختلف اقوال (یا اختلافاتِ باہمی) کے درمیان ایک حاکم اور حکم کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۔ ط

(پہلے) تمام لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (جب ان میں اختلاف باہمی پیدا ہو گیا) تو اللہ نے پیغمبروں کو بشارت سنانے اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ (کتاب) لوگوں کے اختلافات کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ (بقرہ: ۲۱۳)

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۔ جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے (شوریٰ: ۱۰)

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

له یعنی مراد اہل غرض کی اصطلاحات ہیں۔

اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کر بیٹھو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ اور روز آخر پر یقین رکھتے ہو یہ بہتر بات اور اچھا انجام ہے۔ (نساء: ۵۹)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل کی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہے (مگر اس دعوے کے باوجود) وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمے کو طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس (طاغوت) کا انکار کریں۔ (لیکن) شیطان ان کو بھٹکا کر بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ (نساء: ۶۰)

حاصل یہ ہے کہ قرآن حکیم مطلقاً حجت ہے۔ اور جب کبھی کتاب وسنت کے نصوص اور مدعیانِ علم و حکمت کے اقوال کے درمیان مقابلہ کیا جائے گا تو اس سے نہ صرف کتاب وحکمت کی برتری ظاہر ہو جائے گی بلکہ "اختلاف الناس" کے درمیان محاکمہ بھی ہو جائے گا۔

یہ آیتیں صرف فقہی وشرعی امور ہی سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ تمام نظریاتی امور تک وسیع ہے جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ پہلی آیت اس مسئلے کی عمومیت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع انسانی کے باہمی نظریاتی اختلافات دور ہوں۔ اسی بنا پر امام موصوف نے اس آیت کریمہ کو سب سے پہلے ذکر فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم ایک ایسا حیرت انگیز سرچشمۂ علم و عرفان ہے کہ اس میں ہر دور کی ضرورتوں کے تعلق سے کافی وشافی جوابات اور ہر قسم کے فکری واجتماعی مسائل اور نوع انسانی

لہ بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول برحاشیہ منہاج السنۃ ۱/ ۴۹-۵۰ مکتبۃ الریاض الحدیثہ الریاض۔

کے باہمی اختلافات کا حل موجود ہے۔ اس کی آیات سے علوم و معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ متعین فکری پیمانوں سے ہٹ کر وسیع بنیادوں پر اس کی آیات پر غور کیا جائے۔ حکمت قرآن کا اصل اعجاز اس کے حیرت انگیز سیاق و سباق اور نظم کلام میں پوشیدہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے نظم کلام میں غور و فکر کے باعث مشکل سے مشکل تمام عصری مسائل حل ہو جاتے ہیں اور وہ ایک زندہ اور ابدی کلام نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر دور میں اس کے عجائب و اسرار ظاہر ہوتے رہیں گے اور اس اعتبار سے اس کی نئی نئی تفسیریں بھی وجود میں آتی رہیں گی۔ مگر کوئی بھی تفسیر کبھی مکمل نہ ہوسکے گی بلکہ ہر دور میں ایک نئی تفسیر کی ضرورت برابر باقی رہے گی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ کہہ دو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کے (لکھے جانے) کے لیے تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے اسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔ (کہف: ۱۰۹)

صحف سماوی میں حجم کے اعتبار سے اس چھوٹی اور مختصر ترین کتاب میں وہ تمام علوم و معارف ودیعت کر دیے گئے ہیں جن سے نوع انسانی کا قیامت تک سابقہ پڑ سکتا ہے بلکہ ان کے مسائل و مشکلات کا جواب بھی مہیا ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی پوری تاریخ میں یہ واحد اور بے مثال کتاب ہے جو چودہ سو سال سے ایک حرف یا ایک زیر زبر کی تبدیلی کے بغیر نہ صرف پوری طرح محفوظ ہے بلکہ وہ تمام اقوام عالم اور ان کے تمام علوم و فنون کی بھی ایک مختصر ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ غیر مسلم تو غیر مسلم بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان بھی اس نظریہ کی صحت میں شک کرتے ہیں جو ان کی اپنی کوتاہ بینی اور کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ علم الٰہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن حکیم چونکہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ کلامِ الٰہی ہے جو علم الٰہی کا پرتو ہے اور علم الٰہی ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں کو محیط ہے اور اس کے علم ازلی سے نہ صرف مظاہر عالم کی ساخت و پرداخت سے متعلق تفصیلات بلکہ خود نوع انسانی کے انفرادی و اجتماعی

...حوال وکوائف سے متعلق کوئی بھی جزئیات اور کلیہ پوشیدہ نہیں ہے، ورنہ ہزاروں سال قبل ...ان احوال وکوائف کی اس درجہ باریک بینی کے ساتھ پیش خبری نہ کی جاتی اور موجودہ واقعات ...حادث صحیفۂ خداوندی کی تصدیق وتائید نہ کرتے۔

قرآن حکیم جیسے ابدی صحیفے کو ایک جامد اور غیر متحرک کلام تصور کرنا نہ صرف کوتاہ ... اور بے بصیرتی ہے بلکہ یہ نہایت درجہ بے اصل اور واہیات بات ہے۔ گویا کہ وہ بھی دیگر ...ار رفتہ صحف سماوی کی طرح عارضی اور موقّت صحیفہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے ...عمل اور زندہ صحیفہ ہے۔

...ندہ اور پیش پا افتادہ مسائل سے بحث کرتا ہے، جو اُس کے من جانب اللہ ہونے کی ... اور یقینی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے حسب ذیل آیات کریمہ ہر دور میں اپنی عمومیت وقطعیت ...لالت کرتی رہیں گی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ ... ط آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور ...رے لیے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا۔ (مائدہ : ۳)

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ: بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقے کی ...ت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ (بنی اسرائیل : ۹)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ج یہ (پوری) نوع انسانی ...لیے رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور (حق و باطل میں) تفریق کرنے والے دلائل موجود ہیں۔ (البقرہ: ...)

هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ ط یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے رُو برو ...ٹھیک بول رہی ہے۔ (یعنی ہر دور کے احوال وکوائف پر پوری طرح منطبق ہو رہی ہے۔ ...ہ : ۲۹)

کے باہمی اختلافات کا حل موجود ہے۔ اس کی آیات سے علوم و معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ متعین فکری پیمانوں سے ہٹ کر وسیع بنیادوں پر اس کی ابدی آیات پر غور کیا جائے۔ حکمت قرآن کا اصل اعجاز اس کے حیرت انگیز سیاق و سباق اور نظم کلام میں پوشیدہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے نظم کلام میں غور و فکر کے باعث مشکل سے مشکل تمام عصری مسائل حل ہو جاتے ہیں اور وہ ایک زندہ اور ابدی کلام نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر دور میں اس کے عجائب و اسرار ظاہر ہوتے رہیں گے اور اس اعتبار سے اس کی نئی نئی تفسیریں بھی وجود میں آتی رہیں گی۔ مگر کوئی بھی تفسیر کبھی مکمل نہ ہو سکے گی بلکہ ہر دور میں ایک نئی تفسیر کی ضرورت برابر باقی رہے گی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ کہہ دو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کے (لکھے جانے) کے لیے تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے اسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔ (کہف: ۱۰۹)

صحف سماوی میں حجم کے اعتبار سے اس چھوٹی اور مختصر ترین کتاب میں وہ تمام علوم و معارف ودیعت کر دیے گئے ہیں جن سے نوع انسانی کا قیامت تک سابقہ پڑ سکتا ہے بلکہ ان کے مسائل و مشکلات کا جواب بھی مہیا ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی پوری تاریخ میں یہ واحد اور بے مثال کتاب ہے جو چودہ سو سال سے ایک حرف یا ایک زیر زبر کی تبدیلی کے بغیر نہ صرف پوری طرح محفوظ ہے بلکہ وہ تمام اقوام عالم اور ان کے تمام علوم و فنون کی بھی ایک مختصر ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ غیر مسلم تو غیر مسلم بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان بھی اس نظریہ کی صحت میں شک کرتے ہیں جو ان کی اپنی کوتاہ بینی اور کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ علم الٰہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن حکیم چونکہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ کلامِ الٰہی ہے جو علم الٰہی کا پرتو ہے اور علم الٰہی ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں کو محیط ہے اور اس کے علم ازلی سے نہ صرف مظاہر عالم کی ساخت و پرداخت سے متعلق تفصیلات بلکہ خود نوع انسانی کے انفرادی و اجتماعی

احوال و کوائف سے متعلق کوئی بھی جزئیہ اور کلیہ پوشیدہ نہیں ہے، ورنہ ہزاروں سال قبل ان احوال و کوائف کی اس درجہ باریک بینی کے ساتھ پیش خبری نہ کی جاتی اور موجودہ واقعات وحوادث صحیفۂ خداوندی کی تصدیق و تائید نہ کرتے۔

قرآن حکیم جیسے ابدی صحیفے کو ایک جامد اور غیر متحرک کلام تصور کرنا نہ صرف کوتاہ فہمی اور بے بصیرتی ہے بلکہ یہ نہایت درجہ بے اصل اور واہیات بات ہے۔ گویا کہ وہ بھی دیگر از کار رفتہ صحف سماوی کی طرح عارضی اور موقت صحیفہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اور زندہ صحیفہ ہے۔

جو زندہ اور ہمیشہ پائندہ مسائل سے بحث کرتا ہے جو اس کے من جانب اللہ ہونے کی قطعی اور یقینی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے حسب ذیل آیات کریمہ ہر دور میں اپنی عمومیت و قطعیت پر دلالت کرتی رہیں گی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا۔ (مائدہ : ۳)

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ : بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ (بنی اسرائیل : ۹)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ج یہ (پوری) نوع انسانی کے لیے رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور (حق و باطل میں) تفریق کرنے والے دلائل موجود ہیں۔ (البقرہ : ۱۸۵)

هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے رو در رو ٹھیک ٹھیک بول رہی ہے۔ (یعنی ہر دور کے احوال و کوائف پر پوری طرح منطبق ہو رہی ہے۔ (جاثیہ : ۲۹)

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰہُ یَہْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝
یقیناً ہم نے ایسی نشانیاں اُتار دی ہیں جو پوری طرح (متعلقہ مسائل کی) وضاحت کرنے والی ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے (اس وضاحت کے مطابق) صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ (نور: ۴۶)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَکْفُرُ بِہَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝ یقیناً ہم نے تمہارے پاس روشن دلائل بھیج دیے ہیں، جن کا انکار محض بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ (بقرہ: ۹۹)

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَہْوَآءَہُمْ بَعْدَ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ اور اسی طرح ہم نے قرآن کو (ہر دور کے لیے) ایک واضح فیصلہ بنا کر اُتارا ہے (لہذا) علم (الٰہی) کے آچکنے کے بعد اگر تم نے (اس علم اور فیصلے کو ترک کرکے) لوگوں کی خواہشات (باطل افکار و آراء) کی پیروی کی تو خدا کی جانب سے تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔ (رعد: ۳۷)

اس آیت کریمہ میں لفظ "اھواء" خاص طور پر قابل غور ہے جو اصل میں غیر خدائی نظاموں اور باطل فلسفیانہ افکار و آراء کی ایک مشترکہ خصوصیت کا انکشاف کرتے ہوئے ان کے اصل عزائم کو واضح کر رہا ہے۔ اصل میں ان باطل فلسفوں اور نظاموں کے پیچھے سوائے خود غرضیوں، اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے سوا کوئی دوسرا اعلیٰ و ارفع مقصد کارفرما نہیں ہوتا، چاہے وہ کمیونزم اور سوشلزم ہو یا ڈارونزم اور فرائڈ ازم وغیرہ وغیرہ۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مگر جو کوئی ان افکار و آراء کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے تجزیہ کرے گا وہ بہر حال اسی نتیجے تک پہنچے گا۔ کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کا کمال ملاحظہ ہو کہ محض ایک لفظ کے ذریعہ تمام غیر خدائی فلسفوں اور کل افکار و آراء کی بنیادی روح کھینچ کر رکھ دی! یہ ہوتی ہیں کلام الٰہی کی اعجاز آفرینیاں!

پھر اس آیت کریمہ میں رسول کے واسطے سے پوری اُمت محمدیہ سے خطاب ہے کہ اگر تم نے خدائی علم اور فیصلے کو ترک کر کے کسی بھی وقت اور کسی بھی زمانے میں باطل افکار و آرا اور باطل نظاموں سے متاثر و مرعوب اور اُن کے علمبردار بن گئے تو پھر اللہ کے نزدیک تم سے بڑھ کر بے سہارا اور زیاں کار کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس تمام واضح دلائل و براہین آ چکے ہیں۔

جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ یہود کے بارے میں (تحویلِ قبلہ کے موقع پر) ارشاد فرمایا گیا: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اور اگر تم نے ان کے خواہشات کی پیروی کی تمہارے پاس علم آ چکنے کے بعد تو اُس وقت تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا۔ (بقرہ: ۱۴۵)۔

یہ باطل پرست لوگ یا موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق مختلف خودساختہ تہذیبوں اور نظاموں کے علمبردار اپنے خود غرضانہ اغراض و مقاصد کو فروغ دینے اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ تمام خدائی نشانات و دلائل سے اعراض کرتے ہوئے آنکھیں موند لیتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور تم ایسے لوگوں کے باطل خیالات کی پیروی مت کرنا جو ہماری (شرعی و تکوینی ہر قسم کی) نشانیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ (انعام: ۱۰۵)

قرآن حکیم کا کمال ملاحظہ ہو کہ وہ ہر دور کے منکرین کی نفسیات اور اُن کے ذہنی احوال و کوائف کے مشترکہ بنیادی نکات کی نشان دہی (بہت واضح الفاظ میں) کر دیتا ہے جو ہر دور میں یکساں طور پر صادق آ سکتے ہیں۔ گویا کہ منکرین و معاندین اور خدا بیزار لوگوں کی ذہنیت ہمیشہ ایک اور یکساں رہتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیات جس طرح دورِ رسالت میں صادق آ سکتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرح آج بھی صادق آتی ہیں اور قیامت

اب تک پیش کیا ہے)، اسی طرح وہ اپنی دلیل واستدلال کی قوت اور حجت وبرہان ہونے کی حیثیت سے بھی ایک مکمل مجموعہ ہے، جس میں قیامت تک پیش آنے والے ہر قسم کے نظریاتی احوال کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، خواہ زمانہ کتنا ہی ترقی یافتہ (Advanced) کیوں نہ ہو جائے۔ اُسی طرح اُس میں وہ تمام علوم وفنون اور اُن کے بنیادی نکات بھی ودیعت کردیئے گئے ہیں جو اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کی راہ میں اقوامِ عالم کے خلاف فیصلہ کن مقام رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی بھی دور میں عصری علوم وفنون کے مطالعے اور جائزے کے بموجب قرآن عظیم کا مطالعہ کیا جائے گا تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا اس میں اپنے ہی دور کی داستان موجود ہے اور ہم اپنے ہی احوال وکوائف کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم ایک آئینۂ صافی ہے جس میں ہر دور والوں کو اپنا ہی چہرہ نظر آتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہی اپنے چہرے کے "داغ دھبے" نمایاں ہو جائیں گے۔ یہ ہے قرآن عظیم کا صحیح اور عظیم الشان معجزہ اور اس کی بے مثال رہنمائی، جو اس کے سب سے بڑے وصف "فرقان" ہونے کے عین مطابق ہے۔

اس طرح آپ کسی بھی اعتبار سے اس عظیم الشان اور انوکھی وحیرت انگیز کتاب حکمت میں — جو دنیا کی پوری تاریخ میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے — غور فرمائیے تو آپ اس کو ہر ہر لحاظ سے جامع اور مکمل پائیں گے، اس طرح کہ پھر اس کی موجودگی میں کسی دوسرے صحیفہ یا کتاب سے راہ ہدایت حاصل کرنے کی ضرورت قطعاً باقی نہیں رہے گی۔

موجودہ چیلنج کا مقابلہ :

بات کچھ طویل ہو گئی — بہرحال ایک طرف تو یہ مادی فلسفے اور نظریات ہیں جن سے آج ہم کو نبرد آزمائی کرنی ہے تو دوسری طرف جدید فقہی، تمدنی اور عائلی ومعاشرتی مسائل ہیں جن کا اسلامی اور فقہی نقطۂ نظر سے حل تلاش کر کے اسلام کو ایک کامل اور ابدی دین — عملی وواقعاتی نقطۂ نظر سے بھی — ثابت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اب سے چند سال پہلے جب امریکی خلا باز پہلی مرتبہ سرزمین چاند پر پہنچے تو اس وقت خیالات کی دنیا میں ایک انتشار

بنا ہو گیا اور طرح طرح کے فکری و اعتقادی سوالات پیدا ہو گئے۔ اسی طرح آج کل ٹسٹ ٹیوب بے بی، اسقاط حمل وغیرہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل نے علمی حلقوں کو خاصا پریشان کر رکھا ہے کہ اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے نسلی، نسبی اور وراثتی مشکلات اور پیچیدگیوں کو کیوں کر حل کیا جائے؟ نیز اسی طرح انسانی اعضا کی پیوندکاری، بیمہ، انشورنس، غیر سودی بینکاری، رویت ہلال کے مسائل و مشکلات اور بہت سے جدید مسائل مسائل جو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں، ان تمام میں کوئی متفقہ موقف اختیار کر کے امتِ مسلمہ کو فکری انتشار سے بچانا ضروری ہے مگر ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلامی علوم کے علاوہ خود متعلقہ علوم اور ان کے مسائل کی گہرائیوں میں بھی غوطہ زنی کرنی ضروری ہے ورنہ سطحی غور و فکر سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اس طرح آج دینِ اسلام کے علمبرداروں کو مختلف میدانوں میں جو علمی لڑائی لڑنی ہے مگر اس عظیم کام کے آغاز کے لیے ہم کو سب سے پہلے حکمتِ قرآن کو ایک مکمل فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنا ضروری ہے، جس میں دین کے تمام اجزا و ارکان کی تشریح و توجیہہ موجودہ عقلیت و ذہنیت کے مطابق موزوں طریقے پر مکمل ہو جائے اور وہ اپنے ابدی اور لازوال سچائیوں کی بدولت بنیادی طور پر اس غلط اور بے بنیاد نظریے کی بیخ کنی کر دے کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک پرانا اور فرسودہ نظریۂ حیات ہے یا وہ آج کے حالات اور جدید معاشرے پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ نہ صرف ہر حال میں عالم انسانی کی ہر حیثیت سے پوری پوری رہنمائی کر سکتا ہے بلکہ موجودہ باطل فلسفوں کا بھی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔ غرض موجودہ دنیا کی علمی و فکری سیادت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے فلسفۂ حیات کی تشریح و توجیہہ اس طرح کریں کہ علمی و آفاقی دلائل کی روشنی میں نہ صرف اسلامی افکار و نظریات، اس کے اقدار اور اس کے نظام حیات کی موجودہ تمام نظاموں پر برتری ثابت ہو جائے بلکہ تمام جدید فلسفے اور نظریات بھی اس کے مقابلہ میں مہمل اور افکار پریشاں (یا اضغاث احلام)

نظر آنے لگیں۔

مگر اس فکری قیادت کی مکمل بازیافت اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لیے مادی میدانوں میں بھی ہماری کامیابی ضروری ہوگی۔ کیونکہ محض خالی خولی فلسفوں سے کبھی کام نہیں چل سکتا۔ اور خود فلسفہ بھی — اپنے صحیح معنی اور معیار کے اعتبار سے — بغیر مادی کامیابی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فلسفہ ہمیشہ احساس برتری کی پیداوار ہوتا ہے اور احساس برتری پیدا کرنے کے لیے مادی میدان میں بھی ہماری کامیابی ضروری ہے جو ہمارے انجنوں کے لیے گویا کریٹ ڈل کا کام دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں احساس برتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی فکری قوتیں — علمی و مادی دونوں حیثیتوں سے — بیدار ہونے اور ذہنی گرہیں کھلنے لگ جاتی ہیں اور تخلیق و اجتہاد کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ذہنی ارتقاء اور تحقیق و اکتشاف میں تقدم و برتری حاصل کرنے کے لیے مادی حیثیت سے بھی تقدم و برتری حاصل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ پسماندگی اور احساس کہتری میں مبتلا کوئی قوم کوئی تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ اور موجودہ دور کے احوال شاہد ہیں۔

ان بنیادی اقدامات کے بغیر کوئی ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب لانا مشکل ہے اور اس قسم کے ذہنی و فکری انقلاب کے بغیر عالم انسانی کی مکمل اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔

حاصل بحث یہ ہے کہ آج ہم کو بنیادی طور پر بیک وقت دو میدانوں میں کام کرنے اور ان میں خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ ہر ممکن طریقے سے سائنسی علوم کو ترقی دے کر صنعت اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلم معاشرے کو آگے بڑھانا اور اسے صفِ اول کی ترقی یافتہ قوموں میں لا کھڑا کرنا۔

۲۔ سائنسی علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے پیدا ہونے والے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنا۔

پہلا فریضہ خصوصیت کے ساتھ ماہرینِ سائنس پر عائد ہوتا ہے اور دوسرا فریضہ خصوصیت کے ساتھ علمائے اسلام پر۔ اس دوسرے فریضے کی صحیح ادائیگی ہی کے باعث مسائل کی تنقیح کے ضمن میں ـــ معروف ومنکر کے نئے نئے پہلو واضح ہوتے جائیں گے، جن کے ذریعہ نوعِ انسانی کی بخوبی اور مؤثر طور پر رہنمائی ہوتی رہے گی۔

منصب خلافت کا یہ وہ اعلیٰ مقام اور بلند نصب العین ہے جو کسی بھی وقت ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ جب تک یہ منصب عظیم حاصل نہ ہوگا درجۂ امامت بھی ـــ دنیا کی علمی وفکری سیادت ـــ مکمل طور پر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ اللہ کی عجیب وغریب حکمت ہے کہ اس نے اس عالم رنگ وبو میں دو قسم کے علوم کا سلسلہ جاری فرمایا۔ ایک وہ علم جس کو انسان اپنے تجربات ومشاہدات کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے اور دوسرے وہ جس کو انسان اپنے تجربات ومشاہدات کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا۔ علم اول کو انسان کی عقل وبصیرت پر اعتماد کرتے ہوئے چند بنیادی اصولوں کے ساتھ اُس کی فہم وبصیرت پر چھوڑ دیا اور علم ثانی کو چند مخصوص بندوں کے ذریعہ پہنچایا گیا، جن کو اصطلاح میں انبیاء اور رُسل کہا جاتا ہے۔ اب علم اول کو جو مشاہدات وتجربات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر علم ثانی (علم شریعت) کا مؤید ومعاون بلکہ خادم اور حاشیہ بردار نظر آتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ علم ثانی برحق اور من جانب اللہ ہے۔ ورنہ ہزاروں سال بعد کی تحقیقات جو بالکل آزادانہ طور پر کی گئی ہیں اس علم کی تصدیق وتائید کبھی نہ کرتیں۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور فطرت وشریعت کے باب میں اس کی انوکھی منصوبہ بندی جو نوعِ انسانی پر اتمام حجت کے لیے بہت زیادہ مؤثر اور بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کسی ایک جگہ یا کسی ایک موقع پر بھی نظامِ فطرت کی مذمت نہیں کی اور اس کو خلافِ دین یا خلافِ شریعت قرار نہیں دیا۔ بلکہ دین اور فطرت کے صحیح حدود وقیود متعین کر کے تجرباتی علوم میں تحقیق وتفتیش کرنے اور مادی میدانوں میں آگے بڑھنے کی پوری پوری آزادی دے دی۔

دوسرے مذاہب کی طرح رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا اور مادہ اور معدہ کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ وہ مادیات اور روحانیات کا انتہائی کامیاب سنگم اور ان دونوں کی آمیزش کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ اور الف سے یا تک اس کی تعلیمات میں یہ پہلو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے، تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت و شریعت میں کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے اور ایک ہی مبدأ فیض کی جانب سے جاری شدہ ہیں۔ کائنات اور اس کے مظاہر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور دین و شریعت کا نظام بھی اسی کی طرف سے جاری کردہ ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں تصادم کس طرح ہو سکتا ہے؟[1] مگر یہ بنیادی حقیقت کلیسائی علمبرداروں کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی، جس کے باعث کلیسا اور سائنس کے علمبرداروں کے درمیان معرکہ آرائیوں کا وہ طویل اور تاریخی سلسلہ چل پڑا جو بالآخر مذہب کی مکمل شکست پر منتہی ہوا۔ لیکن یہ تاریخ پھر دوبارہ کبھی نہیں دہرائی جانی چاہیے۔

---

[1] علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: "صحیح اور بین عقلی دلیلیں نیز ضروری فطری علوم انبیاء کی معلومات اور تعلیمات انبیاء کے عین موافق ہیں نہ کہ ان کے مخالف۔" ان الادلة العقلية الصحيحة البينة التي لا ريب فيها، بل العلوم الفطرية الضرورية توافق ما أخبرت به الرسل لا تخالفه۔ (موافقة صحيح المعقول لصريح المنقول، ص ۹۶، مطبوعہ ریاض)

موجودہ دور کے حکیم ہربرٹ اسپنسر نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ "علم طبیعی دین سے نہیں ٹکراتا بلکہ ان دونوں کا باہمی تال میل ایک دوسرے کی تائید و تقویت کا باعث ہے۔" (ملاحظہ ہو تفسیر الجواہر ۱/ ۳۸، طبع اول)

نوٹ: یہ مقالہ راقم الحروف کی نئی کتاب "اسلام کی نشأة ثانیہ: قرآن کی نظر میں" کا ایک باب ہے جو مجلس تحقیقات اسلامی کراچی سے شائع ہو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کی شکست و ریخت محض اس کی ناقص تعلیمات اور اس کے ارباب فکر کی بداندیشی کا نتیجہ تھی۔ عیسائی مذہب میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ وہ زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتا اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے حاملین کی کوئی واضح رہنمائی کرتا۔ یہ صرف اسلام اور قرآن عظیم کی خصوصیت ہے کہ وہ قیامت تک ہر دور میں اور ہر قسم کے حالات کے تحت اپنے حاملین کی صحیح اور کامل رہنمائی کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے دیکھیے تو وہ آج بھی ایک زندہ اور ابدی مذہب اور زندہ و مکمل صحیفۂ ہدایت نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے علمائے اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عصر جدید کے تمام علوم و فنون کو کھنگال ڈالیں اور اس بات کا نہایت درجہ بصیرت اور دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیں کہ یہ علوم وفنون دین برحق کی کس حیثیت سے تصدیق و تائید کر رہے ہیں اور موجودہ الحاد و لادینیت کے استیصال کے لیے ان سے کس درجہ قیمتی مدد مل سکتی ہے۔!

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تجرباتی علوم وفنون دین برحق کے خادم اور اس کے حاشیہ بردار ہیں۔ ہمیں ان سے خوف کھانے یا دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ انھیں پوری طرح اپنا کر فطری و نظریاتی اعتبار سے عالم انسانی کی صحیح اور بروقت رہنمائی کرنی ہے۔

فہرست مراجع و مآخذ:

۱۔ قرآن مجید۔

۲۔ تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر منار) ۴ علامہ محمد رشید رضا، دار المعرفۃ، بیروت۔

۳۔ ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم (یعنی تفسیر ابو السعود)، محمد بن محمد مصطفیٰ ابو السعود الحنفی، متوفی ۹۸۲ھ، مطبوعہ برحاشیہ تفسیر کبیر۔

۴۔ الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم (تفسیر جواہر)، شیخ طنطاوی جوہری، مصطفی البابی الحلبی و اولادہ، مصر، ۱۳۵۰ھ۔

۵۔ تفسیر معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع، دیوبند۔

۶۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلوی، لاہور، ۱۳۷۱ھ۔

۷۔ المفردات فی غریب القرآن، امام راغب اصفہانی، دارالمعرفۃ، بیروت۔

۸۔ القرآن والعلوم العصریۃ، شیخ طنطاوی جوہری، مصر، ۱۳۷۱ھ۔

۹۔ لسان العرب، ابن منظور، داربیروت للطباعۃ والنشر، بیروت، ۱۹۶۸ء

۱۰۔ صحیح مسلم، امام مسلم نیشاپوری، مرتبہ محمد فواد عبدالباقی، ریاض۔

۱۱۔ سنن ترمذی، امام ابوعیسیٰ ترمذی، مطبوعہ مصر۔

۱۲۔ حجۃ اللہ البالغہ، امام شاہ ولی اللہ دہلوی، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۱۳۔ موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول، امام ابن تیمیہ، برحاشیہ منہاج السنۃ، دارالافتاء، ریاض۔

۱۴۔ احیاء علوم الدین، امام ابوحامد غزالی، دارالمعرفۃ، بیروت۔

۱۵۔ الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان، امام ابن تیمیہ، دارالافتاء، ریاض۔

۱۶۔ طریق الہجرتین وباب السعادتین، علامہ ابن قیم، مرتبہ شیخ عبداللہ بن ابراہیم انصاری، قطر۔

۱۷۔ مدارج السالکین شرح منازل السائرین، علامہ ابن قیم۔

۱۸۔ الفتوحات المکیۃ، محی الدین ابن العربی (بحوالہ تفسیر منار)

۱۹۔ شرح عقائد النسفی، ملا سعدالدین تفتازانی، نولکشور، لکھنؤ۔

۲۰۔ شرح فقہ اکبر، ملا علی قاری، مطبع مجیدی کانپور، ۱۳۴۵ھ

۲۱۔ میبذی، حسین بن معین الدین میبذی، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۷۱ھ

۲۲۔ التصریح فی شرح التشریح، امام الدین بن لطف اللہ، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۷۱ھ

۲۳۔ چغمینی (مع شرح) محمود بن چغمینی، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۸۷ھ

۲۴۔ تہافت الفلاسفۃ، امام ابوحامد محمد بن محمد غزالی۔

۲۵- مقاصد الفلاسفة، امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی،
۲۶ مراج اللامدة، عبد الرحمٰن حسن جنکہ، دمشق، ۱۹۷۳ء
۲۷- الشیوعیة ولیدة الصہیونیة، احمد عبد الغفار عطار، جدہ (بیروت)
۲۸- مؤامرة الصہیونیة علی العالم، " " مکہ مکرمہ
۲۹ بروتوکولات صہیون، " " "
۳۰- الیہود والجریمة، عبد المنصف محمود، مصر-
۳۱- حقیقة الماسونیة، محمد علی زعبی، بیروت-

اردو کتب :-

۳۲- سیرت النبی، جلد چہارم، علامہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ-
۳۳- علم الکلام، علامہ شبلی نعمانی، مطبع مفید عام، آگرہ-
۳۴- الکلام، " " شبلی بک ڈپو لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ
۳۵- مذہب و عقلیات، مولانا عبد الباری ندوی، علی گڑھ، ۱۳۳۸ھ
۳۶- مذہب اور سائنس، " " " لکھنؤ-
۳۷- عقلیات ابن تیمیہ، مولانا محمد حنیف ندوی، لاہور
۳۸- مذہب و تمدن، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء
۳۹- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، علامہ اقبال، ترجمہ از سید نذیر نیازی، لاہور، ۱۹۵۸ء
۴۰- مقالات شبلی، حصہ ہفتم، علامہ شبلی نعمانی، اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء
۴۱- اسلام دوراہے پر، محمد اسد، مترجم رحم علی ہاشمی، دہلی، ۱۹۶۸ء
۴۲- قرآن اور علم جدید، ڈاکٹر رفیع الدین، لاہور، ۱۹۵۹ء
۴۳- نامعلوم انسان، الکسس کیرل، مترجم محمد یوسف کوکن، ایم، اے، مدراس یونیورسٹی
مدراس، ۱۹۵۳ء-

۴۴۔ اسرار نبوت، محمد شہاب الدین ندوی، فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور، ۱۹۷۲ء

۴۵۔ چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں، محمد شہاب الدین ندوی، فرقانیہ اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

۴۶۔ تاریخ فلسفۂ جدید، ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ، مترجمہ خلیفہ عبدالحکیم، حیدرآباد، ۱۹۳۱ء

۴۷۔ تاریخ فلسفہ، کلیمنٹ ویب، مترجمہ مولوی احسان احمد، کراچی، ۱۹۶۹ء

۴۸۔ تنقید عقل محض، امانوئل کانٹ، مترجمہ سید عابد حسین، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء

۴۹۔ حکمائے اسلام، مولانا عبدالسلام ندوی، اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء

۵۰۔ وحدت الوجود، مولانا عبدالعلی انصاری، مترجمہ شاہ زید الحسن، دہلی، ۱۳۹۱ھ

۵۱۔ ایٹم آپ کا خادم، مترجمہ سلیمان صابر، نئی دہلی، ۱۹۵۷ء

۵۲۔ ایٹم کی کہانی، راج نرائن راز، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۵۳۔ سورج کی پیدائش اور موت، جارج گیمو، مترجمہ فاروق احمد، لاہور، ۱۹۶۲ء

انگریزی کتب:

54- Asimov's Guid to Science, vol. 1, Pelican Books, England, 1979.

55- New Frontiers in Astronomy, Readings from Scientific American), W.H. Freeman and Company, San Francisco, 1975

56- A Short History of Astronomy, By Arthur Berry, Dover Publications, New York, 1961

57- A Dictionary of Science, Penguin

Books, England, 1977.

58- The Encyclopedia of Ignorance, Edited by Ronald Duncan and Miranda Weston-Smith, Pergamon Press, Oxford, 1978.

خانوادۂ ولی اللّٰہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

حضرت شاہ ولی اللہ (احمد بن عبدالرحیم) محدث دہلوی، ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کے اجداد اور خاندانی بزرگوں کے متعلق خود حضرت شاہ صاحب کی تالیفات میں کافی معلومات اور مستند مواد مل جاتا ہے اور بعض تذکرہ نگاروں نے بھی اس سمت میں مفید کاوشیں رفت کی ہے مگر حضرت موصوف کے صاحبزادگان کی اولاد، اور ان کے بعد کے سلسلوں سے ناواقفیت عام ہے جس کی وجہ سے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کو بڑی دقتیں پیش آتی تھیں اور سخت مغالطے ہوتے تھے۔

پچھلے دنوں حضرت شاہ ولی اللہ کی جائے پیدائش اور آبائی وطن پھلت (ضلع مظفر نگر یو۔پی) میں ایک قلمی یادداشت راقم سطور کی نظر سے گزری[۱] جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کے ننہیالی خاندان اور مولانا شاہ عبدالحیٔ بڈھانوی کے خاندان کی شاخوں کا ذکر تھا، اس تحریر سے پہلی بار دونوں خاندانوں کے قریبی رشتوں، باہمی تعلقات اور زیریں سلسلوں کا علم ہوتا ہے۔

[۱] جن کرم فرما کی عنایت سے یہ تحریر ملی ان کا شکریہ واجب ہے، افسوس ہے! ان کا نام ذہن سے اتر رہا ہے۔

بعض ایسی نادر معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کا کہیں اور سراغ نہیں ملتا۔

راقم سطور کو اس یادداشت کی دو نقلوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ ہرچند کہ دونوں نسخے زیادہ پرانے نہیں تھے مگر دونوں کی عبارتوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریر کو بہت احتیاط سے نقل کیا جاتا رہا ہے۔

یہ تحریر مولانا شاہ عبدالقیوم بڈھانوی[1] کی فرمائش سے شیخ فرحت اللہ بن شیخ سلیم اللہ پھلتی نے رمضان ۱۲۸۳ھ فصلی مطابق ۱۲۹۳ھ/ستمبر، اکتوبر ۱۸۷۶ء میں مرتب کی، اور بعض اہل پھلت کی روایات کے مطابق خود مولانا عبدالقیوم نے اس کی اصلاح اور نظر ثانی کی اور اس میں بعض ترمیمات بھی فرمائی ہیں، مگر اس تصحیح کے بعد بھی اس یادداشت کی بعض اطلاعات درست

---

[1] مولانا مفتی عبدالقیوم بن مولانا شاہ عبدالحیؒ خلف مولانا ہبۃ اللہ صدیقی بڈھانوی، ۱۹ صفر ۱۲۳۱ھ ۲۱ جنوری ۱۸۱۶ء میں ولادت ہوئی، طفولیت میں حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور والد ماجد کی معیت میں سید صاحب کے قافلہ کے ساتھ رہے، مولانا عبدالحیؒ کی وفات شعبان ۱۲۴۳ھ/فروری ۱۸۲۸ء کے بعد وطن واپس بھیج دیئے گئے تھے۔

صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں مولانا نصیر الدین دہلوی سے پڑھیں، دوسری کتابوں کا درس مولانا نصیر الدین لکھنوی، اور خواجہ نصیر الدین حسینی، اور شاہ محمد یعقوب سے لیا، حدیث وفقہ حضرت شاہ محمد اسحاق سے اخذ کی۔

بیگم سکندر جہاں والیٔ بھوپال کی ہدایت پر بھوپال میں مفتی مقرر ہوئے، وہیں مستقل قیام رہا، اخیر عمر میں بواسیر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی حال میں بھوپال سے بڈھانہ آگئے اور بڈھانہ میں ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحیؒ حسنی، ۲۹۷/۷ (حیدرآباد ۱۳۷۸ھ)

تین کتابیں مولانا عبدالقیوم کی علمی یادگار ہیں۔

۱۔ ترجمہ اردو جامع صغیر۔ مولانا نے اس ترجمہ کا مسودہ نواب محمد علی خاں (باقی صفحہ ۲۸ پر)

نہیں ہیں۔ ان فروگذاشتوں کے باوجود یہ تحریر نہایت اہم اور قابل قدر دستاویز ہے۔
اس تحریر کے مطابق شجرہ مرتب کر کے آخر میں شامل کر دیا ہے، اس سے یادداشت کے
سمجھنے میں مدد مل سکے گی۔

تاریخ ۴ رمضان المبارک ۱۲۰۳ فصلی کو جو کچھ وقائع و حالات زمانہ سلف بزرگان
پھلت و شاہ صاحب شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کا ہے وہ وقائع بموجب فرمانے مولانا محمد
مولانا عبدالقیوم کے تحریر کیا جاتا ہے، یہ سب درست راست ہے، کاتب الحالات فرحت ا
بن شیخ سلیم اللہ ساکن پھلت۔

اول مسمی شمس الدین فاروقی ملک یمن سے تشریف لاکر رہتک میں مقیم ہوئے اور عہد
افتاح ہ ان کو اور ان کی اولاد کو قریب چار سو برس کے حوالہ رہا، ان کی اولاد میں ایک مسمی ش
وجیہ الدین شہر شاہجہان آباد میں آکر بزمانہ عالمگیر یعنی اورنگ زیب مقیم ہوئے، اور اتفاقات زما
سے ان کا نکاح بیٹی شیخ رفیع الدین کہ وہ پوتے شیخ عبدالعزیز شکربار کے تھے ہوا، ان سے بیٹ

(بقیہ ص۲۷) والئ ٹونک کو چھپوانے کے لیے بھیجا تھا۔ نواب صاحب نے اس ترجمہ پر نظر ثانی اور احادیث
شرح کرانے کا ارادہ کیا، اور یہ کام مولوی حنیف آروی اور مولوی علی اکرم آروی کے سپرد ہوا،
میں مولوی عبدالرحمٰن ٹونکی اس کے ذمہ دار قرار پائے اور یہ کام پانچ جلدوں میں مکمل ہوا۔ مولانا عبد
کے ترجمہ کا مسودہ، اور اس شرح کا قلمی نسخہ ادارۂ شرقیہ ٹونک میں محفوظ ہے۔ رجوع فرمائیے "ٹونک
ٹونک کے کتب خانے اور ان کے نوادر" مرتبہ صاحبزادہ شوکت علی خاں، ص۲۹ (ٹونک ۱۹۸۰ء)
۲۔ رسالہ مسائل حج چھوٹے سائز کے تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے، مؤلف کا نسخہ بھوپال
راقم سطور کی نظر سے گزرا ہے۔ ۳۔ چہل حدیث: ترجمہ اربعین ملا علی قاری ۱۲۷۷ھ
شائع ہوئی۔ مطبوعہ نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ قاموس الکتب، مرتبہ انجمن ترقی
اردو، ص۱۶۶ کراچی ۱۹۶۱ء)

عبدالرحیم، شیخ، شیخ ابوالرضا محمد، و عبدالحکیم پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالحکیم لاولد مرگئے۔

شیخ ابو رضا محمد کی اولاد، میاں رضا حسین کہ بڑے داماد مفیض اللہ کے تھے، چنانچہ اس مساۃ کا نام نعمت تھا۔ شیخ رضا حسین بعد عقد بمقام لاہور انتقال کر گئے، اور کچھ نام و نشان باقی نہیں رہا۔ قبر شیخ رضا محمد و شیخ عبدالحکیم صاحبان کی مکان مشہور نو محلہ میں ہے، اور پہاڑی دہلی متصل موضع خیبر پور کے ہے، اور مولوی معین الدین والد مولوی نوراللہ کی بھی قبر اسی جگہ ہے۔

جناب شاہ عبدالرحیم صاحب کی اول شادی خاندان مادری میں ہوئی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی[1] دوسری شادی باون برس کی عمر میں فخر النساء بنت حضرت شیخ محمد، جدشاہ محمد عاشق صاحب پھلتی سے ہوئی، ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک شاہ ولی اللہ صاحب، دوسرے شاہ اہل اللہ صاحب۔

شاہ اہل اللہ صاحب کے بیٹے شاہ مقرب اللہ، جن کا لقب میاں مھکو جی تھا، اور ان کے بیٹے مولوی معظم عرف مولوی محمدی صاحب کہ جن کی شادی مساۃ فاطمہ بنت شیخ محمد فائق صاحب بن شاہ محمد عاشق صاحب سے ہوئی تھی، ان سے ایک پسر محمد مکرم، دوسرے محمد محتشم، اور ایک دختر مساۃ امت العزیز عرف بی جان تھا، چنانچہ محمد مکرم و مساۃ بی جان لاولد مرگئیں، اور محمد محتشم کا نکاح مساۃ امت الغفور بنت مولانا محمد اسحاق (سے) ہوا۔ ان سے مولوی عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔ (انھوں نے) مکہ میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔

---

[1] فاضل مرتب کو اس اطلاع میں سہو ہوا، حضرت شاہ عبدالرحیم کے ایک صاحبزادے صلاح الدین پہلی اہلیہ محترمہ سے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین ص۱۴۳ (مجتبائی دہلی، ۱۳۳۵ھ) اور الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد فرماتے ہیں۔

"بعد ازاں عنقریب والدۂ برادر کلاں این فقیر شیخ صلاح الدین قضا کردند" (انفاس العارفین ص۲۰۲)

شاہ ولی اللہ کی اول شادی قصبہ پھلت خاندان مادری میں مسماۃ امت الرحیم سے ہوئی۔ ان سے مولوی محمد پیدا ہوئے، مولوی محمد کا نکاح مسماۃ صبیحہ دختر مولوی نوراللہ صاحب سے ہوا تھا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی لاولد مر گئے، اور قبر ان کی قصبہ بڈھانہ مسجد کلاں میں ہے۔ تاریخ وفات دخل الجنۃ ہے۔

اور دوسری شادی شاہ ولی اللہ صاحب کی بمقام سنپت (سونی پت) مسماۃ بی بی ارادت از نسل سادات حسینی سے ہوئی، ان سے شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ عرف سیتا ۲۵ رمضان المبارک شب جمعہ کہ وہ رات نور کی تھی، اس میں ظہور فرمایا، یعنی پیدا ہوئے، اور یہ عادت مبارک تھی کہ اسی شب تاریخ مولود میں ختم قرآن شریف فرمایا کرتے تھے اور شیرینی تقسیم کرتے تھے یعنی ریوڑی۔ دوسرے بیٹے مولانا عبدالوہاب مشہور بہ شاہ رفیع الدین صاحب، اور تیسرے بیٹے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب، اور چوتھے شاہ عبدالغنی، بعمر ہشتاد سال انتقال فرمایا[1]۔ اور دو دختر اور ایک پسر چھوڑا، اور زوجہ مسماۃ فضیلت بنت مولوی علاء الدین، اور مسماۃ رقیہ دختر کلاں لاولد ہوئیں، اور مسماۃ خورد مولوی محمد موسیٰ پسر مولانا رفیع الدین سے منکوحہ ہوئی تھیں، اور مولوی اسمٰعیل کہ وہ بیٹے چھوٹے تھے، انھوں نے ایک بیٹا مولوی محمد عمر چھوڑا، ان کا نکاح مسماۃ فاطمہ بنت مولانا مولوی عبدالحی سے ہوا تھا، لاولد مر گئے۔ اور مسماۃ کلثوم نے دو دختر چھوڑیں، مسماۃ امت الرحمٰن اور مسماۃ امت الغفار، اور مسماۃ امت الغفار کے ایک دختر ہوئی جن کا نکاح مولوی محمد یوسف بن مولوی عبدالقیوم سے ہوا تھا، وہ انتقال کر گئیں، اور مسماۃ امت الرحمٰن بمقام شاہجہاں آباد بیوہ موجود ہیں، ان کی ایک دختر مسماۃ میمونہ، اور ایک لڑکا مسمیٰ سعید موجود ہے۔

---

[1] یہ اطلاع بھی صحیح نہیں ہے، اگرچہ حضرت شاہ عبدالغنی کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہیں ملتی مگر کم از کم یہ بات یقینی ہے کہ شاہ عبدالغنی جوانی ہی میں انتقال فرما گئے تھے۔ (ن۔ ر)

شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک دختر مسماۃ زینب چھوڑی، اور مسماۃ زینب نے ایک فاسر سمّی مولوی محمد عمر، اور نام والدہ ان کی کا مسماۃ جمیلہ تھا، اور بیٹی محمد مصطفیٰ بن مولوی رفیع الدین صاحب کی تھیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب کی شادی تین ہوئیں، اول مسماۃ بی بی عارفہ دختر ماموں صاحب سے ہوئی، ان کی قوم سید، باشندہ سونی پت کے تھے، ان سے پنج پسر پیدا ہوئے، مولوی محمد عیسیٰ، مولوی مخصوص اللہ، مولوی محمد مصطفےٰ، محمد حسین، مولوی موسیٰ، ایک دختر مسماۃ امت اللہ۔

اور اہلیہ دوم سے سہ دختر (تین لڑکیاں) پیدا ہوئیں، دو دختر روبرو پدر خود فوت ہوگئیں، اور ایک دختر مسماۃ بی بی صفیہ باقی رہیں، وہ کعبہ شریف تشریف لے گئیں، اس سبب سے ان کی شادی نہیں ہوئی، وہیں فوت ہوئیں، اور لا ولد گئیں۔

تیسری (اہلیہ) مسماۃ کلو، ان سے ایک پسر مولوی محمد حسن کہ جن کی شادی مسماۃ امت الرحمٰن دختر مسماۃ زوجہ عبداللہ دختر فضل اللہ ساکن پھلت سے ہوئی، اولاد دختری و پسری موجود ہے، ایک مسماۃ تقیہ، دوسری نقیہ، مسماۃ تقیہ لا ولد گئیں، اور مسماۃ نقیہ کی اولاد عبدالرحمٰن و عبدالوہاب موجود ہیں۔ مولوی محمد عیسیٰ تو روبرو والدین مرگئے، شادی ان کی مسماۃ زینب النساء دختر حضرت شاہ عبدالعزیز سے ہوئی تھی، اور محمد حسین لا ولد مرگئے، ان کی شادی مسماۃ رقیہ ہمشیرہ مولوی محمد اسماعیل سے اول ہوئی تھی۔ مولوی محمد مصطفےٰ کی شادی بی بی زینت بنت مولوی عبدالقادر سے ہوئی تھی، ان سے مولوی محمد یحییٰ صاحب پیدا ہوئے تھے، اور مسماۃ جمیلہ اپنے والدین کے روبرو مرگئیں۔

اور مولوی محمد موسیٰ کی دو شادی ہوئیں، اول شادی مسماۃ کلثوم ہمشیرہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے ہوئی، ان سے اولاد ایک مسماۃ فاضلہ باقی رہیں، مسماۃ کلثوم و مولانا محمد اسمٰعیل کی پیدائش موضع پھلت مکان مولوی علاء الدین سے ہوئی، وہ ان کے نانا ہوتے تھے، دوسری شادی مسماۃ امت السلام قوم سید ساکن سونی پت سے ہوئی، ان سے مسمّی عبدالسلام

پیدا ہوا جو موجود ہے۔

مولوی مخصوص اللہ کی شادی مسماۃ امت العزیز سے ہوئی کہ وہ ان کے ماموں کی دختر تھیں۔ ان سے دو دختر پیدا ہوئیں ایک بی بی نعمت، ان کی شادی ہوئی میاں رضا حسین سے جو اولاد شاہ ابو رضا محمد سے تھے، اور نعمت روبرو وحید الدین اور اپنے شوہر کے مرگئیں، اور دوسری مسماۃ امت اللہ ان کی شادی میاں عبدالقاسم سے ہوئی، اور وہ اولاد خاندان نواسگی مولوی مخصوص اللہ سے اور مسماۃ مذکورہ نے ایک نواسی مسماۃ محمودی چھوڑی، اور شاہجہاں آباد میں موجود ہیں، مسماۃ امت اللہ ان کی شادی حافظ نجم الدین خاندان نواسگی شاہ رفیع الدین صاحب سے یعنی ساکن سونی پت (سے ہوئی) ان سے اولاد ہوئی - دو پسر یکے سید ناصر الدین، دوسرے سید نفیس الدین، ایک دختر مسماۃ شاکرہ چھوڑی۔ دو پسر معین الدین، فقیہ الدین، اور دختر یک نصیرو بی، ان کی شادی ہوئی حضرت مجدد کی اولاد میں، اور وہ بعد غدر مدینہ منورہ تشریف لے گئیں، وہاں ایک پسر نصیر احمد موجود ہے اور میاں نصیر الدین کی شادی مسماۃ امت الغفار بنت مسماۃ فاضلہ بنت مولوی محمد (موسیٰ؟) سے ہوئی اور نصیر الدین کی دوسری شادی ہوئی مسماۃ خدیجہ دختر کلاں حضرت مولوی اسحاق صاحب سے اور مولوی سید نصیر الدین متکفل ہوئے امر جہاد کے بعد جناب سید احمد صاحب کے اور ان کا انتقال ضلع ...... میں اور حالات، چنانچہ (؟) مشہور ہیں، ان سے دو پسر باقی رہے یکے عبداللہ، دیگرے عبدالحکیم، میاں عبداللہ غرق اثنائے راہ کعبہ شریف سمندر میں ہوگئے، اور میاں عبدالحکیم دبائے ہیضہ کعبہ شریف میں فوت ہوئے۔

اور مسماۃ شاکرہ کی شادی سید باقر علی سے ہوئی تھی کہ وہ خاندان مذکور سے ہیں، ان کے چار پسر ایک ابوالقاسم ان کی شادی مسماۃ امت القادر بنت مولوی مخصوص اللہ سے ہوئی تھی آخر کار وہ فوت ہوگئیں، دوسرے جعفر تیسرے علی تقی، چوتھے علی نقی، چنانچہ یہ سب سونی پت میں موجود ہیں، اور ایک دختر مسماۃ سکینہ لاولد رہیں، بمقام سکندرہ فوت ہوئیں۔

اور مولانا شاہ عبدالعزیز کی شادی ہوئی مسماۃ حبیبہ بنت شاہ نوراللہ ساکن بڈھانہ سے

ان کی اولاد ان کے روبرو مرگئی مگر دو نواسے وقت رحلت کے ایک شاہ محمد اسحٰق دوسرے مولانا یعقوب شاہ صاحب موجود ہیں۔

اور کل حال اولاد شاہ صاحب کا یہ ہے کہ بطن بی بی حبیبہ سے، دو پسر ایک مسمی قطب الدین بعمر دوازدہ سالگی فوت ہوئے مو دوسرے کا نام معلوم نہیں کہ سن صغیر میں بعمر دوازدہ سالگی فوت ہوئے اور ایک دختر مریم کہ وہ جوان ہوئیں اور ان کی شادی مولوی عبدالغنی سے ہوئی اور دوسری دختر حضرت کی مسماۃ رحمت، ان کی شادی ہوئی مولوی محمد عیسیٰ بن شاہ رفیع الدین صاحب سے، لاولد گئیں، دختر اوسط یعنی مساۃ رحمت دو سال پیشتر زین الدین سے فوت ہوگئیں۔

مساۃ عائشہ دختر کلاں، حضرت کے روبرو مرگئیں، بحالت جوانی ان کی شادی محمد افضل سے (ہوئی) کہ وہ خاندان اپنے سے تھے کہ بعد پانچ پشت میں جاکر شاہ ولی اللہ صاحب سے مل جاتے ہیں یعنی مسمی منصور بن احمد، شاہ ولی اللہ پر، چنانچہ یہ جد اعلیٰ ساکن رہتک ہیں۔ اور مساۃ عائشہ سے دو پسر ایک مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب، دوسرے مولانا شاہ یعقوب صاحب، اور ایک دختر مساۃ مبارک پیدا ہوئیں، اور مساۃ مبارک کی شادی ہوئی مولانا عبدالحئی صاحب سے بعد فوت ہو جانے مریم کے، اور بعد دو سال کے روبرو شوہر و نانا خود لاولد مرگئیں۔

اور مولانا محمد یعقوب صاحب نے چند نکاح کیے از خارج برادری، چنانچہ ان میں سے ایک عورت مساۃ ظہوراً بنت کلّو خاکروب، مگر بعد مسلمان ہونے کلّو کے نام عبداللہ ہوا، اور مکہ معظمہ میں فوت ہوا اور بطن مساۃ ظہوراً سے ایک لڑکی مساۃ فاطمہ باقی رہیں اور مساۃ ظہوراً کا (بھی) مکہ معظمہ میں انتقال ہوا اور مساۃ فاطمہ کا نکاح مرزا امیر بیگ بن مرزا مراد سے ہوا، ان سے اولاد یک پسر مسمی خلیل الرحمٰن، اور ان کی شادی ہوئی نظیر بیگ کی دختر سے، وہ خلیل الرحمٰن کا چچا ہوتا ہے اور خلیل الرحمٰن کا پسر ہوا حبیب الرحمٰن اور شوہر فاطمہ یعنی مرزا امیر بیگ (کا) ملکی قدیم قصبہ سر دھنہ میں ہے۔

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے چند اولادیں ہوئیں، پسر اور دختر اکثر انھیں کے

بعد فوت ہوگئیں الاسہ دختر بعد تک باقی رہیں، دختر کلاں خدیجہ کی شادی مولوی سید عبداللطیف نواسہ شاہ رفیع الدین صاحب سے ہوئی ان کے شوہر بھی فوت ہو گئے اور مسماۃ خدیجہ ان کی زوجہ ضعیفہ مکہ معظمہ میں موجود ہیں اور دختر اوسط مسماۃ امت الغفور، ان کی شادی حافظ محمد محتشم سے رہی ہوئی) اور ان کی اولاد ہوئی - ایک پسر مسمی عبدالرحمٰن اور وہ موجود بمکہ معظمہ اور مسماۃ مذکور مکہ معظمہ میں فوت ہوگئیں۔

اور دختر خورد مسماۃ امت الرحیم، ان کی شادی مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی صاحب سے ہوئی - ان کے دو پسر ایک مولوی محمد یوسف صاحب، دوسرے حافظ ابراہیم صاحب اور ایک دختر مسماۃ سائرہ اور جو کہ زوجہ ہیں) مولانا عبدالقیوم صاحب جاگیردار کی، ایک موضع تھوڑا پرگنہ حتمار ی علاقہ بھوپال سرکار نواب سکندر جہاں بیگم سے عطا ہوا تھا اور بود و باش معہ خاندان باقی وہاں مقرر ہوئی، چنانچہ مسماۃ امت الرحیم والدہ محمد ابراہیم نے بمقام بھوپال انتقال کیا، غفرہا (۱۲۸۶ھ) ماہ رمضان المبارک تاریخ ۱۴ روز دوشنبہ وقت سات بجے، اور نام امت الرحیم کی والدہ کا لاڈلی بیگم بنت میاں مدد علی، کہ اولاد شاہ عبدالعزیز شکریار سے تھے۔

اور مولوی اسحاق صاحب کے دو پسر پیدا ہوئے، ایک سلیمان بعمر ہشت سالگی فوت ہوا۔ دوسرا یوسف بعمر چار پانچ برس، یعنی سن صغیر میں مرگیا - فقط۔

اور حضرت شاہ صاحب کے نکاح میں یک مسماۃ سعیدہ حرم تھی، اس کی قوم برہمن، اس کے باپ سے خرید کر مسلمان کیا تھا - اس سے ایک دختر پیدا ہوئی تھی مسماۃ سکینہ سن صغیر میں فوت ہوگئی، اس کا شیر اس کی والدہ سے صالح بن کریم اللہ نے پیا تھا اور یہ کریم اللہ زر خرید شاہ صاحب کا تھا اس کو اور اس کی اولاد کو آزاد کر دیا تھا اور بہت آسودگی حاصل تھی ا حرم حضرت شاہ صاحب کی یعنی مسماۃ سعیدہ، بشہر اندور واپسی سفر حج سے فوت ہوگئیں، چنا قبران کی چھاؤنی نواب غفور خاں میں موجود ہے۔

(باقی آئندہ)

پاکستان جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان

(۲)

از سعید احمد اکبرآبادی

۱۳ مارچ کو صبح نو بجے کانفرنس کا افتتاح صدر ضیاء الحق کے ہاتھوں نیشنل اسمبلی ہال میں ہونے والا تھا، ہم لوگ ۴۵-۸ پر وہاں پہنچ گئے اور اپنی اپنی مقررہ سیٹ پر بیٹھ گئے، پاکستان میں نیشنل اسمبلی اسی کو کہتے ہیں جسے ہندوستان میں پارلیمنٹ کہتے ہیں، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہاں پارلیمنٹ ہاؤس کی جو شان و شوکت اور نوعیت و وسعت ہے وہی وہاں نیشنل اسمبلی کی ہوگی، البتہ فرق قدیم و جدید اطرز تعمیر و ساخت کا ہے، ہندوستان کا پارلیمنٹ ہاؤس انگریزوں کے زمانہ کا بنا ہوا ہے اس لیے اس کی چھت بہت اونچی، ستون اور دیواریں بہت غلیظ اور دبیز اور مجموعی حیثیت سے سلاطین قدیم کی قبائے شاہی کی طرح نہایت باوقار، پرشکوہ اور بارعب۔ اس کے برخلاف پاکستان کی نیشنل اسمبلی کی عمارت بالکل ایسی کہ گویا ایک نئی نویلی حسین دلہن غسل کے بعد بال بکھرائے ہوئے منظر عام پر آگئی ہو، نیک اور دلکش مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین، خاموش مگر بزبان حال گویا۔ چونکہ یہ جلسۂ افتتاح تھا اس لیے حسب معمول مندوبین کے علاوہ وزراء، افسران حکومت، ممالکِ غیر کے سفراء اور دوسرے مہمانوں سے ہال بھرا ہوا تھا، ہال کے اندر، دروازوں پر اور ہال سے باہر ہر جگہ سیکیورٹی کے انتظامات بہت وسیع اور سخت تھے۔

ٹھیک نو بجے صدر ضیاء الحق تشریف لے آئے، اب پہلے قرآن مجید کی تلاوت ہوئی، مسٹر اے۔ کے بروہی نے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے اپنا خطبہ انگریزی میں پڑھا جس میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور ان کی اہمیت پر بڑی فصاحت و بلاغت سے کلام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد صدر

ضیاء الحق نے بسم اللہ پڑھ کر فصیح و بلیغ اور شستہ اردو میں خطبہ پڑھا۔ یہ خطبہ زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ علم، شعور اور جذبہ، تینوں کا ایک حسین مجموعہ تھا یعنی علم اس بات کا کہ اسلام کیا ہے؟ اور اس نے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے اور شعور اس چیز کا کہ موجودہ زمانہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کے باعث آج جو سماجی اور اقتصادی مسائل و معاملات پیدا ہو گئے ہیں ان کا حل اسلام کو کس طرح کرنا چاہیے، پھر چونکہ دنیا کا کوئی کام بغیر جذبہ کے نہیں ہوتا۔ اس لیے خطبہ میں جذبہ کی کمی بھی نہیں تھی، خطبہ عام طور پر بہت پسند کیا گیا اور ہم سب نے محسوس کیا کہ گویا یہ ہمارے اپنے دل کی ہی ترجمانی تھی، اس کے بعد قومی ترانہ ہوا اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

صدر ضیاء الحق سے میری ملاقات اور گفتگو جیسا کہ عام دستور ہے اب سب شرکائے جلسہ کافی یا چائے کے لیے ایک بڑے اور وسیع ہال میں جمع ہوئے، صدر پاکستان اس بارات کے دولہا تھے، چاروں طرف سے انھیں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و جرائد کے نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں نے گھیر رکھا تھا، اسی ہجوم میں مسکراتے وہ آگے بڑھتے جاتے اور لوگوں سے فرداً فرداً علیک سلیک اور مصافحہ کرتے جاتے تھے، آخر ہال کے وسط میں وہ رک کر کھڑے ہو گئے اور لوگ وہیں آ آکر ان سے ملنے لگے، میں حسب عادت ذرا فاصلے پر میاں اسلم کے ساتھ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، اسی مجمع میں دیکھا کہ ہمارے انڈین ڈیلی گیشن کے سب ارکان بھی باری باری آکر شرف ملاقات و مصافحہ حاصل کرتے رہے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو دیکھا کہ آگے بڑھ کر سلام کیا۔ صدر مملکت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، مصافحہ ہوا، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سید صاحب نے کچھ کہا اور صدر مملکت نے جواب دیا، بعد میں معلوم ہوا کہ صباح الدین عبدالرحمٰن نے دریافت کیا تھا: "آپ نے ہماری وزیر اعظم اندرا گاندھی کا وہ خطبۂ افتتاحیہ بھی پڑھا ہے جو انھوں نے گذشتہ ماہ دسمبر میں چودھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریب سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں پڑھا تھا؟ مطلب یہ تھا کہ اگر آپ نے یہ تقریر پڑھی ہے تو عالم انسانیت

اور خصوصاً ہندوستان کا اسلام کی دین اور بخشش کے بارے میں مسز اندرا گاندھی نے جن زریں افکار و خیالات کا اظہار ایک عرصے کی زبان سے کیا ہے، آپ اس سے یقیناً مسرور ہوئے ہوں گے، ضیاء الحق صاحب نے جواب دیا: جی ہاں! بس جتنی اخبارات میں چھپی ہے،

جب مجمع چھٹا تو میاں اسلم نے کہا: آپ بھی صدر صاحب سے مل لیجیے! میں نے کہا: اچھا اور آگے بڑھ کر السلام علیکم کہا۔ صدر ضیاء الحق نے جواب میں ابھی صرف "وعلیکم" کہا تھا کہ ان کی نگاہ مجھ پر پڑی اور انھوں نے مسرت آمیز تبسم کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ ارے جناب! آپ تو ہمارے استاد ہیں، بیساختہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سینہ سے لگالیا، اس کے بعد یہ گفتگو ہوئی:

س: ضیا صاحب! آپ نے کمال کر دیا، کم وبیش چالیس برس کے بعد مجھے دیکھا اور پہچان لیا،

ض: پہچانتا کیوں نہیں؟ دو برس تک آپ سے پرشین پڑھی ہے، اور پھر آپ میں تبدیلی کیا ہوئی ہے؟ اب تک آپ کے Features (خد و خال) تو وہی ہیں[۱]

س: جب آپ پاکستان میں برسر اقتدار آئے تھے سب سے پہلے پروفیسر امیر حسن عابدی (دہلی یونیورسٹی) نے جو اس زمانہ میں کالج میں میرے رفیق کار تھے اور اس کے بعد مسٹر محمد احمد سینیر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، نئی دہلی نے جو آپ کے کلاس فیلو تھے مجھ کو یاد دلایا تھا کہ آپ میں

---

[۱] جس کالج کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد دہلی کا بہت مشہور، دیرینہ نامور سینٹ اسٹیفنس کالج ہے۔ میں ۳۴ء و ۳۵ء میں دو برس یہاں طالب علم رہا۔ ۱۹۳۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم، اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کالج میں لکچرر مقرر ہوا اس کے بعد رہا میں کالج میں ہی مگر دہلی یونیورسٹی میں اولاً عربی میں ریڈر اور تقسیم کے بعد صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو ہوا۔ ۱۹۴۹ء کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد نے پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ پر کلکتہ بھیج دیا۔ صدر ضیاء الحق سے میرا تعلق غالباً ۱۹۴۴ء و ۱۹۴۵ء میں رہا۔

[illegible] میں رشتہ ہے، ان کے علاوہ کالج سے تعلق رکھنے والے کچھ اور لوگوں نے بھی اس کا تذکرہ کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ مجھ کو یاد نہ تھے، اس لیے میں سب کی سنتا رہا اور خود اپنی زبان سے ایسی بات نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی جس سے خود ستائی کا پہلو نکلتا تھا، لیکن اب جبکہ آپ خود فرما رہے ہیں اور پھر آپ کو دیکھ کر آپ کی شکل وصورت کا پرانا نقش میرے دماغ میں اچانک بھی ہو گیا ہے تو میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اب سے چالیس برس قبل جس نوجوان سے کالج میں میرا تعلیم وتعلم کا رابطہ تھا وہ آج مسند آرائے صدارتِ مملکتِ خداداد پاکستان ہے، فالحمد للہ۔

ض: اچھا! بتائیے کالج کا کیا حال ہے؟ بڑا اچھا کالج ہے، مجھے اس سے بڑی محبت ہے،

س: آپ کے زمانہ میں پرنسپل راجارام تھے، ان کا انتقال ہو گیا، بڑی خوبیوں کے انسان تھے، ان کے بعد سرکار پرنسپل ہوئے اور آج کل راج پال پرنسپل ہیں، ہمارے زمانہ میں کیشب چندر ناگ اقتصادیات کے اور بہا مہہ پادھیا پنڈت لکھمی دھر سنسکرت کے بڑے فاضل استاد تھے، دونوں سورگباش ہو گئے، فلسفہ والے بوس اور تاریخ کے پاڈیا ابھی بقیدِ حیات ہیں، مگر ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، رہی یہ بات کہ کالج بڑا اچھا ہے، تو حضرت! اگر کالج اچھا نہ ہوتا تو اس سے آپ کا اور میرا یہ گہرا تعلق کیوں کر ہوتا، ضیاء الحق صاحب نے یہ سن کر نیم قہقہہ لگایا اور بولے: ماشاء اللہ آپ کی شگفتہ طبعی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، پھر میں نے کہا: بڑی بات یہ ہے کہ یہ کالج مشن کا ہے اس لیے یہاں انسانیت کی قدریں محفوظ ہیں، چنانچہ تقسیم کے بعد دلی میں وحشت وبربریت نے جو عریاں رقص کیا ہے اور ہم پر جو قیامت گزری ہے اس کے بعد اگر میں ہندوستان میں ہوں تو اس میں میرے اپنے افکار ونظریات کے علاوہ بڑا دخل اس دلجوئی، ہمدردی اور غمگساری کا بھی ہے جو اس موقع پر کالج نے دکھائی[1] گفتگو دراز ہوتی جا رہی تھی، چاروں طرف جو لوگ حلقہ بنائے کھڑے تھے

[1] اس کی تفصیل یہ ہے کہ دلی میں فسادات کے اکا دکا واقعات کے باوجود [illegible] میں زبانی [illegible]

ہم نے محسوس کیا کہ انھیں آزردگی ہو رہی ہے اس لیے میں نے ہی سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا: اچھا! اب اجازت دیجیے، فرمایا: تو آپ پھر ملیں گے نا! میں نے کہا: ضرور، کل آپ کے ہاں منصوریکا ڈنر ہے میں حاضر ہوں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفہ ۳) برابر کالج اور یونیورسٹی آتا جاتا رہا، ۵ ستمبر کو صبح کے آٹھ بجے جب ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے میرے مکان نمبرا، نسیم بلڈنگ، شیدہ پورہ پر حملہ ہوا تو میں اپنا بھرا گھر اسی حالت میں چھوڑ کر بیوی بچوں سمیت پچھلے دروازہ سے باہر نکل گیا۔ نصف فرلانگ کے فاصلہ پر بھورروڈ پر ایک کوٹھی میں نیچے کی منزل میں ندوۃ المصنفین اور برہان کا دفتر تھا اور بالائی منزل میں مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی) مع متعلقین کے رہتے تھے، خانہ خراب ہونے کے بعد میں نے یہیں پناہ لی، شام کے وقت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی جو رشتہ کے میرے بھائی ہوتے تھے اور دن رات ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھے مسلمانوں کی مدد کے لیے پورے شہر میں دیوانہ وار گھومتے رہتے تھے انھوں نے آکر خبر دی کہ میرا مکان بالکل صاف ہوگیا ہے اور اب وہاں کچھ نہیں رہا۔ بیوی اور بچے یہ سنتے ہی رو پڑے، میں نے کہا: شکر ادا کرو آزادی کی دیوی نے بھینٹ میں جانیں تو بخش دیں۔"

ابھی دفتر ندوۃ المصنفین میں پناہ لیے ہوئے ایک دن ہی گذرا تھا کہ ۷ ستمبر کو حملہ آوروں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں بلم لیے اور "بجرنگ بلی" کا نعرہ لگاتے ہوئے ہماری طرف بڑھے، اس وقت پورے محلہ میں بھگدڑ مچ چکی تھی، اور مسلمان مرد، عورتیں اور بچے، بوڑھے اور جوان سر پہ پیر رکھ کر کارواں در کارواں بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے تھے، مفتی صاحب اور میں ہم دونوں نے ندوۃ المصنفین کی شاندار لائبریری دفتر کے ساز و سامان، قیمتی فرنیچر اور مکتبہ برہان میں بھری ہوئی کتابیں ان سب پر ایک حسرت کی نگاہ ڈالی اور انھیں خدا حافظ کہہ کر اپنے متعلقین کے ساتھ دفتر کے گیٹ سے نکل کر انھیں بلاکشان اسلام کے کارواں میں آملے، ہم گرتے پڑتے اور عورتیں اور بچے ہمارے پیچھے گھسٹتے سراسیمہ و حیران انسانوں کے اس سیل رواں میں چلے تو جا رہے تھے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ (باقی صفہ ۳۲ پر)

صدر پاکستان کا استقبالیہ دوسرے دن یعنی ۸ مارچ کو پروگرام کے مطابق صدر مملکت کی طرف سے مندوبین کا ڈنر تھا اور اس کے لیے دعوتی کارڈ تقسیم ہو بھی چکے تھے، لیکن وہ وقت کے وقت منسوخ ہو گیا۔ اور ہم نے کھانا ہوٹل میں ہی کھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں، جیسا کہ عام طور پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) کہاں جا رہے ہیں۔ آخر ایک محلہ قصاب پورہ آیا، یہ محلہ محفوظ تھا۔ یہاں کے مسلمان بڑے بہادر اور جی دار ہیں۔ ہم لوگ جب یہاں پہنچے تو ان لوگوں نے ہم کو روک کر اپنا مہمان بنا لیا۔ عورتوں کا انتظام ایک الگ مکان میں تھا اور مرد مختلف مکانوں میں بکھرے ہوئے تھے، ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی، مفتی صاحب اور میں ایک بہت معمولی کمرہ میں ایک چٹائی پر جا کر پڑ گئے، شام کے وقت کسی کو خیال آیا تو باجرے کی دو روٹیاں اچار کے ساتھ لا کر دیں، دو وقت کے فاقہ کے بعد اس روٹی اور آم کے اچار نے کیا مزہ دیا ہے کام و دہن آج تک اس کو نہیں بھولے، دوسرے دن مفتی صاحب اور میں فتح پوری کے جامع مسجد کے غرب میں ادارہ شرقیہ نام کا ایک ادارہ تھا اس میں منتقل ہو گئے۔

اب سنیے کالج نے کیا کیا؟ جس وقت کالج کے پرنسپل راجارام اور وائس پرنسپل ڈبلیو۔ سی۔ واکر کو میرے حادثہ کا علم ہوا، دونوں فوراً کار میں بیٹھ کر میری تلاش میں نکل پڑے، پرانا قلعہ جو رفیوجی کیمپ بنا ہوا تھا وہاں اور دوسری جگہوں پر گئے مگر کوئی پتہ نہیں چلا، سخت پریشان تھے کہ کیا کریں، آخر تیسرے دن کسی سے ان کو میرا سراغ ملا تو دونوں فوراً ادارۂ شرقیہ پہنچے، راجارام نے مجھے دیکھا تو بے ساختہ رو پڑے، سینہ سے لگا لیا اور بولے: سعید! میرا گھر تمہارا گھر ہے، پتہ چلا کہ تمہارا گھر لٹ گیا ہے، ابھی میرے ساتھ چلو اور جو چیزیں چاہو بے تکلف لے لو۔ اس کے بعد کھانے پینے کا سامان جو نہایت وافر لائے تھے میرے حوالہ کیا اور ساتھ ہی چند سو روپے نقد بھی دیے، اور جب چلنے لگے تو یہ بھی کہتے گئے کہ: بہتر یہ ہے کہ تم مراد آباد یا رامپور جہاں تمہارے عزیز قریب ہیں چلے جاؤ، کالج کی فکر نہ کرو، جب تک حالات بالکل پرامن نہ ہوں وہاں رہو، کالج سے تنخواہ بہرحال ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تمہیں ملتی رہے گی۔

بدھ ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ء

معلوم ہے کہ تخریب کاروں نے پاکستان کا ایک بڑا جہاز جس میں ڈیڑھ سو مرد و زن اور بچے سوار تھے اغوا کر لیا تھا اور لے کر وہ کابل میں جا پڑے تھے، اس حادثہ کی وجہ سے مسافروں پر کیا گزری؟ معلوم ہی ہے، ان بدبختوں نے مزید یہ کیا کہ ایک نوجوان سول آفیسر عبد الرحیم طارق کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اس کی لاش باہر پھینک دی۔ ۸ مارچ کی شام کو اس نوجوان کی میت پشاور پہنچ رہی جہاں کا وہ باشندہ تھا۔ صدر پاکستان نے اس میت کے اعزاز میں یہ ڈنر منسوخ کر دیا تھا اور خود نماز جنازہ میں شرکت اور پسماندگان سے تعزیت کے لیے پشاور گئے بھی تھے۔

پروگرام میں اس ناگہاں تبدیلی کے باعث صدر ضیاء الحق سے ۸ مارچ کی متوقع ملاقات نہ ہو سکی، البتہ ایک اور صورت یہ پیدا ہوئی کہ ۱۰ مارچ کو یعنی جس دن کانفرنس ختم ہو رہی تھی مغرب کے بعد صدر کی طرف سے ہم لوگوں کا استقبالیہ تھا، میں نے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایک کروڑ کی لاگت سے نہایت عالیشان قصر صدارت تعمیر کرایا تھا۔ جنرل ضیاء الحق اب صدر پاکستان ہیں اور انھیں حق ہے کہ اس قصر میں رہیں، لیکن وہ حسب سابق اب تک راولپنڈی ہی میں کمانڈر ان چیف کی رہائش گاہ میں رہتے ہیں، چنانچہ یہ استقبالیہ وہیں ہوا،

مغرب کے بعد ہوٹل سے مندوبین کا کارواں روانہ ہوا، صاف و شفاف، وسیع و کشادہ سڑکیں، ان کے اردگرد درختوں کی قطاریں، خاموش ماحول، مترنم فضا، ہلکی چاندنی کی سفید شال لپٹی ہوئی۔ اس میں شاندار امریکن کاروں کا دلکش بندش اور آگے پیچھے برق رفتاری کے ساتھ ایک عجیب رومانوی منظر پیدا کر رہا تھا جس سے میں کافی متاثر ہوا، راستہ میں وہ جیل خانہ بھی ... جس میں ... قید ہے اور پھر تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے، اس پر نظر پڑی تو بیساختہ زبان سے

بقیہ حاشیہ صفحہ) چنانچہ میں مع متعلقین کے رام پور چلا گیا، تین ماہ کے بعد دلی آ کر کالج آنا شروع کیا، کالج کی فضا اس درجہ پر امن و سکون تھی کہ اس دور وحشت و بربریت میں محسوس ہوا کہ انسانیت ابھی باقی ہے، فنا نہیں ہوئی۔

ہے: تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ: "اے خدا تو جس کو چاہتا ہے عزت اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اور سب بھلائیاں تیرے ہاتھوں میں ہیں۔"

منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ہم سب مندوبین ایک بڑے ہال میں دائرہ کی شکل میں بٹھا دیے گئے ہر ملک کے ڈیلی گیشن کو الگ الگ ملنا تھا۔ بیٹھے ہوئے ہم کو تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ ایک شخص نے کہا: انڈیا کے ڈیلی گیشن کو بلاتے ہیں، ہم ہال سے نکلے تو ایک چھوٹے کمرہ میں داخل ہوئے۔ اس کمرہ کے وسط میں صدر ضیاء الحق تبسم بلب نہایت عمدہ کٹ کی شیروانی اور شلوار میں ملبوس کھڑے تھے ہم جیسے اندر داخل ہوئے، علیک سلیک کے بعد مصافحہ کیا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن سید اوصاف علی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے خموشی کے برف کو توڑنے کی غرض سے دو چار جملے کہے، صدر صاحب مسکراہٹ کے ساتھ انھیں اس طرح سنتے رہے کہ گویا ان سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ میں حسب عادت بالکل خاموش رہا۔ چند منٹ کے بعد ہم رخصت ہوئے تو میں سب سے پیچھے تھا، میں نے الوداعی سلام اور مصافحہ کیا تو صدر ضیاء الحق نے مجھ کو روک لیا، مسٹر اے۔ کے بروہی بھی اس وقت وہاں کھڑے ہوئے تھے، اب ہم دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:

ض: میری تو خواہش تھی کہ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد آپ دو چار دن اور یہاں قیام کرتے اور میرے مہمان رہتے۔

س: شکریہ! مگر میرا ریزرویشن ہو گیا ہے، کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

ض: آپ کا پروگرام کیا ہے؟ کہاں کہاں جائیے گا۔

س: یوں تو پاکستان میں ہر جگہ میرے اعزہ و اقرباء موجود ہیں، لیکن میری ایک بیٹی ریحانہ جو پروفیسر محمد اسلم (پنجاب یونیورسٹی) کی اہلیہ ہے، لاہور میں ہے اور دوسری بیٹی مسعودہ اور ایک بیٹا جنید احمد کراچی میں ہیں اس لیے میں پہلے لاہور جاؤں گا اور پھر کراچی، وطن کو واپسی بہرحال لاہور سے ہوگی۔

ض: اچھا! تو پھر ایسا کیجیے کہ واپسی پر میرے پاس چند روز قیام کیجیے۔

س: بہت بہتر! شکریہ۔

(صدر نے اپنے سکریٹری کی طرف اشارہ کر کے) آپ ان کو اپنا لاہور اور کراچی کا ایڈریس دے دیں اور یہاں کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھ لیں۔

میں نے انڈین ڈیلی گیشن کی طرف سے صدر پاکستان کا ان کی نہایت فیاضانہ میزبانی اور خصوصی الطاف و عنایات پر شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے لگا تو فرمایا: "آپ لاہور اور کراچی میں اپنی بیٹیوں کو دعا کہیے اور یہ کہہ دیجیے کہ جب کبھی انھیں کوئی ضرورت ہو بے تکلف یاد کر لیں" میں نے اس کا مزید شکریہ ادا کیا اور ایک گوشہ میں جا کر سکریٹری کو اپنا لاہور اور کراچی کا ایڈریس نوٹ کرایا اور خود یہاں کا ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کیا۔ اب میں پھر واپس لوٹا اور صدر صاحب اور مسٹر اے۔ کے بروہی کو الوداع سلام کر کے روانہ ہونے لگا تو صدر پاکستان نے ازراہ لطف و کرم خاص اپنے اُس آخری جملہ کو پھر دہرایا یعنی: اپنی بیٹیوں سے کہہ دیجیے ...." اس وقت میں نے دیکھا کہ بروہی صاحب جو خود اعلیٰ صفات و اخلاق کے بزرگ ہیں ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ طاری ہو گئی، غالباً اس کا سبب ان کا یہ احساس تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان کا صدر پاکستان کس درجہ شریف النفس اور کریم الطبع ہے کہ ایک انڈین جس سے کبھی دو حرف پڑھے تھے اس کے ساتھ اس درجہ شفقت اور التفات و توجہ کا معاملہ کر رہا ہے، یہ ہماری اسلامی اور مشرقی تہذیب کی وہ قدریں ہیں جن کا دامن برصغیر کی نئی نسلوں کے ہاتھوں تار تار ہو رہا ہے اور ہماری یونیورسٹیاں درتعلیم گاہیں، وہ علی گڑھ میں ہوں یا کراچی میں، آئے دن ہنگاموں اور فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنتی جا رہی ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں بھی اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ غالب کا یہ شعر میرے حسب حال تھا: ؎

میں اور حظِّ وصل! خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

صدر ضیاء الحق اور بروہی صاحب نے "خدا حافظ" کہا اور میں باہر آ کر اسی ہال میں بیٹھ گیا۔ یہاں چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا، اس میں شریک ہوا۔

پھر ذکر خیر | بیرونی ممالک کے مندوبین نمٹ چکے تو اب پاکستانی مندوبین کی باری آئی۔ میاں اسلم ہیں مندوبین کے ساتھ صدر مملکت سے ملے تھے، واپس آکر انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ صدر صا ،سامنے آپ کا ذکر خیر ہماری موجودگی میں بھی آیا تھا، میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ بولے: ہمارے تھے جو مندوب تھے ان میں سے ایک صاحب نے صدر ضیاء الحق کی مدح سرائی کرتے ہوئے نیں اس کی مبارکباد پیش کی کہ کانفرنس بہت کامیاب رہی ہے اور اسی ذیل میں انھوں نے مزید یا: چنانچہ بھارت کے مندوب پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے سہ پہر کے آخری اجلاس میں جو تقریر کی ی اس میں انھوں نے انڈین ڈیلیگیشن کی نمائندگی کرتے ہوئے کانفرنس کی بڑی تعریف کی اور اس کی مخصوصیات کا جن کو انھوں نے اسی نوع کی دوسری بین الاقوامی کانفرنسوں میں کہیں نہیں دیکھا، تذکرہ یا اور اس سلسلہ میں اس بات کو بھی سراہا کہ کانفرنس کے مندوبین میں خواتین کی تعداد بھی اچھی خاصی ی۔" صدر صاحب یہ سن کر مسکرائے اور میری (اسلم) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "مولانا سعید احمد برآبادی) کے یہ داماد کھڑے تو ہیں۔"

صدر ضیاء الحق کی شخصیت | دنیا کے ہر بڑے انسان کے اندر ایک جوہر ذاتی ہوتا ہے جو اس کی شخصیت ی تعمیر کرتا ہے، لوگوں کی اس شخص کے ساتھ ..... محبت یا نفرت اسی جوہر ذاتی کے باعث ہوتی ہے۔ س کا تعلق سیاسی افکار و نظریات اور سیاسی کردار و عمل سے نہیں ہوتا، چنانچہ بعض مذہبی رہنماؤں اور یشواؤں کو دیکھا ہے کہ اونچے درجہ کے کمیونسٹ بھی ان سے محبت اور ان کا احترام کرتے تھے اسی طرح متعدد صف اول کے کمیونسٹوں کو دیکھا ہے کہ مذہبی لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی بڑی عزت ور توقیر تھی۔ حسن اتفاق سے مجھ کو عالم اسلام کے متعدد سربراہان حکومت سے ملاقات و گفتگو اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور ان سے میں نے مختلف تاثرات لیے ہیں، مثلاً کنگ سن خامس (مراکو) شاہ فیصل (سعودی عربیہ) جمال عبدالناصر (مصر) احمد بن بیلو (نائیجیریا) سے ملاقات و گفتگو ہوئی تو مجھ کو ان کی شخصیتوں میں عظمت اور اخلاص فکر و عمل کا احساس ہوا ہے۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو اور اب مسز گاندھی کے پاس جب کبھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے

میں نے کنفیوشس کی ہے ملکین پریزیڈنٹ سوکارنو (انڈونیشیا) اور ذوالفقار علی بھٹو (پاکستان) سے ملاقات ہم کلامی کے بعد جو تاثر یہ تھا کہ ان کی ذہنی اور دماغی صلاحیت وقابلیت میں شک نہیں ہو سکتا لیکن لشنا یہ کھلنڈرے، خوش وقتیے اور بے کیرکٹر (character less) ہیں۔

جہاں تک صدر ضیاء الحق کا تعلق ہے، مجھے اعتراف کرنا چاہیے، ان کے متعلق میں نے اخبارات میں جو کچھ پڑھا تھا اس کے پیش نظر میرا تصور یہ تھا کہ ان کے خدوخال ہٹلر اور مسولینی سے ملتے جلتے ہوں گے، اور ان کے نزدیک ملک وقوم کی بہ نسبت خود اپنی ذات کی اہمیت زیادہ ہوگی، لیکن ۶ مارچ کی صبح کو جب نیشنل اسمبلی ہال میں ان کو پہلی مرتبہ کانفرنس کا خطبۂ افتتاحیہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کی شکل وصورت اور لب ولہجہ سے عزم وحوصلہ مندی اور مخلصانہ طور پر اپنے نظریہ کے مطابق ملک وقوم کی خدمت کرنے کے جذبہ کا احساس وادراک ہوا، پھر اس کے بعد ان سے ملاقات اور گفتگو ہوئی تو ان کی شرافتِ نفس، کریم الطبعی اور خندہ جبینی کا شدید وعمیق تاثر ہوا۔

پاکستان اور صدر ضیاء الحق | لیکن ان ذاتی خوبیوں اور اوصاف وکمالات کے باوجود صدر ضیاء الحق کی شخصیت پاکستان میں متنازع فیہ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ آج ایشیا اور افریقہ کا وہ کون سا ترقی پذیر (Developing) ملک ہے جس کے سربراہ اور صدر مملکت کی شخصیت متنازع فیہ نہیں ہے اور اس میں ہنگامے برپا نہ ہوتے ہوں، اس کے برخلاف ترقی یافتہ (Developed) ملکوں کا حال یہ ہے کہ ان میں استحکام (Solidarity) ہے، یک جہتی (One sidedniss) ہے، پارٹیاں وہاں بھی ہیں، لیکن ملک میں وہ افراتفری اور خلفشار اور انتشار نہیں جو اول الذکر ملکوں میں ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قومی نشوونما کی جس منزل میں آج ترقی پذیر ممالک گامزن ہیں ترقی یافتہ ملک، ایک مدت ہوئی، اس منزل سے گذر کر اب وہاں ہیں جہاں سیاسی وحدتِ خیال وعمل ہے،

سائنس اور ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، علم و فن اور تہذیب و تمدن میں غیر معمولی ترقی کی ہے اور اس کے نتیجہ میں ان ملکوں کے عوام میں خود اعتمادی اور حوصلہ مندی ہے، ان کو اپنے اپنے ملک اور قوم سے سچی محبت اور عشق ہے اور اس بنا پر ملکی مسائل پر غور و خوض کے وقت ان کا نقطۂ نظر اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں ہوتا، سیاسی دیانت داری اگر دنیا میں کوئی چیز ہے تو وہ گورنمنٹ میں بھی پائی جاتی ہے اور حزب مخالف میں بھی، اسی لیے ارکان گورنمنٹ ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے اپنے عہدوں اور مناصب کا غلط استعمال نہیں کرتے اور ان میں یہ اخلاقی جرأت ہوتی ہے کہ سربراہ حکومت سے لے کر کابینہ کے ایک رکن تک سے مسلمہ ضابطۂ اخلاق کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو فوراً مستعفی ہو جاتا ہے، پھر تعلیم کے عام ہونے کے باعث ان ملکوں کے عوام ملکی اور قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات سے حقیقی دلچسپی لیتے اور ان میں غور و فکر کرتے ہیں، اس لیے کوئی گورنمنٹ ان کو دھوکا نہیں دے سکتی، بہر حال یہ وہ چیزیں ہیں جو ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان نشان فرق و امتیاز ہیں اور جن کی وجہ سے اول الذکر ممالک اتھل پتھل کی حالت میں ہیں اور بے یقینی کا شکار رہیں، اور اس کے برخلاف مؤخر الذکر ممالک ان سے محفوظ ہیں :

پاکستان میں صدر ضیاء الحق کی شخصیت کے متنازع فیہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکّے مسلمان ہیں، اسلامی نظام کو قائم کرنے کا بار بار اعلان کرتے رہتے ہیں اور ملک میں اب تک جو آرڈیننس نافذ کیے ہیں وہ سب اسی منزل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس بنا پر ظاہر ہے ملک کا کمیونسٹ طبقہ جس کا شعار زندگی ہی توڑ پھوڑ اور انقلاب ہے وہ صدر ضیاء الحق کو کیوں پسند کرنے لگا اور خصوصاً وہ نوجوان جو مسٹر بھٹو سے گہرا نظریاتی تعلق رکھتے تھے وہ موجودہ حکومت کے سخت دشمن ہیں، یہ لوگ دو چار نہیں ہیں۔ پورے ملک میں ان کا انڈر گراؤنڈ تخریبی کارروائیوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے کسی دن بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

اب رہا پاکستان کا مذہبی طبقہ تو یہ دو قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے، ایک قسم ان لوگوں کی ہے

جو بھٹو گورنمنٹ کے ستم رسیدہ تھے اور جنھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ صدر ضیاء الحق کو پسند کرتے ہیں اور ان کے ثنا خواں ہیں، مجھ سے بعض میرے دوستوں نے جو اعلیٰ درجہ کے گورنمنٹ آفیسر ہیں صاف لفظوں میں کہا ہے کہ بھٹو گورنمنٹ کے سرکاری دفتروں میں لوگ اسلام اور اردو زبان کا نام لیتے ہوئے کمتری اور پسماندگی کا احساس کرتے اور ان کے ساتھی ان کو دقیانوسیت کا طعنہ دیتے تھے، لیکن الحمدللہ آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام کا نام لیتے ہیں، اردو بولتے اور لکھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں، البتہ مذہبی طبقہ میں ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہے جو سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ جمہوریت زدہ ہیں۔ یہ لوگ صدر ضیاء الحق کے اگرچہ دشمن تو نہیں ہیں مگر ایسے حامی بھی نہیں ہیں، جمہوریت میں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی ہوتی ہے اس لیے دل کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے اور آدمی کبھی گھٹن محسوس نہیں کرتا، اس کے برخلاف ڈکٹیٹرشپ میں لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی جبر کے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں، اس سے ان کے احساس خودی و آزادی کو ٹھیس لگتی ہے اور اس کا مظاہرہ جلسے، جلوسوں اور احتجاجی سرگرمیوں کی شکل میں ہوتا رہتا ہے،

اس موقع پر اتنا لکھنا ہی کافی ہے، آئندہ جب ہم پاکستان پر ایک عمومی تبصرہ کریں گے، وہاں نظریۂ پاکستان، اسلامی نظام کیا ہے؟ وہ کیسے قائم کیا جاسکتا ہے؟ اسلام میں جمہوریت کا تصور، اسلامی طرز حکومت، پاکستان میں سیاسی پارٹیاں، پاکستان میں علماء اور جماعت اسلامی کا رول، موجودہ گورنمنٹ کا تنقیدی جائزہ، ان سب مباحث پر کلام کریں گے۔

(باقی آئندہ)

بھٹو گورنمنٹ کے ستم رسیدہ تھے اور جنھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ صدر ضیاء الحق کو پسند کرتے ہیں اور ان کے ثنا خواں ہیں، ہم سے بعض میرے دوستوں نے جو اعلیٰ درجہ کے گورنمنٹ آفیسر ہیں صاف لفظوں میں کہا ہے کہ بھٹو گورنمنٹ کے سرکاری دفتروں میں لوگ اسلام اور اردو زبان کا نام لیتے ہوئے کمتری اور پسماندگی کا احساس کرتے اور ان کے ساتھی ان کو دقیانوسیت کا طعنہ دیتے تھے، لیکن الحمدللہ آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام کا نام لیتے ہیں، اردو بولتے اور لکھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں، البتہ مذہبی طبقہ میں ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہے جو سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ جمہوریت زدہ ہیں۔ یہ لوگ صدر ضیاء الحق کے اگرچہ دشمن تو نہیں ہیں مگر ایسے حامی بھی نہیں ہیں، جمہوریت میں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی ہوتی ہے اس لیے دل کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے اور آدمی کبھی گھٹن محسوس نہیں کرتا، اس کے برخلاف ڈکٹیٹرشپ میں لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی جبر کے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں، اس سے ان کے احساس خودی و آزادی کو ٹھیس لگتی ہے اور اس کا مظاہرہ جلسے، جلوسوں اور احتجاجی سرگرمیوں کی شکل میں ہوتا رہتا ہے۔

اس موقع پر اتنا لکھنا ہی کافی ہے، آئندہ جب ہم پاکستان پر ایک عمومی تبصرہ کریں گے، وہاں نظریۂ پاکستان، اسلامی نظام کیا ہے؟ وہ کیسے قائم کیا جاسکتا ہے؟ اسلام میں جمہوریت کا تصور، اسلامی طرز حکومت، پاکستان میں سیاسی پارٹیاں، پاکستان میں علماء اور جماعت اسلامی کا رول، موجودہ گورنمنٹ کا تنقیدی جائزہ، ان سب مباحث پر کلام کریں گے۔

(باقی آئندہ)

قتل نہ کیا جائے۔ قتل حکم کا التوا سلطان نے اس لیے کیا تھا کہ دختر وزیر کا وہ وعدہ ملاحظہ کرنا چاہتا تھا جو " جوان اور وزیر زادی کے مابین بوقتِ قتل آخری دیدار کی تمنا کا اظہار ہوا تھا"۔

بعد سے شہر میں قتلِ جوان (سوداگر بچہ) کی تشہیر ہو چکی تھی جسے دیکھنے کے لیے ہر خاص و عام کا ایک اژدحام اکٹھا ہو گیا۔ شدہ شدہ یہ خبر وزیر کی لڑکی تک بھی پہنچ گئی۔ فوراً ہی اس نے اپنی مخصوص ملازمہ کو سیاہ لباس، سیاہ گھوڑا اور تیر و کمان حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ سارے ساز و سامان حاضر کیے گئے تب وہ ان سے مزین ہو کر دربار سلطانی میں جوان کے روبرو آ موجود ہوئی۔ بادشاہ یہ مشاہدہ کر کے ششدر ہو گیا کہ واقعتاً اس لڑکی نے اپنے وعدہ کا ایفا کر دکھایا۔ اس کے بعد سلطان نے وزیر (پدرِ دختر) سے کہا کہ اِس سیاہ پوش سوار کو پہچانتے ہو؟ وزیر نے عرض کیا، نہیں۔ بادشاہ نے دوبارہ کہا کہ ذرا قریب ہو کر شناخت کرنے کی کوشش کرو! وزیر نے نزدیک جا کر معلوم کر لیا کہ یہ تو میری ہی لڑکی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ یہ سوداگر بچہ اور تمہاری دختر دونوں ہی صالح اور پاک دامن ہیں جن کی پوری کیفیت کی بذاتِ خود میں تحقیق کر چکا ہوں اس لیے مناسب یہ ہے کہ اپنی لڑکی کا عقد اس جوان کے ساتھ کر دو۔ چنانچہ وزیر سلطانی حکم کے بموجب اپنی دختر اس جوان کے سپرد کر دیتا ہے"۔

۴۔ **منافع القلوب:** صفحات ۴۵۔ مصنف، کاتب اور سال کتابت مرقوم نہیں، کتابت خطِ شکستہ۔

یہ نسخہ احکامِ فقہ پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے بعد ۷۶ احکام کی مع عنوانات ایک فہرست ہے لیکن پیشِ نظر نسخہ میں صرف چھیالیس ۴۶ احکام ہیں اور بقیہ ناقص۔ دیباچہ میں مصنف نے ظاہر کیا ہے کہ یہ " فقہی کتاب " " کنز الدقائق، حاشیۂ ضریری و کافی، نصائح الملوک، اقوالِ حکماء ازدار المجود اور کتب حکمت " کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ تقریباً نصف حصہ مسائلِ اعتقاد اور نصف احکامِ شریعت پر مبنی ہے۔

صاحب منافع القلوب نے ابتداء حمد و درود کے بعد شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رح

وشوابھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اردو مخطوطات

عبدالوہاب صاحب بدر بستوی، سنٹرل لائبریری، وشوابھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن
(مغربی بنگال)

(۴)

کمیاب فارسی مخطوطات

اِدھر دوسری صبح کو سلطان نے جب اپنا دربار عام منعقد کیا تو نوجوان کا واقعہ یاد آیا اور معًا کوتوال کو حکم دیا کہ جس چور کو میں نے رات میں گرفتار کیا تھا وہ فلاں مقام پر اپنے ایک دوست کے گھر موجود ہے، جاکر فوراً گرفتار کر کے اسے حاضر کرد. حکم سلطانی پاتے ہی کوتوال مع پانچسو سواروں کے جاکر اس کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ جب جوان کے دوست کو معلوم ہوا تو اس نے سوچا کہ پھر حق دوستی ادا کرنے کا موقع ملنے والا ہے، چنانچہ گھر سے برآمد ہو کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا کہ میں ہی چور ہوں۔ کوتوال اسے گرفتار کر کے حضورِ سلطانی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب اس اچانک واقعے سے گھر والے بلند آوازوں سے آہ وزاری کرنے لگے، اِدھر نوجوان بسترِ خواب پر نیند کے خراٹے لے رہا تھا، یک بیک رونے چلانے کی آواز جب سنی تو بیدار ہو گیا اور گریہ کا سبب معلوم کیا، گھر والوں نے کہا کہ تمہارے عوض میرے آدمی کو سرکاری ملازمین پکڑ لے گئے۔ یہ سُن کر جوان فی الفور بے تحاشا دربارِ سلطانی کی جانب دوڑا۔ کچھ دور کے بعد راستے ہی میں کوتوال کے سامنے حاضر ہو کر عرض گزار ہوا کہ یہ میرا دوست معصوم ہے، اسے رہائی بخشیے، درحقیقت چور میں ہوں۔ بالآخر جوان کو شاہی دربار میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے فرمان صادر کیا کہ ابھی اسے

قتل کیا جائے۔ قتلِ حکم کا التوا سلطان نے اس لیے کیا تھا کہ دختر وزیر کا وہ وعدہ ملاحظہ کرنا چاہتا تھا جو "جوان اور وزیر زادی کے مابین بوقتِ قتل آخری دیدار کی تمنا کا اظہار ہوا تھا۔"

پھر سے شہر میں قتلِ جوان (سوداگر بچہ) کی تشہیر ہو چکی تھی جسے دیکھنے کے لیے ہر خاص و عام کا ایک اژدہام اکٹھا ہو گیا۔ شدہ شدہ یہ خبر وزیر کی لڑکی تک بھی پہنچ گئی۔ فوراً ہی اس نے اپنی مخصوص ملازمہ کو سیاہ لباس، سیاہ گھوڑا اور تیر و کمان حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ سارے ساز و سامان حاضر کیے گئے تب وہ ان سے مزین ہو کر دربارِ سلطانی میں جوان کے روبرو آموجود ہوئی۔ بادشاہ یہ مشاہدہ کر کے ششدر ہو گیا کہ واقعتاً اس لڑکی نے اپنے وعدہ کا ایفا کر دکھایا۔ اس کے بعد سلطان نے وزیر (پدرِ دختر) سے کہا کہ اس سیاہ پوش سوار کو پہچانتے ہو؟ وزیر نے عرض کیا، نہیں۔ بادشاہ نے دوبارہ کہا کہ ذرا قریب ہو کر شناخت کرنے کی کوشش کرو! وزیر نے نزدیک جا کر معلوم کر لیا کہ یہ تو میری ہی لڑکی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ یہ سوداگر بچہ اور تمھاری دختر دونوں ہی صالح اور پاک دامن ہیں جن کی پوری کیفیت کی بذاتِ خود میں تحقیق کر چکا ہوں اس لیے مناسب یہ ہے کہ اپنی لڑکی کا عقد اس جوان کے ساتھ کر دو۔ چنانچہ وزیر سلطانی حکم کے بموجب اپنی دختر اس جوان کے سپرد کر دیتا ہے۔"

۴۔ **منافع القلوب**: صفحات ۴۵۔ مصنف، کاتب اور سالِ کتابت مرقوم نہیں، کتابت خطِ شکستہ۔

یہ نسخہ احکامِ فقہ پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے بعد ۷۶ احکام کی مع عنوانات ایک فہرست ہے لیکن پیشِ نظر نسخہ میں صرف چھیالیس ۴۶ احکام ہیں اور بقیہ ناقص۔ دیباچہ میں مصنف نے ظاہر کیا ہے کہ یہ "فقہی کتاب" "کنز الدقائق، حاشیہ ضریری و کافی، نصائح الملوک، اقوالِ حکمار از دار البجود اور کتبِ حکمت" کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ تقریباً نصف حصہ مسائلِ اعتقاد اور نصف احکامِ شریعت پر مبنی ہے۔

صاحب منافع القلوب نے ابتدائے حمد و درود کے بعد شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی ر؍

(متوفی ۷۵۷ھ) سے متعلق کچھ تعریفی اور دعائیہ الفاظ اس طرح لکھے ہیں:

" ثنائے بے پایاں ودعائے فراواں بر روانِ مظہر ختم المشائخ قطب العالم تاج المحققین سراج العارفین نصر الحق والدین شیخ محمود قدس اللہ سرہ العزیز الخ "

یہ نسخہ یہاں کے علاوہ صرف نیشنل لائبریری کلکتہ کے مجموعۂ بوہار میں پایا جاتا ہے جس کے تعارفی سلسلے میں مصنف کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ مصنف موصوف " شیخ محمود نصیرالدین چراغ دہلوی کے شاگرد تھے " اس کے علاوہ مزید کوئی تحریر مذکورہ لائبریری کی کٹلاگ میں مذکور نہیں ہے۔ بسیار تلاش کے باوجود مصنفِ نسخہ کے بارے میں کوئی دوسرا ذریعۂ معلومات فراہم نہیں ہو سکا۔

۵۔ دیوانِ موجد: شاعر سراج الحق موجدؔ، صفحات ۲۱۹، کاتب اور سالِ کتابت مذکور نہیں، کتابت خوشخط، کاغذ عمدہ اور کیڑوں کے حرصِ دندان سے محفوظ ہے۔

پورا دیوان حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے جس میں ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جگہ جگہ عربی اشعار اور کہیں کہیں ایک مصرع عربی اور دوسرا فارسی کا مخلوط بند ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موجدؔ کا عربی زبان پر بھی اچھا خاصا عبور تھا۔ نمونۃً خالص عربی اور مخلوط عربی و فارسی اشعار ذیل میں دیے جاتے ہیں:

(عربی) "یا اول الاوایل یا مبداء البدایہ یا آخر الاواخر یا منتہی النہایہ
ما فی الوجود غیرک یا موجد الحقائق من لطفک الروایۃ من فضلک الدرایہ"

(فارسی و عربی) "برانتہائے موجد چوں ابتدا ش بخشائے یا مبداء البدایۃ یا منتہی النہایہ"

دیوان مذکور کا دوسرا نسخہ صرف خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے جس کی کٹلاگ جلد سوم، صفحہ ۲۶۰ پر موجدؔ صاحب کے بارے میں کتاب "نشترِ عشق"[1] کے حوالے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے

---

[1] مصنف حسن قلی خاں عظیم آبادی بن آقا علی خاں شاہجہاں آبادی۔

"موجد کی پیدائش بمقام مرہان (دیوا پلی) میں ہوئی - بعد میں یہ مرشد آباد (مغربی بنگال) آگئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد نواب خانخاناں مظفر جنگ کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں شاعر موصوف کی علمی صلاحیتوں کی بنا پر اہل علم اور یورپی آفیسروں نے کافی قدرو منزلت کی"

افسوس ہے کہ کتاب "نشتر عشق" یہاں دخدا بخش لائبریری میں موجود نہیں ہے کہ جس کے مطالعے سے مزید حیاتِ موجد سے متعلق ممکن ہے کہ دیگر اطلاعات سے استفادہ کیا جا سکتا۔

۶- **شاہ و درویش** (مثنوی) : مصنف بدرالدین ہلالی استرابادی، صفحات ۹۰ سالِ کتابت اور اسم کاتب مذکور نہیں - البتہ مثنوی کے آخر میں ایک ورق ہے جس کا کاغذ اوراقِ مثنوی سے بالکل مختلف ہے - اسی ورقِ آخر پر ذیل کی دو[۲] مختلف النوع تحریریں ہیں :

(۱) "این کتاب ...[۱]... از ملا عبداللہ ...[۲]... ہر کس کہ دعویٰ کند دعوی باطل گردد۔
شہر شعبان سنہ یکہزار و دوصد و نود و ...[۳]... نوشتہ شد"

(۲) یوم سشنبہ ۴ شہر محرم الحرام ۱۲۹۶ھ"

مذکورہ بالا دونوں تحریریں متن کی کتابت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتیں - اور وہ دونوں مذکورہ سال مالکِ نسخہ کے ملکیتی سال معلوم ہوتے ہیں - کتابت نسخہ خوشخط اور ہر صفحہ سنہری لائنوں سے گھرا ہوا ہے - جس زمانے میں کتابت ہوئی تھی اس وقت یہ نسخہ یقیناً قابلِ دید اور جاذبِ نظر رہا ہوگا - لیکن اب تو جراثیم کے پے در پے حملے کے باعث ہر صفحہ سے داستاں کی دردناک صدا نکلتی ہے - درمیانِ نسخہ جگہ جگہ اوراق بیاض ہیں - معلوم نہیں کاتب کی اس میں کیا مصلحت تھی - ؟

صفحۂ اول پر کسی نے "شیریں خسرو ہلالی" لکھا ہے جو بالکل غلط ہے - اسی طرح عام طور پر محققین اس کا نام "شاہ وگدا"[۴] بھی بتاتے ہیں - حالانکہ ہلالی نے خود اس کا نام "شاہ و درویش" لکھا ہے۔

---

[۱]، [۲]، [۳] ان مقامات کے الفاظ صاف نہیں ہیں مزید اس پر کیڑوں کی بیرحمی کے نشانات ہیں - [۴] حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء) کشف الظنون جلد دوم : ص ۱۱۴ پر اس کا نام "گوی و چوگان" بھی لکھا ہے۔

تو اپنی اس مثنوی میں ہلالی نے "شاہ وگدا" بھی استعمال کیا ہے لیکن بطور مضمون لکھا ہے. جیسا کہ نسخہ مذکور کے ابتدائی اشعار ذیل سے واضح ہوتا ہے:

"بارِ دیگر چنیں رسید ندا — کہ بگو داستانِ شاہ وگدا
قصۂ شاہ را بیان کردن — حالِ درویش را عیان کردن
روی در اہتمامِ آن کردم — "شاہ و درویش" نامِ آن کردم"

ہلالی کا کہنا ہے کہ جب ایک مثنوی مرتب کرنے کا خیال دل میں پیدا ہوا تو یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس داستان کو بہ زیورِ مثنوی آراستہ کروں؟ کبھی تو مجنون ولیلیٰ کی داستان دل میں گدگدی پیدا کرتی، کبھی شیریں خسرو اور فرہاد کا قصہ دماغ میں ہلچل پیدا کرتا، پھر اچانک واقعاتِ عذرا ووامق بھی زیب داستان بننے کے لیے مجبور کرتے:

"بازوی فکر را قوی کردم — روی در فکرِ مثنوی کردم
گفتم از ہر چہ بر زبان آید — سخنِ عشق درمیان آید
عشق از ہر نو و کہن بہتر — سخنِ او ز ہر سخن بہتر
گاہ می کرد خاطرم میلی — سوی مجنون و جانبِ لیلیٰ
گاہ از شوق می زدم فریاد — بہر شیرین و خسرو و فرہاد
گاہ می دید طبعِ من لائق — حالِ عذرا و حالتِ وامق"

مثنوی مذکور کے ترتیب اشعار میں پہلے حمد، نعت، مناقب علیؓ، وجوہات واسبابِ مثنوی پھر اصل داستان کا بیان ہے۔ یہ مثنوی اصل میں ہلالی کو موزوں کرنے کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی جب ایک ہمعصر شاعر نے شاعرانہ تعصب کی بنا پر اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہمعصر شاعر ملا عبداللہ ہاتفی (متوفی ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء) ہیں جو جامی (متوفی ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) کے بھانجے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہلالی کی غزل تو گوارا ہے لیکن میدانِ مثنوی میں بالکل نہتے ہیں۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) لکھتے ہیں:

"باوجود صلاحیتِ فطری تعصب شاعرانہ بود - در حقِ او گفت، ہلالی غزل را بد نمی گوید اما در مثنوی پیادہ است - ہلالی ایں حرف شنیدہ مرثیہ "شاہ و درویش" آغاز کرد و در آنجا بطریقِ کنایہ گوید:

مقبلی چوں مذاقِ شعر نداشت　　　مثنوی را بہ از غزل پنداشت
آں کہ نظمِ غزل تواند گفت　　　مثنوی را چو دُر تواند سُفت[1]"

ہلالی ایران کے شہر استرآباد میں پیدا ہوا۔ اُس زمانے میں یہ شہر صوبہ گرگان کا مرکزی شہر تھا۔ سلسلۂ خاندان چغتائی ترک تھا۔ عنفوانِ شباب میں اپنا پیدائشی مقام چھوڑ کر خراسان کے شہر ہرات میں آگیا۔ یہاں اُن دنوں سلطان حسین مرزا بایقرا گورگانی کی جانب سے امیر علی شیر نوائی[2] (متوفی ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء) ہرات کے حاکم تھے۔ ہلالی اپنی شاعرانہ بلند پروازی کے ذریعے بہت جلد حاکمِ ہرات کا منظورِ نظر ہو گیا اور پھر باقاعدہ امیر موصوف کی سرپرستی میں اپنی مزید علمی استعداد میں اضافہ کرنے کی سعادت پائی۔ یہ فطرتاً اعلیٰ ذہن کا مالک اور ذوقِ طبع شاعرانہ تھا، انہی دونوں قدرتی خصوصیات نے اس عہد کے دیگر شعراء میں ایک امتیازی حیثیت پیدا کر دی تھی لیکن ایک وقت آتا ہے کہ ہلالی کی

---

[1] خزانۂ عامرہ: ص ۴۵۶۔ [2] موصوف چغتائی بن چنگیز خاندان سے تھے (۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء) میں پیدا ہوئے۔ تبحرِ علمی، سخاوت، سرپرستیِ علماء و شعراء اور دانشمندی و نیک صفتی میں یکتائے روزگار تھے اور اپنے دور کے عظیم شاعر بھی۔ ترکی، فارسی زبانوں میں بصورت نثر و نظم آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں سلطان حسین مرزا کے ہمدرس تھے۔ اسی زمانے میں دونوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ ہم میں سے اگر کسی کو سلطانی میسر آ جائے تو اپنے ساتھی کو فراموش نہ کرے گا۔ چنانچہ تعلیمی دور کے بعد جب دونوں میں جدائی ہوئی اور سلطان مذکور کو ہرات پر اقتدار حاصل ہوا تو امیر موصوف کو سمرقند سے بلوا کر ہرات کا حاکم بنا دیا۔ پھر بعد میں پورے ملک کے منصبِ صدارت سے عزت افزائی کی۔ (بحوالہ لغت نامہ دہخدا؛ ... ... تا ... ادبیہ)۔

مقبولیتِ عام و خاص اور امتیازی شانِ شاعری اس کے لیے مہلکِ جان بن گئی۔

چنانچہ جب خراسان پر عبیداللہ خاں اوزبک شیبانی فاتح حکمراں کی حیثیت سے قابض ہوتا ہے تو یہاں بھی ہلالی اپنی فطری صلاحیتوں کے توسط سے عبیداللہ خاں کا تقرب حاصل کرلیتا ہے۔ دربارِ اوزبک میں پہلے ہی سے دو عالم مولانا بقائی اور مولانا شمس الدین قہستانی یا کوہستانی اثر و رسوخ پائے ہوئے تھے، جب اپنے سے بڑھ کر خان مذکور کی نظرِ عنایت ہلالی کی جانب دیکھی تو دلوں میں آتشِ حسد تیز ہونے لگی۔ دونوں نے منصوبہ بنایا کہ کسی طرح اس خار کو راہ سے ہٹا دینا چاہیے۔ غرضیکہ دونوں عالموں نے عبیداللہ خاں سے یہ شکایت کی کہ وہ شیعہ ہے اور حضور عالی کے خلاف ہجویہ اشعار کہا کرتا ہے۔ خان مذکور شکایت سے متاثر ہوکر قتل کا فرمان صادر کردیتا ہے۔ اس حکمِ ناگہانی پر ہلالی اپنی برات کے ساتھ ایک قصیدہ بھی پیش کرتا ہے:

" خراسان سینۂ زرّیں زمیں از بہر آں آمد — کہ جاں آمد درو یعنی عبیداللہ خانی آمد

سمندِ تند زرّیں نعلِ او خورشید را ماند — کہ از مشرق بمغرب رفت و یکشب در میاں آمد"[1]

لیکن یہ قصیدہ باعث نجات نہیں بنتا۔ چنانچہ شہر ہرات کے شارع عام پر ۹۳۹ھ/۱۵۳۲-۳۳ء میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ مگر قتل کے بعد عبیداللہ خاں کو بے حد صدمہ اور افسوس ہوا۔ علی شیر قانع رقمطراز ہیں:

" بعد شہادت ہلالی — خان بالیقین شد ناحق کشتہ۔ پشیمان شدہ دیوانش بکشود، ایں غزل برآمد:

مارا بجفا کشتہ پشیماں شدہ باشی — خونِ دلِ ما ریختہ حیراں شدہ باشی"[2]

سالِ قتل میں اختلاف ہے، کچھ اہلِ علم ۹۳۵ھ یا ۹۳۶ھ بتاتے ہیں لیکن خود ہلالی کے ایک مخلص رفیق سام مرزا اور دیگر محققین جیسے ریو (Rieu)، ایتھے (Ethe)، اوراہ

---

[1] خزانۂ عامرہ: ۴۵۶ تا ۴۵۷۔ [2] تحفۃ الکرام جلد دوم: ص ۲۶۵۔

(Iranica) اور دورِ حاضر کے ایرانی محقق ادبیات ڈاکٹر رضا زادہ شفق[۱] وغیرہ نے ۹۳۹ھ/۱۵۳۲-۳۳ء ہی کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

پروفیسر براؤن (Browne) "مجمع الفصحاء" (مصنفہ رضا قلی خاں ہدایت متوفی ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء) جلد دوم ص۵۸ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہلالی کو خراسان والے شیعہ اور اہلِ عراق سنی سمجھتے تھے۔[۲] پھر چند سطروں کے بعد صاحب "ہفت اقلیم" (مصنفہ امین احمد رازی متوفی گیارھویں صدی ہجری) کی رائے ذکر کرتے ہیں کہ اس کے قتل کا باعث عقیدۂ شیعیت نہیں بلکہ ازبکوں کے دربار میں دو زبردست حریفوں (بقائی اور شمس الدین کوہستانی) کی سازش تھی۔[۳] لیکن پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ ہلالی کا رجحان شیعیت کی طرف زیادہ تھا جس کے ثبوت میں ہلالی کے اشعار ذیل نقل کرتے ہیں:۔

"محمد عربی آبروی ہر دو سرا است | کسی کہ خاک درش نیست خاک بر سر او
شنیدہ ام کہ تکلّم نمود ہمچو مسیح | بدیں حدیث لبِ لعلِ روح پرورِ او
کہ من مدینۂ علمم علی دراست مرا | عجب خجستہ حدیث است من سگِ درِ او"[۴]

لیکن اس سے زیادہ واضح ہلالی کی شیعیت پر خود اس کا وہ شعر گواہ ہے جو اس نے "شاہ و درویش" میں مناقبِ علیؓ کے سلسلے میں کہا ہے:

"دریائے سرمد است علی | جانشینِ محمدؐ است علی

ظاہر ہے کہ یہ خیال کوئی سنی شخص کبھی نہیں کر سکتا۔ لیکن دورِ حاضر میں ایران کے چند اصحابِ علم نے ایک نیا انکشاف کیا ہے:

تحقیقاً نمی تواند گفت کہ ہلالی پیرو کدامیک از طرق تشیع و یا تسنن بود چناں می نماید کہ بمقتضای زمان بایں ہر دو آں سو متمایل می شدہ است"[۵]

---

[۱] مصنف "تاریخ ادبیات ایران" [۲] [illegible] of Persia, V. 4 [۳] P.234 [۴] ایضاً P.235 [۵] ایضاً: P.239 [۶] دائرۃ المعارف [illegible]

پیشِ نظر نسخہ کا ترجمہ بزبانِ جرمن ایچ۔ ایتھے (H. Ethe) نے کیا ہے جو لیپزگ سے[۵] [illegible]ء میں طبع ہوچکا ہے[۱] اور حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۹۶ھ/۱۶۵۸ء) نے لکھا ہے کہ حمدی نام کے ایک ترکی شخص نے "شاہ و درویش" کا بزبانِ ترکی ترجمہ کیا ہے[۲]۔ اِن دو ترجموں کے علاوہ غالباً ایک اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے جو ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔ یہ ترجمہ مع اصل کے "کتب خانہ آصفیہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن" میں موجود ہے[۳] اور اصل فارسی نسخہ[۴] "ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ" میں بھی پایا جاتا ہے۔

ھلالی کی دیگر تصانیف:

۱۔ صفات العاشقین (مثنوی)

۲۔ لیلیٰ مجنوں (مثنوی)

۳۔ دیوانِ غزلیات۔ یہ لکھنؤ سے ۱۲۶۳ء اور کانپور سے ۱۲۸۱ء میں طبع ہوچکا ہے[۵]۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] India Office Library V.1: P.783

[۲] کشف الظنون جلد دوم: ص [illegible]

[۳] [illegible] جلد چہارم: ص ۵۸۲۔

[illegible]

مارا بجفا کشتہ [illegible]

سالِ قتل میں اختلاف ہے، کچھ اہلِ [illegible]

ایک مخلص رفیق سام مرزا اور دیگر محققین جیسے ریو (ملاحظہ [illegible]

---

[۱] خزانۂ عامرہ: ۴۵۶ تا ۴۵۷۔ [۲] تحفۃ الکرام جلد دوم: ص ۲۶۵۔

ایک مکتوب گرامی

مکرمی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "برہان" دہلی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

نومبر ۱۹۸۱ء کے "برہان" میں "مجمع البرکات" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں فاضل مضمون نگار نے مجمع البرکات کے چار نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ قارئین برہان کی معلومات میں اضافہ کی غرض سے ذیل کی سطور میں ایک مزید نسخے کا تعارف پیش کر رہا ہوں:

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریری میں مجمع البرکات کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو جدید فہرست مخطوطات عربیہ کے اندر کے نمبر ۶۱۹ کے تحت درج ہے۔ یہ نسخہ ۱۶،۶ × ۱۵،۶ سینٹی میٹر کے سائز پر ۳۰۴ اوراق (۶۰۸ صفحات) پر محیط ہے۔ اچھے نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے اور کاغذ کا پیلا پن قدامت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن ناقص الاخیر ہونے کی وجہ سے سنہ کتابت معلوم نہیں ہو سکا، شروع میں فہرست مضامین بھی نہیں ہے۔ کتاب کا یہ نسخہ کتاب الطہارۃ سے کتاب اشربہ تک پر مشتمل ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور باقی عبارات [illegible] شنائی سے۔ نئی جلد بنواتے وقت ہر ورق پر ٹیشو پیپر چسپاں کرادیا گیا ہے۔ نسخہ [illegible] قابل استفادہ ہے۔

[illegible]

تبصرے

حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد صاحب جہلمی، مرتبہ جناب خورشید احمد خان صاحب ایم۔ اے۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۵۳۶ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد -/50 -

پتہ: مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ۔ اردو بازار، لاہور۔

مولوی فقیر محمد صاحب جہلمی متوفی ۱۹۱۶ء پنجاب کے نامی گرامی عالم اور صاحب تصنیف وقلم بزرگ تھے۔ متعدد قابل قدر اور معرکۃ الآراء کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور ارباب علم وادب میں مقبول ہوئیں، منجملہ اور کتابوں کے ایک اہم کتاب انھوں نے فقہائے احناف کے طبقات پر اردو میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں موصوف نے امام ابوحنیفہ سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے نوسو چودہ (۹۱۴) فقہائے احناف کا تذکرہ صدی وار لکھا ہے، اردو میں اس موضوع پر ایک اور کتاب تذکرۂ علمائے احناف، مصنفہ مولوی محمد کلیم اللہ کا سراغ ملتا ہے جو جدید تحقیق کی روشنی میں زیر بحث کتاب کے بعد لکھی گئی ہے، لیکن یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس بنا پر مولوی فقیر محمد جہلمی کی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ علماء وفقہائے احناف کے طبقات پر یہ کتاب اردو لٹریچر میں پہلی بھی ہے اور آخری بھی، جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اس زمانہ میں شیعہ اور سنی اہل حدیث اور احناف، آریہ اور مسلمانوں کے درمیان مناظروں کا عام رواج تھا، بلکہ نوبت مقدمات تک پہنچ گئی تھی، مولوی فقیر محمد کو بھی مناظرہ کا بڑا ذوق تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں، چنانچہ، جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب بھی دراصل اہلحدیث کے رد کی غرض سے لکھی تھی، اور اسی وجہ سے کتاب میں نواب صدیق حسن خاں

متعدد بار ذکر آیا ہے اور مناظرانہ رنگ میں ان کی تردید وتغلیط کی گئی ہے، اور اگرچہ مصنف نے نقل روایات میں قطعاً احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھی، صحیح ضعیف بلکہ موضوع روایات تک جن سے اثبات مدعا میں مدد مل سکتی تھی آنکھ بند کر کے ان کا انبار لگاتے گئے ہیں باایں ہمہ نفس کتاب کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہی کچھ کم نہیں ہے کہ انھوں نے تیرھویں صدی تک کے علماو فقہائے احناف کا تذکرہ مع ان کے سنین وفات کے قلم بند کر دیا۔ امام اعظم کا تذکرہ بہت مفصل اور مبسوط ہے جس میں ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے جو امام اعظم یا فقہ حنفی پر کیے جاتے رہے ہیں، مگر یہ امر افسوسناک ہے کہ مصنف امام اعظم کی حمایت کے جوش میں امام بخاری اور امام مسلم پر بھی بڑی بیباکی سے ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔

یہ کتاب حدائق الحنفیہ کے نام سے تین مرتبہ نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی تھی۔ آخری طباعت ۱۹۰۶ء میں ہوئی، اس بنا پر عرصہ سے کتاب ناپید تھی، خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے نامور فاضل اور محقق خورشید احمد خاں صاحب کو پندرھویں صدی ہجری تقریبات کے موقع پر ادھر توجہ ہوئی اور انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے اس کتاب کو اڈٹ کر کے چوتھی بار اعلیٰ طریقہ پر شائع کیا۔ اور کتاب میں تیرھویں صدی تک کے علمائے احناف میں سے جن علما کا تذکرہ، جن کی تعداد ۱۰۳ ہے ترک ہو گیا تھا ان کے حالات بھی مرتب کر کے کتاب کا تکملہ لکھا اور اس طرح اسے ایک جامع تذکرہ بنا دیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں مصنف کے حالات و سوانح اور ان کی تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ اور کتاب کی سرگزشت تحقیق سے لکھی ہے، پھر کتاب میں مصنف سے متعدد فروگذاشت اور غلطیاں ہو گئی تھیں مثلاً: حنفی علما کے ساتھ غیر حنفی علما بھی اس میں شامل ہو گئے، کسی کی کتاب کسی کی طرف منسوب کر دی، سن وفات یا کوئی اور تاریخ غلط لکھ دی، یا بعض جگہ سن وفات سرے سے درج ہی نہ تھا یا کسی صاحب ترجمہ کی تالیفات کا ذکر بالکل متروک ہو گیا تھا یا ذکر تھا مگر کوئی اہم کتاب رہ گئی تھی، فاضل مرتب نے حواشی میں ان سب امور کی نشاندہی کی ہے، شروع میں فہرست مضامین اور آخر میں حواشی اور تکملہ کے ماخذ و مصادر کی فہرست کیہ دونوں بھی مفصل اور اڈٹ کی ہیں۔

اگرچہ ایڈیٹنگ کے نقطۂ نظر سے کتاب میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں، مثلاً مصنف کے حوالوں کی تخریج نہیں کی گئی اور جو غلط سلط روایات انھوں نے جمع کردی ہیں ان کی نشان دہی نہیں کی گئی، تاہم ارباب ذوق اس کتاب کو پڑھیں گے اور مصنف و مرتب دونوں کی وسعت علم و نظر اور غیر معمولی محنت و کاوش کی داد دیں گے،

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث ۔ } از مولانا محمد یوسف کوکن سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی۔ تقطیع کلاں، ضخامت: ۷۰۳ صفحات، ٹائپ جلی، طباعت بہتر، قیمت ۶۵/- پتہ: حافظ منزل، نمبر ۱۳، میلاپور اسٹریٹ، مدراس — ۱۷ ۔

مولانا محمد یوسف کوکن جنوبی ہند کے نامور فاضل محقق اور مصنف ہیں۔ تاریخ اور ادب موصوف کی قلمی کاوشوں کی خاص جولان گاہ ہیں، انگریزی، اردو اور عربی میں متعدد بلند پایہ اور تحقیقی کتابیں ان کے قلم سے نکل کر ارباب علم و نظر سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ اب انھوں نے عصر جدید کے نامور عرب ادباء و شعراء پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس جلد میں فاضل مؤلف نے طہطاوی متوفی ۱۸۷۳ء سے جسے عربی ادب کی نشأۃ ثانیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے امیر شکیب ارسلان (م ۱۹۴۶ء) تک ۲۹ اکابر نثر و نظم کا تذکرہ ترتیب زمانی و مکانی کی رعایت کے بغیر شستہ عربی میں قلمبند کیا ہے، ہر تذکرہ کافی طویل اور مبسوط ہے جس میں صاحب ترجمہ کے شخصی اور خاندانی حالات و سوانح کے علاوہ اس کی نثر یا نظم کے طویل اقتباسات بھی دیے گئے ہیں، اس نشأۃ ثانیہ کا پس منظر دکھانے کے لیے ایک باب میں عرب کی گزشتہ دو صدیوں کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس دور میں عربی زبان و ادب اور اس کی تاریخ پر جس کثرت سے عرب ملکوں میں نہایت بلند پایہ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور تحقیق و تنقید کا جو اعلیٰ معیار وہاں قائم ہو گیا ہے، ماخذ، مصادر اور وسائل و ذرائع کی کمیابی کے باعث اس کے مطابق کام کرنا ہندوستان میں آسان نہیں ہے تاہم

فاضل مرتب نے محنت شاقہ اور دیدہ وری سے کام لے کر جو مواد اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے وہ بذات خود بہت قابل قدر اور سزاوار تحسین ہے، یونیورسٹیوں میں عربی کے اساتذہ اور طلباء کو خصوصاً اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

آذری ترجمہ جناب کبیر احمد صاحب جائسی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/12، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی — ۲۵۔

آذربیجان جو ایران کا بہت مشہور اور مردم خیز صوبہ رہا ہے اور اب اس کا ایک حصہ سوویت روس کے ماتحت ہے اس کی زبان کو آذری یا آذربیجانی کہتے ہیں، عربوں نے جب ایران پر قبضہ کیا اس وقت بھی یہاں کی زبان کا نام آذری تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک مستقل زبان تھی اور پہلوی دری یا فارسی سے اس کا تعلق نہ تھا، لیکن سیاسی حالات کے زیر اثر اس زبان پر بھی تغیر و انقلاب کے بہت سے دور گزرے ہیں جن کے باعث یہ متعدد زبانوں کا ملغوبہ بن گئی ہے، اس بنا پر علما کا اس باب میں اختلاف ہے کہ آذری کی اصل کیا ہے؟ ایک طبقہ ترکی زبان کو بتاتا ہے اور دوسرا ایرانی کا حامی ہے، ایران کے ایک فاضل احمد کسروی تبریزی نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ آذربیجان کی اصل زبان ایرانی ہے نہ کہ ترکی۔ کتاب چونکہ محققانہ تھی اس لیے ڈاکٹر کبیر احمد جائسی جو خود فارسی کے استاد اور تحقیق و تصنیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں انھوں نے اس کا سلیس و شگفتہ اردو میں ترجمہ کیا اور ساتھ ہی ایک دلچسپ اور بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے کتاب کے مشتملات کا تجزیہ کیا اور بالغ نظری سے ان کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے، مصنف نے ثابت یہ کرنا چاہا ہے کہ آذری کی اصل ایرانی زبان تھی نہ کہ ترکی، لیکن مصنف کے دلائل میں ژولیدہ بیانی اور بے یقینی کی جھلک نظر آتی ہے، پھر عربوں کی تاریخ سے اس کی واقفیت کا حال یہ ہے کہ ایک جگہ لکھتا ہے: ہزاروں سال سے عرب ایک بے برگ و گیاہ سرزمین میں مشقت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی نظر ہمیشہ سے عراق و ایران کے سبزہ زاروں کی طرف تھی (اسلام کے زیر سایہ) ان کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی، (ص ۳۸) گویا مصنف کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ ساسانی حکومت

کس طرح عرب پر حملہ آور ہونے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اسی طرح مصنف آگے چل کر لکھتا ہے، "ایران میں آذربائیجان کے باشندوں میں) اور عربوں میں اختلاط کم ہی ہوا" (ص ۲۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت بنی عباس میں عرب و ایران کا جو بے محابا اختلاط و ارتباط تھا مصنف کو اس کی خبر ہی نہیں ہے، تاہم کتاب معلومات افزا ہے اور مطالعہ کے لائق۔

مولانا روم کی کہانیاں: مرتب محمد حفیظ الدین، کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، سائز متوسط (۱۸×۲۲/۸) ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت دو روپے۔ پتہ: ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم و سماجی بہبود، نئی دہلی۔

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کو جو قبول عام حاصل ہوا کتابوں کی تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہیں، اس قصے کہانیوں کے ذریعے حکمت و معرفت اور بلند اخلاق کے سبق سکھائے گئے ہیں، اس کی کہانیاں اخلاقی کتابوں میں، کورس کی کتابوں میں اور عام قصے کہانی کی کتابوں میں بہت نقل ہوئی ہیں، اس کے علاوہ مثنوی کی کہانیوں کے مستقل مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں، زیر تبصرہ مجموعہ بھی ۱۲ کہانیوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس کی زبان بچوں کی مناسبت سے بہت ہلکی پھلکی اور آسان رکھی گئی ہے، البتہ بعض الفاظ میں پرانا پن جھلکتا ہے جیسے: ایکا ایکی (ص ۱۳) یکایک اور اچانک کے معنی میں ـــ دھول (ص ۱۳) دونوں ہاتھوں کا گھونسہ کے معنی میں ـــ رمنا (ص ۳۱ ص ۳۲) چراگاہ یا سبزہ زار کے معنی میں ـــ بدمزہ (ص ۳۸) بدحال کے معنی میں ـــ اس قسم کے الفاظ کو سمجھنے میں بچوں کو دشواری ہو سکتی ہے۔

کہانیوں میں سبق تو اکثر ہوتے ہیں اور بزرگوں میں کہانیاں سنانے کا جو رواج رہا ہے وہ اسی غرض سے تھا بھی، مگر ہر کہانی میں سبق کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا ہے، مولانا رومی کہانی کے بیان اکثر بیچ بیچ میں بھی اس کے سبق آموز پہلو کو بڑی خوبی سے کھولتے ہوئے چلتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتابچے میں بھی ایک حد تک اس بات کی کوشش کی گئی ہے۔

ترقی اردو بیورو ہم سب کے شکریے کا مستحق ہے کہ ہمارے لیے اور ہماری نئی نسل کے لیے ادب عالیہ کے قدیم اور بکھرے ہوئے ذخیرے کو اور دیگر زبانوں کے پاکیزہ ادب پاروں کو خوبصورت کتابت اور معیاری طباعت کے ساتھ شائع کر کے ہمیں اس سے استفادے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔

اردو طباعت و اشاعت کے مسائل : مرتب انور کمال حسینی، کتابت و طباعت عمدہ، سائز متوسط، (۱۸×۲۲) ضخامت ۱۴۳ صفحات۔ قیمت ۷/=، پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ ۸/۵ گرین پارک نئی دہلی ۱۶-۱۱۰۰۱۱ ـــ مکتبہ جامعہ دہلی، کمیٹی، علی گڑھ سے بھی مل سکتی ہے۔

کسی بھی زبان کے قلم کار سے لے کر پڑھنے والے تک درمیان میں ایک لمبا سلسلہ اور بہت سے مراحل ہیں اگر اس زبان کے حامی اور بہی خواہ درمیان کے اس راستے کو بہتر نہ بنا سکیں اور اس کی دشواریوں کا حل نہ تلاش کر سکیں تو قلم کار کی کاوشیں پڑھنے والوں تک یا تو نہیں پہنچیں گی یا پہنچنے کے لیے راستے میں ان کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ٹائپ، کتابت، کمپوزنگ، چھپائی، جلد بندی، کتابوں کی فروخت، ان کا سستا اور ہر جگہ دستیاب ہو سکنا یہ سب راستے کے مسائل ہیں اور ان کو حل کرنا بنیادی کام ہے۔ ع
گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ہر اردو پسند کے شکریے کا مستحق ہے کہ اس نے خدمت اردو کے سلسلے کے ایک بہت ہی اہم پہلو پر توجہ کی ہے، اس کا یہ قدم تحفے لائق تحسین اور قابل ستائش ہے۔

یہ کتاب دراصل روداد ہے اس سمینار کی جو ادارۂ مذکور کے اہتمام سے سرینگر کشمیر میں ۱۸ تا ۲۰ جون ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا، اس سمینار میں اردو طباعت و اشاعت سے متعلق مختلف شعبوں کے ماہرین نے حصہ لیا اور مختلف عنوانات پر مقالے پڑھے، وہ تمام مقالے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ہر مقالہ کسی نہ کسی ضروری پہلو پر لکھا گیا ہے۔ طوالت کا خوف دامنگیر ہے ورنہ جی چاہتا تھا کہ ان مقالات کی فہرست پوری نقل کر دیتا جس میں اردو کتب و رسائل، اردو طباعت و اشاعت اور فروخت، اردو ناشر، ادیب، مترجم اور نئے قلم کاروں کے مسائل، اردو میں

مذہبی کتب، بچوں کا ادب وغیرہ بہت سے اہم موضوعات زیر بحث آگئے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ لکھنے والے اپنے اپنے موضوع کے بھی اچھے ماہرین ہیں۔

برہان

جلد نمبر ۸۸، ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ، مطابق فروری ۱۹۸۲ء، شمارہ نمبر ۲

نظرات

افسوس ہے ۱۷ جنوری کی شام کو نواب آف چھتاری سر حافظ احمد سعید خان صاحب نے ۹۴ برس کی عمر میں علیگڈھ میں وفات پائی اور دوسرے دن اپنے آبائی وطن چھتاری میں مدفون ہوئے، نواب صاحب تقسیم سے پہلے وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کے ممبر اور یو پی کے گورنر رہ چکے تھے اس لیے ان کا جنازہ ان کی کوٹھی راحت منزل سے یونیورسٹی تک اور یونیورسٹی سے چھتاری تک پورے سرکاری اعزاز و اکرام کے ساتھ لے جایا گیا، جلوس میں ہر فرقہ و ملت کے ہزاروں لوگوں کے علاوہ متعدد وزراء اور اترپردیش کے اعلیٰ افسران حکومت بھی شامل تھے۔ نماز جنازہ میں ہزاروں مسلمان شریک ہوئے، علیگڈھ اور چھتاری دونوں جگہ ہوئی۔ جن لوگوں نے سر سید (متوفی ۱۸۹۸ء) کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی باتیں سنی ہیں، نواب صاحب غالباً اس بزم کی آخری شمع تھے، سدا رہے نام اللہ کا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گزشتہ ایک صدی کے اندر برصغیر کے مسلمانوں میں مختلف حیثیتوں سے بڑی بڑی نامور اور قد آور شخصیتیں گذری ہیں جن کے طنطنہ، شہرت و کمال سے اس ملک کے بام و در عرصہ تک گونجتے رہے ہیں اور اب وہ تاریخ کی گود میں آسودۂ سکون ہیں لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دین اور دنیا کے اعلیٰ صفات و کمالات اور امیری میں درویشی کی جامعیت کے اعتبار سے نواب صاحب کی شخصیت منفرد اور اپنی مثال آپ تھی، چنانچہ ایک طرف دنیوی عزت و وجاہت کے نقطۂ نظر سے انگریزوں کے عہد میں جو عہدہ و منصب ایک ہندوستانی کی معراج ہو سکتا ہے وہ انھیں حاصل تھا، وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر بنے، اترپردیش کے پہلے مسلمان گورنر مقرر ہوئے، نظام حیدرآباد کے وزیراعظم یا مدارالمہام برسوں رہے، نظام ٹرسٹ

سے رکن منتخب ہوئے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے پرو چانسلر اور پھر چانسلر سالہا سال رہے، گورنمنٹ اور پبلک ہر جگہ بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ برطانیہ کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس، لندن میں بھی شریک ہوئے، آزادی کے بعد خانہ نشین ہوگئے تھے، اور سیاست سے عملاً کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا، پھر بھی دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔

اور دوسری طرف دینداری کا عالم یہ تھا کہ نماز، روزہ اور اوراد و وظائف کی سخت پابندی کے علاوہ قرآن مجید سے ان کو عشق تھا، آٹھ برس کی عمر میں حافظ ہوگئے تھے اور ہر سال (خواہ کہیں ہوں، یہاں تک کہ گورنری کے زمانہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں بھی) ــــ تراویح میں قرآن مجید بڑی پابندی اور اہتمام سے سناتے تھے، چند سال ہوئے، ایک مرتبہ انھوں نے خود راقم الحروف سے فرمایا تھا: الحمد للہ! میں نے ۸۱ محرابیں پڑھی ہیں" اس کے بعد مرحوم نے دو مرتبہ اور تراویح میں قرآن سنایا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے یوں بھی تلاوت کرتے رہتے تھے۔

اخلاق و عادات کے اعتبار سے بالکل صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے، ایک رئیس اعظم اور بلند مرتبہ صاحب منصب و عہدہ ہونے کے باوصف نہایت حلیم و بردبار، خندہ جبیں و ملنسار، نہایت متواضع اور خوش گفتار تھے، امیر ہو یا غریب ہر ایک سے کمال التفات اور توجہ سے گفتگو کرتے تھے، دکھ درد میں ہر ایک کے غمگسار اور شریک رہتے تھے، ارباب حاجت و ضرورت کی مدد کر کے انھیں خوشی ہوتی تھی، علماء اور مشائخ کی صحبت کے جویار رہتے تھے، یونیورسٹی سے ان کو محبت نہیں عشق تھا، اس کے ہر فنکشن میں شریک ہو کر اکثر اردو میں اور کبھی کبھی انگریزی میں دلچسپ اور موثر تقریر کرتے تھے، طلباء کے وظائف کے لیے ایک خطیر رقم مقرر تھی جسے ہر سال خرچ کرتے تھے، شادی بیاہ، دعوت و ضیافت میں کوئی بلائے اسے رد کرنا ان کے حسن اخلاق سے بعید تھا۔

صحت ہمیشہ بہت اچھی رہی، جسم گٹھا ہوا، مضبوط اور پھرتیلا تھا، شاید کسی زمانہ میں پہلوانی بھی کی ہو، بہرحال شہسواری ان کا خاندانی اور موروثی ہنر تھا، شکار کے اتنے شوقین تھے کہ مرض الوفات میں مبتلا ہونے سے چند ماہ پیشتر تک شکار میں برابر جاتے رہے، اسپورٹس میں بھی ایسے تھے کہ یوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کے چیرمین اخیر تک رہے، حیات مستعار کے طویل سفر میں بیمار بار ہا پڑے اور کبھی کبھی علالت بہت شدید اور تشویش انگیز ہو بھی گئی مگر علاج معالجہ ہوا صحتیاب ہو ہو گئے، لیکن ابھی چند ماہ پہلے ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اٹھ سکے، کمزوری بڑھتی رہی، غذا اور دوا موقوف ہو گئی، اکثر بیہوشی اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ اس جہان ناپائیدار سے رشتہ منقطع ہو رہا تھا اور حیاتِ جاودانی کے چمن لذت وسرور کی عطر بیز ہواؤں کا دریچہ کھل گیا تھا اس لیے اس عالم سکر و بے خودی میں زبان برابر ذکر الٰہی کے ورد میں مصروف تھی، بار بار ہاتھ اٹھاتے اور بڑھاتے تھے، گویا کچھ محبوب صورتیں انھیں نظر آرہی ہیں اور وہ ان کی دست بوسی وہم آغوشی کے لیے بے قرار ہیں، چنانچہ غایت درجہ ناطاقتی کی حالت میں ڈاکٹر انجکشن دینے کا ارادہ کرتا تو فرماتے: ڈاکٹر! اب طاقت کا انجکشن دے کر مجھ کو میرے حبیب کے پاس جانے سے مت روکو" اہل خانہ پر گریہ طاری ہو گیا تو بڑے صاحبزادہ کا ہاتھ میں ہاتھ لے کر بولے: "میاں! ہم اس دنیا میں مہمان بن کر آئے تھے، ورنہ ہمارا اصلی گھر تو دوسری جگہ ہے، اور مہمانی ایک دن، دو دن، حد سے حد تین دن کی، اور ہم تو پھر بھی بہت رہ لیے، بس! اب جانے دو" آخر اسی عالم اضطراب وشوق میں عصر اور مغرب کے درمیان کا جھٹ پٹا وقت تھا کہ حیات ناسوتی کا پردہ اٹھا۔ يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ، کی صدائے دلنواز حریم قدس سے فردوس گوش ہوئی اور ایک روح بے قرار وبے تاب وصلِ حبیب کے دامن میں پناہ لے کر قرار پا گئی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

کیا
سرسید اور علماء اسلام میں باہمی مخالفت کی بنیاد
انگریزی تعلیم کی ترویج تھی؟
(ایک غلط فہمی کا ازالہ)

از جناب ضیاء الدین صاحب لاہوری ایم - اے -

سرسید احمد خاں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل متعدد مذہبی رسائل تصنیف کیے جنھیں مختلف حلقوں میں قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا، لیکن جنگِ آزادی کے بعد جب انھوں نے مذہب سے متعلق جدید نظریات پر مبنی تحریریں عوام میں پیش کیں تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت بن گئے۔ اُن کی مخالفت اس وقت عروج کو جا پہنچی جب ان کی سرپرستی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بحث و مباحث کا یہ سلسلہ دارالعلوم کے قیام کے بعد بھی کافی عرصہ جاری رہا۔ زمانہ کروٹ لے چکا تھا لہذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مخالفتوں کے طوفان کم ہوتے گئے۔ ایک نسل ختم ہوئی اور دوسری نے جنم لیا۔ جب وہ جوان ہوئی تو گزشتہ واقعات کے پس منظر سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں، یا کر دی گئی تھیں۔ انگریزوں اور ان کے کارندوں کا تیار کردہ تعلیمی نصاب جو کچھ سکھاتا رہا، ہم اسے من و عن قبول کرتے رہے اور خود کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی۔ اگر کوئی کوشش ہوئی بھی تو حقائق کو قبول کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہو گیا کیونکہ تصویر کا ایک رُخ، جو بچپن ہی سے دماغ میں ٹھونسا جا چکا تھا، دوسرے رُخ کے واضح ہو جانے کے باوجود اسے رد کرنا اپنی توہین اور حقارت آمیز امر دکھائی دیتا تھا۔ تاہم جنھوں نے حقائق پیش کرنے کی جسارت کی، انھیں بوجوہ مصنوعی جذباتی تحریروں کے ذریعہ ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس

ردعمل کے نتیجے میں بہت سے محققین اس موضوع پر تحقیق کرنے کی طرف راغب نہ ہو سکے، لہٰذا انشا پردازی کے زور سے حقائق کو مزید مسخ کر کے رکھ دیا گیا۔

اگر بات یہیں تک محدود رہتی تو بھی کسی حد تک گوارا تھا مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایک منصوبے کے تحت بعض کتابوں میں قطع و برید کی گئی تاکہ جدید نسل کو مکمل اندھیرے میں رکھا جا سکے۔ ان کتابوں میں مولانا حالی کی "حیات جاوید" اور شیخ محمد اکرام کی "موجِ کوثر" بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم غلط مفروضوں کو حقائق سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور جس کے باعث سرسید کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر باقاعدہ تحقیق کے بغیر کسی حتمی رائے تک پہنچنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کی جستجو میں الفاظ کے گورکھ دھندوں پر مبنی مضامین کا سہارا لینے کی بجائے ہم اصل ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ اپنی قومی زندگی کے ماضی کو صحیح طور پر پیش کر سکیں۔

بعض حلقوں کی عادت ہے کہ اس قسم کے متنازعہ امور میں خود تو ایک فریق کو خواہ مخواہ مطعون ٹھہراتے رہتے ہیں مگر جب اس کے جواب میں اصل حقائق پیش کیے جائیں تو اسے گڑے مردے اکھاڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل انصاف کی ترازو پر پورا نہیں اترتا۔ گزشتہ واقعات ہمارے لیے تکلیف دہ ہوں یا باعثِ فخر، ہمیں اپنی قومی و ملّی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرنے ہیں اگر ہم حقائق سے چشم پوشی کا ارتکاب کریں، یا واقعات کو غلط رنگ میں پیش کر کے قبائح کو محاسن اور محاسن کو قبائح قرار دے ڈالیں تو یہ فیصلے ہماری قومی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہوں گے اور ہم غلط نتیجہ پر پہنچ کر ٹھوکریں کھائیں گے۔ کسی کی برائیوں پر پردہ ڈالنا اور بات ہے لیکن انھیں مستحسن صورت میں پیش کرنا بدقسمتی کی انتہا ہے۔ کمزوریاں بہرحال کمزوریاں کہلانی چاہئیں اور اچھائیاں صرف اچھائیاں۔ غلطی غلطی ہے، اگرچہ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ ہو بلکہ دوسروں کی بھلائی کے جذبہ میں کی جائے، مگر محض اس وجہ سے کہ غلطی کرنے والے کی رائے خلوص پر مبنی تھی اس پر دیانت دارانہ رائے دہی سے گریز کیا جائے تو وہ غلطی

نئی نسل کے سامنے ایک نیک عمل کی صورت اختیار کر جائے گی اور ہم بھٹک جائیں گے۔
شبلی نعمانی کے مطابق۔

"اگر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعروں میں کیا برائی ہے، سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے"[ا]

حقیقت میں گزشتہ واقعات سے تو میں سبق سیکھتی ہیں اور مستقبل کے لیے بہتر لائحہ عمل تجویز کرتی ہیں۔ مجھے کسی فریق کی تحقیر مطلوب نہیں، کون کس حد تک صحیح یا غلط تھا اس وقت اس سے بحث نہیں، میرا مقصود صرف یہ ہے کہ جو بات کی جائے دیانت دارانہ تحقیق سے نتیجہ اخذ کر کے کی جائے۔

جب ہم ہندوستان میں ایک صدی قبل کے دور کی اپنی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں سرسید اور علماء اسلام میں باہمی کشمکش کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ بلا شبہ علمائے کرام نے اجتماعی اور انفرادی طور پر سرسید کی زبردست مخالفت کی۔ اس کا پس منظر کیا تھا، علماء کی انگریزی تعلیم سے نفرت، انگریزی حکومت کے استحکام کے لیے سرسید کی کوششیں یا کچھ اور؟ مشہور محقق شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں سرسید کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس مخالفت کے متعلق عوام بلکہ خواص میں بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں۔۔۔۔۔ سب سے بڑی غلط فہمی، جو اس بارے میں بہت عام ہے یہ ہے کہ علماء نے سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سرسید کے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے اور ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علماء اور اسلام کے ساتھ صریح بے انصافی ہے"[۲]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس مخالفت کی بنیاد کیا تھی ؟ شیخ محمد اکرام اس کے جواب میں اپنی تحقیق کا لب لباب یوں بیان کرتے ہیں :

"اس معمہ کو حل کرنے کے لیے ان مضامین اور فتاویٰ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں شائع ہوئے۔ ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لیے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنھیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے علیگڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ یہی ہوتا ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں، اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں۔ شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل وکتب میں کر رہے تھے۔ سرسید نے ایسا نہیں کیا لیکن ان کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے"[۱۲]

سرسید کے مذہبی خیالات میں تبدیلی کا پہلا عکس ہمیں ان کی تصنیف "تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل" میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق وہ خود رقمطراز ہیں کہ :

"میری تفسیر پڑھنے والا جانے گا، میری تفسیر میں پائے گا کہ میں کچھ پابند نہیں رہا ہوں ان قولوں کا جن کو یہودی عالم یا عیسائی عالم یا مسلمان عالم بلا تحقیقات بطور باپ دادا کے تبرک کے مانتے چلے آئے ہیں"[۱۳]

اس کے بعد جب انھوں نے "احکام طعام اہل کتاب" لکھی اور اس میں ذبیحہ کے متعلق

اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ :

" اگر اہل کتاب کسی جانور کی گردن توڑ کر مار ڈالتا یا سر پھاڑ کر مار ڈالتا ز کوٰۃ سمجھتے ہوں تو ہم مسلمانوں کو اس کا کھانا درست ہے "[۵]

تو مسلمان ان کے سخت خلاف ہو گئے۔ سرسید نے ان خیالات کا نہ صرف اظہار ہی کیا بلکہ سفر لندن کے حالات میں ان پر عمل کرنے کا دعویٰ بھی کیا اور جھٹکے اور گردن توڑ کر مارے گئے پرند جانوروں کے گوشت کے بارے میں یہ لکھا کہ :

" میں نے اور ہمارے ساتھیوں نے ان دونوں قسموں کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت، مٹن، اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے ہیں "[۶]

تو ان کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی اور ان کے اس عمل کو ان کے کافر ہو جانے کا ثبوت قرار دیا گیا۔

بعد ازاں " الخطبات الاحمدیہ " کی تصنیف کے دوران لندن سے اپنے عزیز ترین دوست نواب محسن الملک کو خط لکھتے ہوئے اس کے متعلق خود یہ پیشین گوئی کی۔

" میرے ہم قوم اس محنت کی، جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے، قدر نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتلائیں گے کیونکہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں اور شاید دو یا تین مسئلوں میں جمہور سے اختلاف کیا ہے اور چند علماء کی رائے سے اتفاق کیا ہے "[۷]

لندن سے واپسی پر انھوں نے دو بڑے کام کیے۔ پہلا تہذیب الاخلاق کا اجرا اور دوسرا مدرسۃ العلوم مسلمانان کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین " جمہور سے اختلاف " کا سب سے بڑا ذریعہ بنے اور اس کے بعد وہ عمر بھر ان خیالات کی اشاعت میں مصروف رہے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :

"ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنھیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے، مثلاً شیطان، اجنّہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے"[۸]

مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں ان مسائل کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں سرسید نے علماء سلف سے اختلاف کیا ہے۔ یہ فہرست کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں جہاں انبیائے کرام کے معجزوں کا ذکر ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

"حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور تمام انبیا سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰؑ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلّی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، منّ و سلویٰ کا اترنا یا عیسیٰؑ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ، ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا"[۹]

سرسید نے مندرجہ بالا عقائد کا اظہار ایک صدی قبل کیا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مقام ہے کہ روشن خیالی کے موجودہ دور میں بھی، جب کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان مغربی علوم کی دولت سے مالا مال ہیں، اگر ان خیالات کا اظہار کیا جائے تو اس پر کیا ردّعمل ہو سکتا ہے؟ لہٰذا سرسید کے زمانے میں اُن کی مخالفت ایک فطری امر تھا۔ مخالفین کے ذکر سے قطع نظر خود ان کے دست راست نواب محسن الملک کی مخالفت کا حال اُن ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"... یہ تھا ہے کہ ہمارے مسلمہ عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انھوں نے شدومد کے ساتھ ظاہر بھی کردیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علماء کو ان کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہ تھا، اور بعض نے یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دے دیے۔ اور اُن کو کیا کہوں، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں اُن سے اختلاف کرنا پڑا، بحث ومباحثے رہے ہیں[۱۰]"

اس کے علاوہ ایک اور لکچر میں انھوں نے بیان کیا:

"شاید سب سے پہلے میں نے ہی اُن کے کفر کا فتویٰ دیا تھا، ان کو چھاپا دری کہا ہے[۱۱]"

مولانا حالی سرسید کے اتنے عظیم معتقد تھے کہ جب انھوں نے سرسید کی سوانح "حیاتِ جاوید" کے نام سے لکھی تو شبلی نعمانی نے اسے "مدلّل مداحی" قرار دیا اور دیگر نقادوں نے بھی اس کتاب میں موافقانہ مبالغہ آرائی کی شکایت کی۔ سرسید سے اپنی اس زبردست عقیدت کے باوجود مولانا حالی نے خود کئی مقامات پر اُن سے اختلاف کیا ہے۔ اس اختلاف اور عقیدت کا ملا جلا اظہار ان کے مندرجہ ذیل بیان سے بخوبی ہوتا ہے جس میں انھوں نے سرسید کی تفسیر القرآن کے متعلق رائے دی ہے:

"سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں[۱۲]"

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سرسید کے بہترین رفقائے کار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ علی گڑھ تحریک کا ایک ستون تھے۔ سرسید نے کئی موقعوں پر ان کی شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ سرسید کے ہم سوار ہونے کے باعث مخالف اخباروں میں انھیں "نیچری بھانڈ" کا خطاب دیا گیا اور سرسید کے مخالفین سے لاہور کی عدالتوں میں ان کی مقدمہ بازی بھی ہوتی رہی۔ انھوں نے خود

"ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور یہاں مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنھیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے، مثلاً شیطان، اجنّہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے"[۸]

مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں ان مسائل کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں سرسید نے علماء سلف سے اختلاف کیا ہے۔ یہ فہرست کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں جہاں انبیائے کرام کے معجزوں کا ذکر ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

"حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور تمام انبیاء سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰؑ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلّی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، منّ و سلویٰ کا اترنا یا عیسیٰؑ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ، ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا"[۹]

سرسید نے مندرجہ بالا عقائد کا اظہار ایک صدی قبل کیا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مقام ہے کہ روشن خیالی کے موجودہ دور میں بھی، جب کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان مغربی علوم کی دولت سے مالا مال ہیں، اگر ان خیالات کا اظہار کیا جائے تو اس پر کیا ردّ عمل ہو سکتا ہے؟ لہٰذا سرسید کے زمانے میں اُن کی مخالفت ایک فطری امر تھا۔ مخالفین کے ذکر سے قطع نظر خود ان کے دست راست نواب محسن الملک کی مخالفت کا حال اُن ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"یہ سچ ہے کہ ہمارے مسلمہ عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انھوں نے شد و مد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علماء کو ان کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہ تھا، اور بعض نے یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دے دیے۔ اور اُن کو کیا کہوں، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں اُن سے اختلاف کرنا پڑا، بحث و مباحثے رہے"[10]

اس کے علاوہ ایک اور لکچر میں انھوں نے بیان کیا:

"شاید سب سے پہلے میں نے ہی اُن کے کفر کا فتویٰ دیا تھا، ان کو چھپایا دری کہا"[11]

مولانا حالی سرسید کے اتنے عظیم معتقد تھے کہ جب انھوں نے سرسید کی سوانح "حیاتِ جاوید" کے نام سے لکھی تو شبلی نعمانی نے اسے "مدلّل مداحی" قرار دیا اور دیگر نقادوں نے بھی اس کتاب میں موافقانہ مبالغہ آرائی کی شکایت کی۔ سرسید سے اپنی اس زبردست عقیدت کے باوجود مولانا حالی نے خود کئی مقامات پر اُن سے اختلاف کیا ہے۔ اس اختلاف اور عقیدت کا ملا جلا اظہار ان کے مندرجہ ذیل بیان سے بخوبی ہوتا ہے جس میں انھوں نے سرسید کی تفسیر القرآن کے متعلق رائے دی ہے:

"سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں"[12]

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سرسید کے بہترین رفقائے کار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ علی گڑھ تحریک کا ایک ستون تھے۔ سرسید نے کئی موقعوں پر ان کی شان دار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ سرسید کے ہم سوار ہونے کے باعث مخالف اخباروں میں انھیں "نیچری بھانڈ" کا خطاب دیا گیا اور سرسید کے مخالفین سے لاہور کی عدالتوں میں ان کی مقدمہ بازی بھی ہوتی رہی۔ انھوں نے خود

قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی ہے۔ سر سید کی تفسیر پر وہ ان الفاظ میں رائے زنی کرتے ہیں:

"مجھ کو ان کے معتقدات بالسر ہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر "دیوان حافظ" کی اُن شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جو ترطوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے)، قرآن کے منزّل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل۔۔۔۔۔۔ یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حامل وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب ومدوّن کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا"[۱۴]

سر سید کے مذہبی نظریات کے متعلق مندرجہ بالا آرا خود ان کے قابلِ قدر ساتھیوں کی ہیں اور یقیناً یہ نظریات ان کے خلاف فتووں کی بنیاد بنے۔ اس ضمن میں سر سید ایک بزرگ معتقد کو طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

"میری نسبت تو بہ سبب میری تصنیفات کے فتویٰ ہائے کفر ہو چکے ہیں۔ آپ میری تحریرات کو پسند فرماتے ہیں، آپ پر بھی فتویٰ ہائے کفر ہوا چاہئیں گے"[۱۵]

اور یہی بنیاد علی گڑھ کالج کی مخالفت کا باعث ہوئی۔ سر سید نے خود ایک تقریر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"جس زمانہ میں اس کالج کی تدبیریں شروع ہوئیں تو ہر جگہ کے لوگوں نے اس کو پسند کیا اور ہر حصۂ ملک سے اس کی تائید ہوئی اور ہوتی چلی جاتی ہے، مگر بعض مذہبی مسائل جو میں نے بیان کیے ان کے لحاظ سے البتہ لوگوں کو کچھ کچھ شبہ ہوا اور فتور پڑا"[۱۶]

شروع شروع میں جب یہ شبہات بڑھے تو بدگمانیوں نے جنم لیا جو آہستہ آہستہ صریح مخالفت میں تبدیل ہوتی گئیں۔ مولانا حالی ان کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور ہے۔ اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لیے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لیے غلط تھا کہ حالتِ موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو"[۱۷]

غالباً "پہلی" بدگمانی" سرسید کے ان عزائم کے باعث پیدا ہوئی ہوگی جن کا اظہار انھوں نے کالج قائم کرنے کے اسباب اور مقاصد بیان کرتے ہوئے کیا:

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو ازروئے مذہب کے مسلمان اور ازروئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں"[۱۸]

دوسری" بدگمانی" کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی مخالفت میں وہ علماء پیش پیش ہوں گے جو انگریزی سلطنت کا استحکام ہندوستان میں نہیں چاہتے تھے۔ شیخ محمد اکرام اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان دقیانوسی علمائے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکار انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مدرستہ العلوم

کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے اور دونوں معزز سرکاری ملازم تھے۔[19] مولانا حالی ان کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں:

"مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رُعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے، ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے۔ یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی، اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا۔ باوجود اس کے مدرستہ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع ان ہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔"[20]

ان میں سے پہلے بزرگ کے متعلق ان کے خیالات سرسید کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"مولوی سید امداد العلی خان بہادر، جو فضل الٰہی سے ہماری قوم میں ایک بہت بڑے اعلیٰ افسر و رئیس ہیں اور ہمارے بہت بڑے شفیق دوست ہیں، مدرستہ العلوم میں ان کے شریک نہ ہونے سے ہم کو نہایت رنج ہے اور نیز قوم کی بھلائی میں نقصان ہے اور ہم جب ان سے ملتے ہیں، مدرستہ العلوم میں شریک ہونے کی التجا کرتے ہیں دربار دہلی میں بھی ہم نے اُن سے التجا کی۔ انھوں نے فرمایا کہ دو شرط سے ہم شریک ہوں گے: اول یہ کہ "تہذیب الاخلاق" کا چھاپنا بند کردو یا اس میں کوئی مضمون متعلق مذہب مت لکھو۔ دوسرے یہ کہ اپنے عقائد و اقوال سے جو برخلاف علماء متقدمین ہیں، توبہ کر دو۔"[21]

دوسرے بزرگ بھی سرسید کی ذات یا انگریزی تعلیم سے نہیں بلکہ ان کے مذہبی خیالات

بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ مولوی علی بخش خاں نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ کو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خاں صاحب ایک شخص لائق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا ان کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خود رائی سے مذہبی دست اندازی و انقلاب دین ایسا ان کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہوگئی اور تمام قوم کو ان سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے ان کے خیالات مذہبی سے ہے، نہ کہ ان کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے"[22]

یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آیا سر سید کے مخالف علماء سرکار انگریزی کے "استحکام" کے خلاف تھے یا حامی، کیونکہ سرکاری ملازمت میں رہ کر بھی اندرونی طور پر حکومت کا مخالف ہوا جا سکتا ہے۔ سر سید اپنے مضامین میں "قومی ہمدردی" اور "قومی عزت" کے الفاظ اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ پہلے بزرگ یعنی سید امداد العلی کو انھوں نے ان باتوں کا مخالف قرار دیا۔ اس کی تردید میں سید امداد العلی ثبوت کے طور پر اپنی "خیر خواہی سرکار" کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

"جس خیر خواہ سرکار کی نسبت یہ سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں یہ ظن رکھتا ہے کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتا ہے، اس تحریر کا محاکمہ میں حکام وقت اور جملہ مسلمانان و اہل ہنود پر چھوڑتا ہوں کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہو کر بنظر نمک حلالی اپنے آقا کے سینہ پر گولی باغیوں کی کھائے اور ہزار ہا روپیہ کا مال اُن سے چھڑائے، اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر رے صاحب بہادر نکالیں کہ جس کا خون مسٹر لو صاحب، داماد لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر، اور جینٹ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متھرا پونچھتے جائیں اور اس گولی کا نشان تصدیق ایک تمغہ ہمدردی اور نمک حلالی ملکہ معظمہ کا جس بہادر کے سینہ پر موجود ہو تو انصاف فرمایا جائے کہ کیا وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہو سکتا ہے؟"[23]

"قومی عزت" کا یہ تمغہ حاصل کرنے والے سید امداد العلی ۱۸۵۸ء کی جنگ آزادی کے

دوران انگریزوں کی حمایت میں اپنے ہم وطنوں کی گولی کھا کر زخمی ہوئے تھے۔ جاں نثاری کے اس عملی ثبوت کے بعد انھیں انگریزی حکومت کا مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان ہی بزرگ نے ہندوستان کے تمام مکاتیبِ فکر کے علمائے سرسید کے خلاف تکفیر کے فتوے حاصل کر کے رسالہ "امداد الآفاق برجم اہل النفاق" بجواب پرچہ "تہذیب الاخلاق" کے آخر میں شائع کیے۔ مولانا حالی ان فتووں کے مطالعہ کے بعد وضاحت کرتے ہیں:

"مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں، کیا سنّی، کیا شیعہ، کیا مقلّد کیا غیر مقلّد، کیا وہابی کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔"[۲۴]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"دلّی، رام پور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساٹھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتوؤں پر مہریں اور دستخط کیے تھے، گویا ہندوستان کے تمام اہلِ حل و عقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا۔ صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی، سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی پوری کر دی۔"[۲۵]

یعنی ان دوسرے بزرگ نے حرمین شریفین جا کر مذاہبِ اربعہ کے مفتیوں سے سرسید کے خلاف فتوے حاصل کیے۔ مولانا حالی نے اپنی کتاب میں ان کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔

سرسید نے ان حصولِ فتاویٰ کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے:

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا ...... سبحان اللہ، ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے، کسی کو حاجی اور کسی کو غازی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا تا ہے۔"

ایسا ذکر ہمیشہ لطیف پیرایوں میں نہیں ہوتا تھا۔ بحث ومباحث کے اس تمام دور میں سرسید کے دوستوں کی طرف سے جو شدید ردّ عمل ظاہر کیا جاتا رہا اس کے بیان سے قطع نظر علماء اسلام اور ان فتووں کے بارے میں خود سرسید کے تاثرات کا ذکر حالات کے پس منظر کو بہتر طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ ذیل میں سرسید کی تحریروں سے چند مختصر اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

"جو لوگ کہ ہماری تدبیروں کی مخالفت کرتے ہیں وہ سچے دشمن اسلام کے اور مسلمانوں کے ہیں۔ تمام باتیں اُن کی ظاہری اور محض جھوٹی ہیں۔ اپنے مطلب پر وہ وہ باتیں کرتے ہیں جو ایک ادنیٰ دنیادار بھی نہیں کیا کرتا۔ کیا اس زمانہ کے لوگ واقف نہیں ہیں کہ اپنی غرض پر مولوی نون لبسر اور مولوی سین لبسر اور مولوی میم لبسر اور مولوی عین لبسر وغیرہ وغیرہ نے کیا کیا، کیا ہے جو لوگ ہماری تکفیر کا فتویٰ دیتے ہیں، ذرا ان کو شرم کرنی چاہیے اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہیے کون سی لمبی پوزیشن کے مولوی صاحب ہیں جن کے حال اور کرتوت سے ہم واقف نہیں"؟ [۲۷]

"اسرار اسلام کے سمجھانے والے سب مٹ گئے اور صرف اسلام کا بجن گنگا کر روٹی کمانے والے اور اپنا دوزخ بھرنے کو تمام دنیا کو دوزخ میں بھیجنے والے باقی رہ گئے جو بہشت کو خاص اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، کفر کے خزانے کے مالک ہیں، اس میں سے ہر ایک کو جتنا جتنا مناسب سمجھتے ہیں تحفہ دیتے ہیں" [۲۸]

"افسوس، صد افسوس! ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اس کی تحقیقات کرے اور اس پر غور کیا جائے تو اس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور، مری مرغی کھانے والا بناتے ہیں" [۲۹]

"کیسا ملّاؤں کے اس فتویٰ کفر سے، کہ عذاب قبر سے انکار کیا اور معراج سے منکر ہوئے اور شیطان کے وجود کو جُدا گانہ میں نہ ماننے سے نص قرآنی کا انکار

کیا؟ کچھ ڈھونڈتا نہیں چاہیے۔ اگلے لوگوں نے جن میں سب کے سرتاج امام حجۃ الاسلام غزالیؒ ہیں اور سب کے آخر شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہیں ان کی نسبت بھی ان کٹھ ملاؤں نے اسرار دین کے بیان کرنے کے سبب سے بہت سے کفر کے فتوے دیے ہیں۔ ان فتوؤں سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑا مگر ان کٹھ ملاؤں کی ہنڈیا میں جو تھا وہی ان کے چمچوں میں نکل آیا ہے۔[۵]

" ان فتوؤں سے کیا ہوتا ہے؟ بقول مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے کہ گوز شتر کے برابر بھی کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ پہلے وہ خود تو مسلمان ہولیں جب دوسروں کی تکفیر کریں۔[۶]

مندرجہ بالا تمام حوالہ جات موضوع زیر بحث کے پس منظر پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالتے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کے خلاف فتاویٰ کفر کی بنیاد میں انگریزی تعلیم کی مخالفت کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں پرورش پا چکا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں اور یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

حوالہ جات

۱ مکاتیب شبلی (حصہ اول)، مطبع شاہی لکھنؤ (۱۹۱۶)، ص ۱۴۲۔

۲ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، فیروز سنز لاہور، ص ۷۶۔

۳ ایضاً، ص ۷۷۔ ۷۸۔

۴ تبیین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل، سرسید (جلد دوم)، ذاتی پریس سرسید غازی پور علی گڑھ ص ۱۴۱۔ ۳۴۲۔ (۱۸۶۳/۱۸۶۵)

۵ احکام طعام اہل کتاب، سرسید، مطبع منشی نول کشور کانپور (۱۸۶۸)، ص ۱۷۔

۶ مسافران لندن، سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۱)، ص ۷۴۔

۷ خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود، نظامی پریس بدایوں (۱۹۲۴)، ص ۷۱۔

۸ موج کوثر، ص ۷۹ -- ۸۰۔

۹ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو دہلی (۱۹۳۹)، حصہ دوم، ص ۲۳۵۔

۱۰ مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴) ص ۵۰۸۔

۱۱ ایضاً، ص ۴۱۲۔

۱۲ حیات جاوید (حصہ اول)، ص ۲۰۴۔

۱۳ بحوالہ مضحکات و مطائبات سرسید، خیر علی خاں سرخوش، مطبوعہ لاہور (طبع اول) حصہ دوم، ص ۲۳۔

۱۴ موعظہ حسنہ، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۳)، ص ۱۹۹ -- ۲۰۰۔

۱۵ خطوط سرسید، ص ۳۲۹۔

۱۶ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید، مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰)، ص ۱۵۳۔

۱۷ حیات جاوید (حصہ دوم)، ص ۲۸۲۔

۱۸ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج علیگڑھ مرتبہ نواب محسن الملک، علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس (۱۸۹۸)، دیباچہ ص ۳۔

۱۹ موج کوثر، ص ۸۰۔

۲۰ حیات جاوید (حصہ دوم)، ص ۲۴۵ - ۲۴۶۔

۲۱ مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور، جلد دہم (۱۹۶۲)، ص ۵۶۔

۲۲ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ۱۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ، ص ۷۲۔

۲۳ مضحکات و مطائبات سرسید (حصہ اول)، ص ۹۱۔ (۲۴) حیات جاوید (حصہ دوم)، ص ۲۵۱

۲۵ ایضاً، ص ۱۵۴۔ (۲۶) تہذیب الاخلاق (جلد دوم)، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱۶

۲۷ مقالات سرسید (جلد ہفتم ۱۹۶۲)، ص ۲۸۸ (۲۸) ایضاً (جلد پانزدہم ۱۹۶۲)، ص ۱۵۸

۲۹ خطوط سرسید، ص ۸۷ (۳۰) تہذیب الاخلاق (جلد دوم)، ص ۱۶۶

۳۱ مقالات سرسید (جلد ہفتم)، ص ۲۸۷۔

خانوادۂ ولی اللہی کی زیریں شاخیں،
اور اُن کے نسبی سلسلے

از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی :

(۲)

نسب نامہ مولانا مولوی عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1]

مورث اعلیٰ مولوی معین الدین صاحب معروف بہ شاہ اجمیری۔ ان کے دو لپسر یکے مولوی شاہ نور اللہ، دوسرے مولوی نبقیر اللہ، ایک دختر مسماۃ عائشہ، بیان مسماۃ عائشہ کہ ان کی شادی ہوئی شیخ علیم الدین سے، از بطن مسماۃ رحمت مولوی نور اللہ اور ایک دختر عائشہ پیدا ہوئیں، مولوی نور اللہ کی شادی ہوئی مسماۃ بی بی امیرہ بنت مولوی شمس الحق سے، مولوی نور اللہ کی بود و باش اور مکان موضع پھلت میں تھا، مگر شرفاء اہل قصبہ بڈھانہ کو اعتقاد د خلہ بہت ہوا، (تو) ان کی بود و باش، وہاں یعنی بڈھانہ کی ہوئی، چنانچہ اس کی تاریخ یہ ہے

"اے آمدنت باعث آبادی ما" ۱۱۳۸ھ

انھوں نے چہار لپسر اور سہ دختر چھوڑیں، اور اہلیہ ان کی روبرو ان کے وفات پاگ تفصیل اولاد کی یہ ہے، مولوی عطاء اللہ لپسر کلاں، ہبتہ اللہ، عطیتہ اللہ، فضل اللہ، صبیحہ، حبیبہ مولوی عطاء اللہ کی شادی ہوئی مسماۃ امینہ ہمشیرہ محمد احسان خاندان محمد فائق میں ان کی اولاد ایک دختر مسماۃ امت القادر عرف نھو پیدا ہوئیں ان کی شا

---

[1] اصل نسخہ میں یہاں مولانا عبد القیوم صاحب کا نام تھا۔

محمد صادق پسر محمد فائق سے ہوئی اور وہ لاولد گئیں، اور مولوی عطاء اللہ صاحب کا انتقال مرادی متصل سرونج میں ہوا، چنانچہ قبر ان کی وہاں پر موجود ہے، اور سوا دو صد بیگہ آراضی وہاں بطور جاگیر سرکار نواب منظفر خاں صاحب سے عطا ہوئی تھی۔

اور میاں عطیۃ اللہ کی شادی ہوئی امینت دختر احمد، ہمشیرہ محمد واز سے، ان کی اولاد مساۃ خیر النساء کی شادی ہوئی مسمی جھنڈو، والد مساۃ فخر النساء زوجہ حمایت علی سے ---- اور آخیر میں میاں عطیۃ اللہ نے بود و باش شہر ناگپور میں اختیار کی تھی، اور معاش ان کی دو موضع جاگیر سرکار راجہ رگوجی نے عطا کی تھی، انھوں نے وہاں شادی کی، ان سے ایک پسر مسمی مولوی احمد اللہ صاحب۔ سید صاحب کے ساتھ آخر لڑائی میں شہید ہو گئے [1] اور ایک دختر رحیم النساء لاولد مر گئی، اور خود میاں عطیۃ اللہ فوت ہو گئے، اور کارو بار درہم برہم ہو گیا۔

میاں فضل اللہ کی شادی ہوئی مساۃ عزیزاً بنت مولوی جعفر، خاندان محمد انور (سے)، اولاد ہوئی ان کے دو پسر ایک جلال الدین دوسرے صلاح الدین، اور سہ دختر فاضلہ، واصلہ، زہرہ، میاں جلال الدین کی شادی ہوئی مساۃ قمر النساء بنت محمد انور سے، (وہ) لا ولد فوت ہوئے۔ صلاح الدین کی شادی ہوئی مساۃ حیات النساء بنت حافظ احمد الدین (سے)، اور وہ ہمراہی سید صاحب شہید ہو گئے، اور زوجہ ان کی موجود ہیں کچھ اولاد نہیں ہوئی۔

مساۃ فاضلہ کی شادی ہوئی مسمی قمر الدین بن محمد انور سے، میاں قمر الدین ہمراہی سید صاحب شہید ہو گئے، اور مساۃ فاضلہ اپنے گھر پر فوت ہوئیں، اور اولاد سہ پسر اور دو دختر ہوئیں، ایک پسر ناصر الدین، اور ایک پسر حافظ محی الدین، اور ایک پسر مولوی محمد ایوب، اور دو دختر ایک مساۃ امیرہ والدہ مولوی رفیع الدین، ماموں ناقل خود الموسوم بہ عبدالحی (کذا؟) دوسری دختر

---

[1] مولوی احمد اللہ صاحب کے تعارف کے لیے رجوع فرمائیے۔ جماعت مجاہدین، چودھری غلام رسول مہر، صفحہ ۲۳۳ (کتاب منزل۔ لاہور) ن۔ ر۔

رابعہ، ناصر الدین کی شادی ہوئی مسماۃ زینب بنت حمید الدین سے، وہ روبرو والدین اور زوجہ کے ہمراہی جناب سید صاحب شہید ہوئے۔ اور حافظ محی الدین کی شادی ہوئی مسماۃ مریم بنت حافظ نظام الدین سے، ان سے دو پسر ایک عبد الہادی، دوسرے حافظ شمس الدین، اور دو دختر امۃ الرؤف دوسری جنت، مسمی عبد الہادی کی شادی ہوئی مسماۃ فاطمہ بنت حافظ شہاب الدین سے، ان کے دو پسر ہوئے پہلے حافظ عبد الرحمان، دوسرے حافظ عطاء اللہ پیدا ہوئے، اور مسمی حافظ شمس الدین کی شادی مسماۃ نقیہ بنت سعید الدین سے ہوئی، اور امۃ الرؤف کی شادی ہوئی مسمی محمد عمر بن غلام محمد سے، اور مسماۃ جنت کی شادی ہوئی حافظ فقیہ الدین بن سعید الدین سے۔

بیان ھبۃ اللہ کا:۔ بمقام بڈھانہ پیدا ہوئے، اور بعمر قریب ستر برس بقافلہ سید احمد صاحب براہ حج بمقام کلکتہ انتقال فرمایا، اور اندرون کوٹھی منشی امین الدین مدفون ہوئے۔ ان کی شادی مسماۃ ذکیہ بنت علیم الدین سے ہوئی تھی، اور مسماۃ ذکیہ کی والدہ کا نام عائشہ بنت مولوی معین الدین تھا۔

اور شیخ ہبۃ اللہ کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا پیدا ہوا، بیٹی کا نام واجدہ تھا، اور بیٹے کا نام مولانا عبد الحی صاحب تھا، اور مسماۃ واجدہ کی شادی حافظ کمال الدین سے ہوئی تھی اور مولانا عبد الحی صاحب نے تیسری شادی مسماۃ واصلہ بنت شیخ فضل اللہ سے کی، ان سے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا، ایک بیٹی کا نام عابدہ تھا، دوسری کا عائشہ بعمر سہ سالہ بسفر حج اندر جہاز انتقال کر گئی، تیسری بیٹی فاطمہ، ان کی شادی مولوی محمد عمر بن مولانا محمد اسمٰعیل سے ہوئی اور وہ لاولد گئیں، مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا، اور مسماۃ عابدہ کی شادی شیخ قیام الدین عرف اللہ دیا بن شیخ کمال الدین سے ہوئی تھی، اور مسماۃ عابدہ نے بمقام ٹونک انتقال فرمایا، اور ان کی ایک بیٹی امۃ اللہ تھیں، اور مسماۃ امۃ اللہ کی شادی حافظ سلیمان بن حافظ عثمان سے ہوئی، ان سے دو پسر اور ایک دختر، لڑکوں کا نام حافظ محمد داؤد، و مولوی محمد یونس ہے اور

لڑکی کا نام امت القادر ہے۔

اور مولوی عبدالحیٰ صاحب کے لڑکے کا نام مولوی عبدالقیوم صاحب ہے، ان کا تاریخی نام غلام نقی ہے۔ ۱۹ صفر شب دوشنبہ کو عشاکی اذان کے ساتھ قصبہ بڈھانہ میں پیدا ہوئے، ان کی شادی مساۃ امت الرحیم بنت مولانا شاہ محمد اسحاق سے ہوئی، اس سے دو پسر مولوی محمد یوسف وحافظ محمد ابراہیم صاحب، اور ایک دختر مساۃ سائرہ پیدا ہوئی۔

اور مولوی محمد یوسف صاحب کی اول شادی سعید النساء بنت اکبر علی سے ہوئی، ان بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی خان دوراں خاں کے خاندان میں مساۃ انجمن آرا بیگم (بنت) سید محمد ناصر امیر ساکن دہلی سے ہوئی، ان سے ایک پسر مسمی مولوی محمد سلیمان اور دو دختر مساۃ میمونہ ومساۃ صبیحہ پیدا ہوئیں، مساۃ صبیحہ کا انتقال ہوگیا، میاں محمد سلیمان کی شادی خاندان شیخ عبدالقادر جیلانی میں مساۃ اصغری بیگم بنت سید جلال الدین ساکن دہلی سے ہوئی، ان سے دو پسر مسمی محمد یحییٰ، ومسمی محمد عثمان اور ایک دختر مساۃ امت الرحمٰن پیدا ہوئیں، اور اپنے والدین کے سامنے انتقال کیا، قلندر شاہ کے تکیہ میں قبر ہے۔

اور حافظ محمد ابراہیم کی شادی مساۃ امت القادر بنت حافظ سلیمان بن حافظ عثمان سے ہوئی، ان سے ایک پسر حافظ محمد اسمٰعیل، اور دو دختر مساۃ آمنہ ومساۃ امت الحیٰ، دونوں لڑکیوں کا صغر سنی میں انتقال ہوگیا، میاں محمد اسمٰعیل کی شادی مساۃ میمونہ بنت مولوی محمد یوسف صاحب سے ہوئی تھی ان سے ایک دختر ام السلمیٰ اور ایک ام حبیبہ، اور ایک پسر حافظ مولوی مسمی محمد احمد پیدا ہوئے۔

اور مساۃ واصلہ کا انتقال مکہ معظمہ میں ہوا، اور مساۃ زہرہ ان کی شادی شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرشید سے ہوئی تھی اور وہ بمقام مدینہ منورہ فوت ہوئیں۔ ان کی تین دختر تھیں ایک مساۃ ہاجرہ، عائشہ امت الرحمان، مساۃ ہاجرہ نے بچپن میں انتقال کیا، اور مساۃ عائشہ نے بعد شادی بمقام جھنجانہ انتقال کیا، اور مساۃ امت الرحمان موجود ہیں۔

بیان دختران مولوی نور اللہ صاحب: مساۃ ملیحہ کی شادی مولوی علاء الدین بن علیم الدین سے ہوئی، اوران کی دو بیٹیاں تھیں، مساۃ بتول اور مساۃ فضیلت، اور مساۃ بتول کی شادی شیخ محمد مراد بن شیخ محمد رشاد سے ہوئی تھی، اور ان کی ایک بیٹی اور سب بیٹے محمد حماد، وحافظ محمد عثمان، وعبدالرزاق اور دختر مساۃ نعمت۔ اور شیخ محمد حماد کی شادی مساۃ راحت بنت شیخ محمد انور سے ہوئی تھی، ان کے دو پسر ہوئے عبدالرحمان وعبدالرحیم، عبدالرحمٰن ردبرو دالدین بقاطہ سید صاحب شہید ہوئے، اور عبدالرحیم باقی رہے، ان کی دو شادیاں ہوئیں، اول مساۃ ذاکرہ بنت حافظ محمد عثمان سے (ہوئی)، اول سے دو پسر پیدا ہوئے ایک محمد یوسف دوسرے محمد ابراہیم، دوسری شادی مساۃ فاطمہ بنت عبدالعزیز سے ہوئی، ان سے ایک پسر اور ایک دختر، نام پسر کا رشید احمد نام لڑکی کا امت الرشید تھا۔

اور حافظ محمد عثمان کی شادی مساۃ سکھن بنت فضیل سے ہوئی، اوران کے ایک پسر اور ایک دختر ہوئی۔ نام پسر کا حافظ سلیمان، اور دختر کا نام ذاکرہ، اور حافظ سلیمان کی شادی ہوئی مساۃ امت اللہ بنت قیام الدین عرف اللہ دیے سے، ان کی اولاد کا بیان خاندان مولانا عبدالقیوم میں تحریر ہو چکا ہے۔

اور مساۃ ذاکرہ کی شادی مسمی عبدالرحیم سے ہوئی تھی، جس کی اولاد کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ شیخ عبدالرزاق کی شادی مساۃ رقیہ عرف اللہ دی بنت حافظ کمال الدین سے ہوئی تھی، ان کی ایک دختر مسمی ام سلمیٰ موجود ہے، ان کی شادی شیخ سعیدالدین بن شیخ جمال الدین سے ہوئی، ان کے ایک پسر اور سہ دختر موجود ہیں، ایک حافظ فقیہ الدین، دوسرے امیرالدین، ایک لڑکی مساۃ صفیہ، دوسری تقیہ، تیسری نقیہ۔

اور حافظ کمال الدین کی شادی مساۃ جنت بنت حافظ محی الدین سے ہوئی، ان کے پسر اور ایک دختر فی الحال موجود ہے، ایک پسر کا نام کبیرالدین، دوسرے کا نام خلیل الدین، ا دختر کا نام نعمت عرف موتی ہے، اور مساۃ صفیہ کی شادی محمد عمر بن عبدالواسع عرف شیخ مسیتا سے

ان سے ایک پسر اور ایک دختر موجود ہے۔ اور مسماۃ تقیہ کی شادی حافظ شمس الدین بن حافظ محی الدین سے ہوئی، ان سے دو لڑکیاں باقی رہیں۔

بیان مسماۃ نعمت : یہ روبرو اپنے والدین کے فوت ہوئیں۔ ان کی شادی محمد سمیع بن مولوی محمد صفی بن حافظ فقیر اللہ بن مولوی معین الدین سے ہوئی۔ ان سے فقط ایک دختر مسماۃ النعمت النساء ہیں، اور ان کی شادی شیخ جمال الدین بن شیخ عزیز الدین سے ہوئی، ان کے دو پسر ایک شیخ معید الدین، دوسرے حفیظ الدین ہوئے۔

بیان مسماۃ صبیحہ کا یہ ہے کہ شادی ان کی مولوی شیخ محمد بن شاہ ولی اللہ سے ہوئی، لاولد فوت ہوگئیں، دہلی میں مدفون ہیں۔ بیان مسماۃ جبیبہ کا : ان کی شادی ہوئی شاہ عبدالعزیز صاحب سے، جن کا بیان اس سے پہلے اولاد شاہ صاحب میں تحریر ہوچکا ہے۔ اور بیان اولاد مسماۃ عائشہ ہمشیرہ صاحبہ شاہ نور اللہ یہ ہے کہ ان کی شادی شیخ علیم الدین سے ہوئی، ان سے ایک پسر مسمی مولوی علاء الدین، اور سہ دختر یکے سعیدہ، دوسری صالحہ، تیسری ذکیہ۔

بیان مولوی علاء الدین کا : یہ ہے کہ ان کی شادی مسماۃ ملیحہ دختر مولوی نور اللہ سے ہوئی، اور بی ذکیہ کی شادی میاں ہبتہ اللہ سے، اور بی صالحہ کی شادی میاں محمد ارشاد سے، ان کے دو پسر یکے حافظ کمال الدین، دوسرے شیخ مراد۔

بیان اولاد مسماۃ سعیدہ کا یہ ہے کہ شادی ان کی میاں احمد پسر محمد حیات سے ہوئی۔ اور میاں احمد کے ایک پسر محمد انور کی شادی کریما بنت میاں محمدی ہمشیرہ سلّو، اور ان کی ایک لڑکی مسماۃ حمیتہ، ان کی شادی میاں عبدالرشید سے ہوئی۔ فقط۔

نور الحسن کاندھلوی

حضرت شیخ وجیہ الدین

- شیخ ابو رضا محمد
  - مولانا حسین
  - (شوہر نعمت بن شیخ مفیض اللہ)
- شیخ عبد الرحیم
- شیخ عبد الحکیم
  - لاولد

شیخ عبد الرحیم:

- از زوجہ اولیٰ: شیخ صلاح الدین — لاولد
- حضرت شاہ ولی اللہ رح
- (از زوجہ دوم فخر النساء بنت شیخ محمد پھلتی)
  - شاہ اہل اللہ
    - مولوی معظم عرف شاہ محمدی
    - (شوہر فاطمہ بنت محمد فائق بن شاہ محمد عاشق)
      - محمد مکرم — لاولد
      - محمد محتشم (شوہر امت الغفور بنت شاہ محمد اسحاق)
        - عبد الرحمٰن
      - امت العزیز عرف بی جان — لاولد

حضرت شاہ ولی اللہ رح:

- (از زوجہ اولیٰ مسماۃ امت الرحیم)
  - مولوی محمد
  - (شوہر صبیحہ بنت مولوی نور اللہ)
  - لاولد
- (از زوجہ ثانیہ محترمہ بی بی ارادت سونی پت)
  - حضرت شاہ عبد العزیز عرف سیتا (شوہر مسماۃ حبیبہ بنت شاہ نور اللہ)
    - عائشہ (زوجہ محمد افضل)
    - قطب الدین
    - پسر
    - مریم (زوجہ مولوی عبد الغنی؟)
    - دختر لاولد
    - رحمت (زوجہ مولوی محمد عیسیٰ بن شاہ رفیع الدین)
  - عبد الوہاب معروف بہ شاہ رفیع الدین
  - شاہ عبد القادر
    - زینب
    - (زوجہ مولوی محمد مصطفےٰ بن شاہ رفیع الدین)
      - جمیلہ
        - مولوی محمد عمر
  - شاہ عبد الغنی
    - شوہر مسماۃ فضیلت بنت مولانا علاء الدین

حضرت شاہ محمد اسحاق

مولانا شاہ محمد یعقوب (از بطن مسماۃ ظہوراً)
فاطمہ
(زوجہ مرزا امیر بیگ بن مرزا امداد سردھنہ)
خلیل الرحمن (شوہر دختر نظیر بیگ)

مسماۃ مبارک
(زوجہ مولانا شاہ عبدالحیؒ
بڈھانوی)

(اولاد از لاڈلی بیگم بنت میاں مدد علی)

خدیجہ
(زوجہ سید نصیر الدین
نواسہ شاہ رفیع الدین)

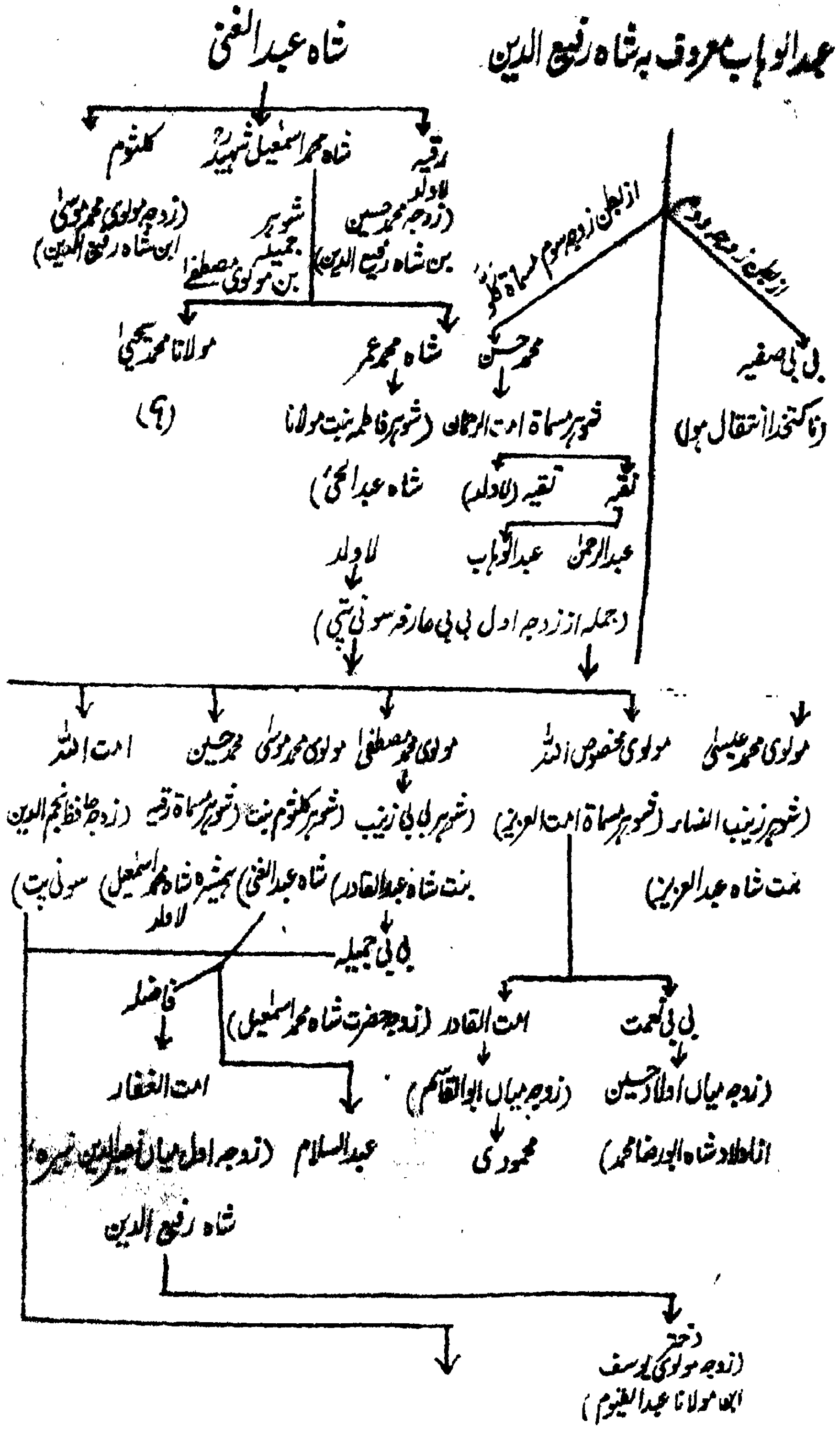
سلیمان

یوسف

امت الغفور
(زوجہ حافظ محمد محتشم)
عبدالرحمن

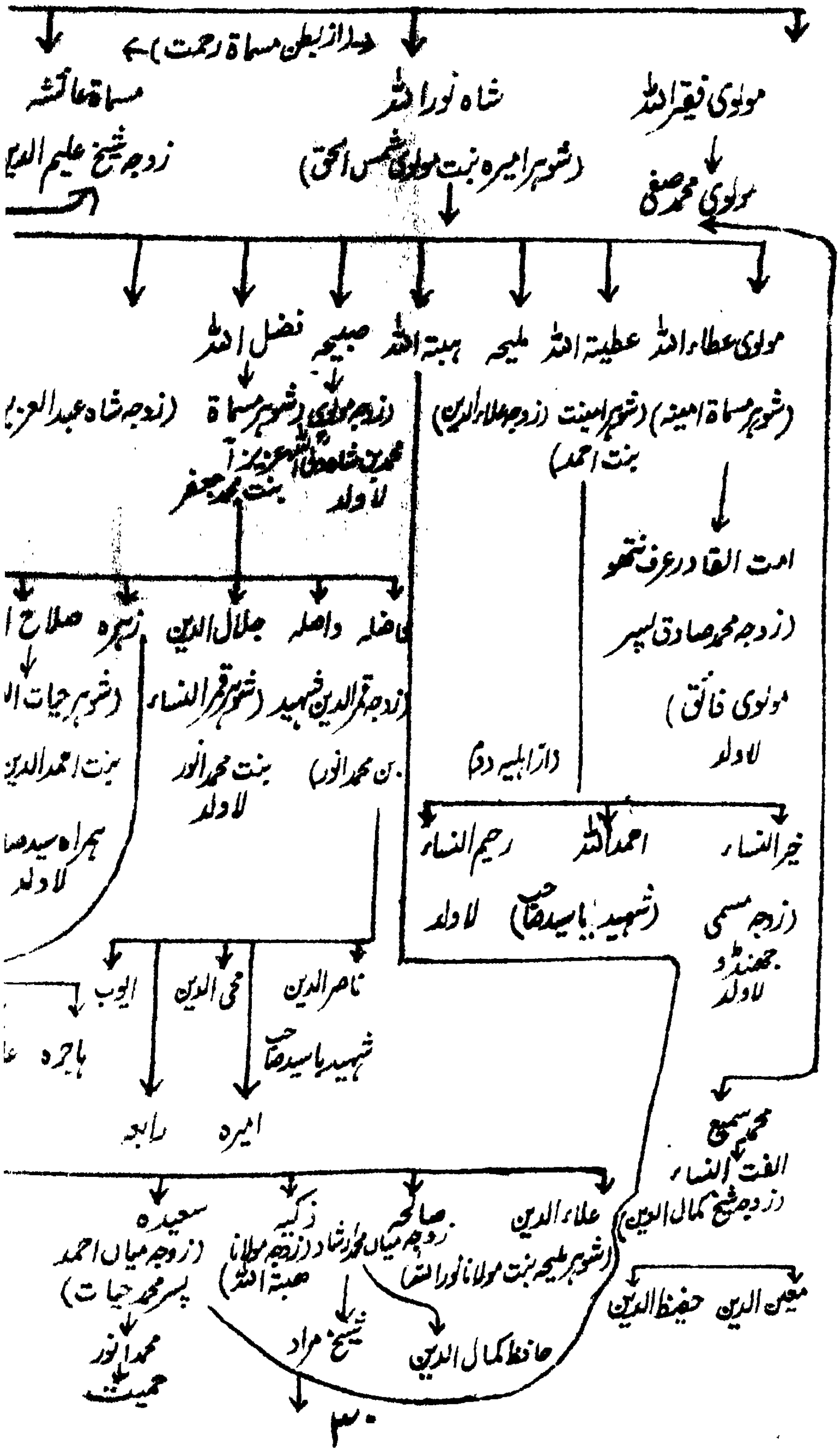
امت الرحیم
(زوجہ مولانا عبدالقیوم بڈھانوی)
مولوی محمد یوسف
حافظ ابراہیم
سائرہ

سکینہ (از بطن سعیدہ
حرم)


عبدالوہاب معروف بہ شاہ رفیع الدین
شاہ عبدالغنی
رقیہ
لاولد
(زوجہ محمد حسین
بن شاہ رفیع الدین)
شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ
شوہر
جمیلہ
بن مولوی مصطفیٰ
کلثوم
(زوجہ مولوی محمد موسیٰ
ابن شاہ رفیع الدین)
شاہ محمد عمر
مولانا محمد یحییٰ
(۴)
(شوہر فاطمہ بنت مولانا
شاہ عبدالحیٔ)
لاولد
از بطن زوجہ سوم مسماۃ کلو
محمد حسن
شوہر مسماۃ امت الرحمٰن
نقیبہ
تقیہ (لاولد)
عبدالرحمٰن
عبدالوہاب
بی بی صغیر
(نا کتخدا انتقال ہوا)
(جملہ از زوجہ اول بی بی عارفہ سونی پتی)
مولوی محمد عیسیٰ
(شوہر زینب النساء
بنت شاہ عبدالعزیز)
مولوی مخصوص اللہ
(شوہر مسماۃ امت العزیز)
مولوی محمد مصطفیٰ
(شوہر بی بی زینب
بنت شاہ عبدالقادر)
مولوی محمد موسیٰ
(شوہر کلثوم بنت
شاہ عبدالغنی)
محمد حسین
(شوہر مسماۃ رقیہ
ہمشیرہ شاہ محمد اسمٰعیل)
لاولد
امت اللہ
(زوجہ حافظ نجم الدین
سونی پت)
بی بی جمیلہ
(زوجہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل)
فاضلہ
امت الغفار
عبدالسلام
(زوجہ اطہر میاں ...
شاہ رفیع الدین
امت القادر
(زوجہ میاں ابوالقاسم)
محمودی
بی بی نعمت
(زوجہ میاں امداد حسین
انا ولاد شاہ ابو رضا محمد)
دختر
(زوجہ مولوی یوسف
ابا مولانا عبدالقیوم)

- سید نصیرالدین (دوسری شادی مسماۃ خدیجہ بنت شاہ محمد اسحاق سے کی)
  - عبداللہ
    - حبیب الرحمٰن
  - عبدالحکیم
- سید نفیس الدین
- شاکرہ زوجہ سید باقر علی
  - ابوالقاسم (شوہر مسماۃ امت القادر بنت مولوی مخصوص اللہ)
  - جعفر
  - علی تقی
  - علی نقی
  - سکینہ لاولد

مولوی معین الدین عرف شاہ اجمیری



- مولانا شاہ عبدالحیؒ
  - از زوجہ سوم واصلہ بنت فضل اللہ
    - عابدہ (زوجہ شیخ قیام الدین عرف اللہ دیا)
      - امۃ اللہ (زوجہ محمد سلیمان بن حافظ عثمان)
        - [illegible]
        - حافظ داؤد
        - امۃ القادر
    - عائشہ (؟)
    - مولانا عبدالقیوم
      - حافظ محمد یوسف
        - از زوجہ ثانیہ انجمن آرا بیگم از خاندان خانی دوراں
          - میمونہ
          - صبیحہ
          - محمد سلیمان
            - امۃ الرحمان (اے آر۔ خاتون)
              - زبیدہ خاتون
      - سائرہ
      - محمد سلیمان
    - فاطمہ (زوجہ شاہ محمد عمر) (لاولد)
- واجدہ

پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

ہاں تو بات چل رہی تھی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے بعد کافی یا چائے کے وقفہ کی، اس موقعہ پر صدر ضیاء الحق سے ملاقات سے پہلے اور اس کے بعد اتنے دوستوں اور چشم آشناؤں سے ملاقات ہوئی کہ نہ اُن سب کے نام محفوظ ہیں اور نہ اُن کے اتے پتے، البتہ چند خاص نام یہ ہیں :-

مولوی تنزیل الرحمٰن صاحب | مشہور ایڈوکیٹ ہیں اور غالباً کسی زمانہ میں ایڈوکیٹ جنرل بھی رہ چکے ہیں، اسلامی فقہ کی تدوین جدید پر پانچ ضخیم جلدوں میں ان کا کام ان کا عظیم کارنامہ ہے، برصغیر میں اس کی نظیر نہیں ملتی، آج کل عدالت شرعیہ کے چیرمین ہیں اور درحقیقت وہ اس کے مستحق تھے بھی، مگر اس کے باوجود علماء کے ایک طبقہ کو اعتراض ہے کہ باقاعدہ عالم نہیں ہیں، سوال یہ ہے کہ باقاعدہ عالم ہونے کا معیار کیا ہے۔؟ کیا صرف مصلیٰ نما وہ طویل و عریض سند جو کسی مدرسہ کے فارغ التحصیل کو ملتی ہے؟ اگر یہی ہے تو آپ ان ہزاروں اکابر علم وادب کے متعلق کیا فرمائیں گے جنھوں نے تعلیم پرائیویٹ افراد و اشخاص سے حاصل کی ہے اور کسی اصلاحی مدرسہ کی سند ان کے پاس نہیں ہے، کیا کوئی اہم علمی و تصنیفی کارنامہ مصنف کو "مستند و معتبر عالم" کہلانے کے لیے کافی نہیں ہے؟ موصوف سے میرا عزیزانہ اور مخلصانہ تعلق ۱۹۶۹ء سے ہے جبکہ میں پہلی مرتبہ پاکستان گیا تھا اور ان کی کتاب مجموعۂ قوانین اسلام (برہان میں اس کی متعدد جلدوں پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے)، کی پہلی جلد طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی، اسی زمانہ میں انھوں نے ایک ترجمہ

کہا تھا کہ جب وہ اسے لے کر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کتاب پیش کی تو حضرت مفتی صاحب نے یک گونہ انقباض کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: یہ کام تو کسی عالم کے کرنے کا تھا، آپ کے بس کا نہیں ہے اور آپ کو اس میں دخل بھی نہیں دینا چاہیے"۔ لیکن جب مفتی صاحب نے پوری کتاب از اول تا آخر پڑھ ڈالی تو ان کی رائے بدل گئی اور کتاب اور اس کے مصنف کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں وہ مولانا محمد یوسف بنوری رح سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں، خیر! اب اُن سے یہاں آمنا سامنا ہوا تو اگرچہ لوگوں میں گھرے ہوئے جلدی میں تھے، مجھ پر نظر پڑتے ہی حسب معمول کھلے منہ سے مسکراتے انداز سے "اخاہ" کہتے ہوئے آگے بڑھے، معانقہ و مصافحہ کیا، میں نے ان کو عدالت شرعیہ کے چیرمین ہونے پر مبارک باد دی، انھوں نے فرمایا: شرعی کونسل کے لیے جتنے ارکان میں نے مانگے تھے اور اس کے لیے اخراجات کا جو تخمینہ میں نے پیش کیا تھا وہ سب صدر ضیاء الحق نے منظور کر لیا ہے، مگر سخت افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں صحیح اور اہل آدمی کمیاب ہیں، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ پاکستان آجائیے اور شرعی کونسل کی رکنیت قبول کر لیجیے۔ اس کی حیثیت عرفی اور مشاہرہ وہی ہے جو ایک یونیورسٹی پروفیسر کا ہے۔ میاں اسلم میرے ساتھ تھے، پھر ان سے مخاطب ہوکر بولے: مولانا کو یہاں ضرور بلوا لیجیے، ہمیں ان کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ علما تو اور بھی ہیں، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ بصیرت بھی دی ہے، میں نے مولوی تنزیل الرحمٰن صاحب کی محبت اور ان کے حسن نظر کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔

حکیم محمد سعید: حکیم صاحب آج کل مرکزی وزیر صحت ہیں، لیکن درحقیقت ان کا مرتبہ و مقام اس سے بہت بلند ہے، حکیم صاحب اور ان کے خاندان سے کم و بیش چالیس برس سے عزیزانہ تعلق ہے، حکیم محمد سعید نے پاکستان میں اور ان کے بڑے بھائی حکیم حاجی عبدالحمید نے بھارت میں ایک غیر معمولی اور ناقابلِ ذکر حالت سے نہایت عظیم الشان ترقی کر کے اور شہرت دنیا بھری حاصل کر کے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔ ایک دورِ زوال و انحطاط

سے گذرنے کے بعد آج اگر صنعت میں، بلکہ اس سے باہر بھی طب یونانی ایلوپیتھک کے ساتھ چشمک زنی کر رہی ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے اسباب کے علاوہ اس میں ان دونوں بھائیوں کی غیر معمولی مخلصانہ جدوجہد اور محنت وریاضت کو بھی بڑا دخل ہے۔ ہمدرد کا شمار ملک کے خوشحال اور متمول ترین اداروں میں ہوتا ہے، لیکن یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہمدرد وقف ہے اور اس کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ عظیم الشان تعلیمی، فنی، اسلامی اور فلاح عام کے کاموں پر خرچ ہو رہا ہے، اور خود دونوں بھائیوں کی نہایت سادہ اور درویشانہ زندگی کا یہ عالم ہے کہ حیرت ہوتی ہے، نہ پان نہ سگریٹ نہ حقہ، نہ کلب نہ سینما، اور نہ کوئی اور کھیل تماشہ، کپڑے سادہ، کھانا صرف ایک وقت یعنی شب میں اور وہ بھی ہلکا پھلکا سا، صبح کو بہت معمولی سا ناشتہ اور پھر دن بھر کچھ نہیں[1] محنت اور جفاکشی کا یہ حال ہے کہ شب میں چند گھنٹے استراحت اور خواب کے علاوہ دن اور رات کا ایک منٹ خالی نہیں، ہر وقت مصروف! لوگ اسمگلنگ کرتے ہیں، ناجائز ذرائع آمدنی رکھتے ہیں، عرب ملکوں میں زرِ سیالی کا جو دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں شناوری کرتے ہیں اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں لیکن حکیم برادران نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اگر محنت، خلوص، دیانت، بیدار مغزی اور دل کی لگن کے ساتھ کوئی کام کیا جائے تو ایک آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا، مسلمان نوجوان جو عام طور

---

[1] ایک مرتبہ میں نے حکیم محمد سعید صاحب سے پوچھا: آپ دونوں بھائیوں کو یہ کم خوری اور ایک وقت کھانے کی عادت کب سے ہوئی ہے؟" بولے: ایک عرصہ کی بات ہے جب ہم نے کاروبار شروع کیا ہی تھا ہم کو صبح سویرے سے شام گئے تک مسلسل سخت محنت کرنی ہوتی تھی اور دوپہر کا کھانا کھانے سے چونکہ طبیعت بوجھل ہو جاتی تھی اس لیے ہم دونوں بھائیوں نے عہد کیا کہ بس ایک وقت یعنی رات کو کھانا کھائیں گے"۔ اب عادت ہو گئی ہے اس لیے ہم اسی پر قائم ہیں۔

ہے یقینی کامشکار ہیں اور ایک اعلیٰ ملازمت کو ہی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں ان کے لیے اس میں بہت کچھ عبرت پذیری و سبق آموزی کا سامان موجود ہے۔

دونوں بھائیوں کی علمی اور سماجی خدمات کی فہرست طویل ہے لیکن سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ فن طب جس کا نام ونشان مٹ چلا تھا اور جس پر ایک عام اعتراض یہ تھا کہ یہ اَن سائنٹفک طریقۂ علاج ہے، دونوں بھائیوں نے علمی اور عملی اعتبار سے اسے آج اس قابل بنادیا ہے کہ وہ ایلوپیتھک سے چشمک زنی کر رہی ہے اور پہلے جو فن برصغیر میں محدود تھا آج اس کا آوازہ امریکہ اور روس تک میں سنا جاتا ہے،

حکیم محمد سعید صاحب سے ملاقات کانفرنس کے افتتاح سے قبل ہی نیشنل اسمبلی ہال میں داخل ہوتے ہی ہوگئی تھی۔ حسب معمول بڑے تپاک اور جوش سے مسکراتے ہوئے ملے اور بغلگیر ہوگئے، پھر فرمایا: "آپ اپنا مقالہ پڑھیں گے تو کل، مگر میں اسے پڑھ کر مستفید ہوچکا ہوں" میں نے عرض کیا: شکریہ! مقالہ کیا، بس یوں کہیے کہ خانہ پری کی ہے، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اہلیہ کی علالت اور پھر وفات کے باعث اُن دنوں میں جس درد و کرب میں مبتلا تھا اس کے باعث جیسا میں چاہتا تھا ویسا نہیں لکھا جاسکا، جنوبی افریقہ سے واپسی پر ستمبر میں پھر اُن سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو فرمایا: برہان میں مولوی شہاب الدین صاحب ندوی کا مقالہ "تسخیر اشیا اور علم الٰہیہ" بڑا اچھا نکل رہا ہے، میں اس کا انگریزی ترجمہ چھاپنا چاہتا ہوں، میں نے کہا بڑے شوق سے، برہان آپ کا ہی پرچہ ہے، میں نے اس وقت تک اس مضمون کو پڑھا نہیں تھا۔ ایک طویل غیرملکی سفر سے واپس آکر اس مضمون کی سب قسطیں پڑھیں تو دیکھا کہ مضمون بڑا معرکۃ الآرا اور فکرانگیز ہے، چنانچہ بعض بلند پایہ فاضلان سائنس نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔

پروفیسر سعید الدین احمد ڈار پہلے وزارت خارجہ میں تھے، اب چند برس سے خیبر یونیورسٹی اسلام آباد میں "شعبۂ بین الاقوامی روابط" کے صدر اور پروفیسر ہیں، میاں اسلم کے بچپن کے ساتھی اور دوست اور ہم مزاج و ہم طبیعت ہیں، اس لیے ان کے ساتھ میرا تعلق عزیزانہ اور

قدیم ہے، اس تعلق کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس کی داستان بڑی دلچسپ ہے، آپ بھی سنیے! جب میں کلکتہ میں تھا تو ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۴۸ء میں) پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر نے جو بحیثیت پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے خط لکھا کہ ہماری یونیورسٹی کے تاریخ کے دو طالب علم تاریخی مقامات دیکھنے کی غرض سے کلکتہ جارہے ہیں، اگر آپ اپنے مدرسہ کے ہیٹ ہاسٹل میں ان کے قیام کا انتظام کردیں تو میں بڑا شکر گذار ہوں گا" میں نے فوراً جواب دیا: "میں ہر قسم کے انتظامات کردوں گا، آپ مطمئن رہیں اور بے خوف وخطر ان کو بھیج دیں" اس جواب کے چند روز بعد ایک دن میں دفتر میں تھا کہ دو نوجوان اندر داخل ہوئے، قبول صورت، خوش منظر وخوب شمائل۔ تندرست وتوانا۔ موزوں قد وقامت اور انگریزی لباس میں ملبوس۔ انھوں نے تعارف کرایا۔ تو معلوم ہوا کہ یہی وہ دو نوجوان ہیں جن کو لاہور سے آنا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام محمد اسلم تھا اور دوسرے سعید الدین احمد ڈار تھے، میں نے گرمجوشی سے ان کو خوش آمدید کرتے ہوئے کہا: میں نے آپ کے قیام کا انتظام ہوسٹل میں کردیا ہے، لیکن کھانا اور ناشتہ آپ میرے ساتھ کریں گے، انھوں نے شکریہ ادا کیا مگر کہا کہ ان کے قیام کا انتظام کسی اور جگہ ہو گیا ہے اور وہ اس سے مطمئن ہیں؛ اس پر میں نے ان کو طعام شب پر مدعو کیا۔

شب میں یہ کھانے پر آئے تو ڈنر سے پہلے، ڈنر پر اور اس کے بعد برابر گفتگو کرتے رہے، لیکن یہ گفتگو سرتاسر علمی تھی، اس درمیان میں انھوں نے مجھ سے جو سوالات کیے اور میں نے ان کے جوابات دیے وہ بھی بالکل علمی اور اسلامیات سے متعلق تھے، میں واقعی ان دونوں کے ذوق علمی وتحقیق اور اسلامیات سے اس درجہ ان کی دلچسپی سے بہت متاثر ہوا اور ان کے لیے دل سے بے ساختہ دعائیں نکلیں، اس گفتگو میں زیادہ حصہ میاں اسلم نے لیا تھا اور وہ غالباً برہان اور میری کتابوں کے ذریعہ مجھ سے پہلے سے نہ صرف واقف بلکہ متاثر بھی تھے، وطن لوٹنے کے بعد اگرچہ دو تین خط ڈار صاحب کے بھی آئے، لیکن میاں اسلم نے مستقل خط وکتابت شروع کردی، جو خط آتا تھا علمی ہوتا تھا ان کو مقالہ نگاری کا ذوق اس زمانہ میں تھا چنانچہ

خط کے ساتھ ہوتا کسی اخبار کا تراشہ ہوتا جس میں ان کا مقالہ ہوتا تھا۔ اس طرح تعلق بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا کہ گویا میں ان کے خاندان کا ایک فرد بن گیا اور اس لیے بعض گھریلو معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ([illegible]ء) میں انگلینڈ گئے ہیں تو اس میں ایک حد تک دخل میرا بھی ہے اور وہ اس طرح کہ جب انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے (تاریخ) کرلیا تو حسبِ زمانہ ہر باپ کی خواہش کے مطابق ان کے والد ماجد چودھری محمد طفیل صاحب مرحوم کو اصرار تھا کہ وہ پاکستان سول سروس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوں ——— اور اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے ——— لیکن اسلم کا ذوق فطری طور پر خالص علمی اور تحقیقی تھا، اس لیے سخت کشمکش میں تھے کہ کیا کریں، آخر انھوں نے مجھے خط لکھا اور مشورہ طلب کیا، میں نے جواب میں ایک طویل اور پر زور خط لکھا جس میں میں نے یہ ثابت کیا کہ یہ صرف نظر کا پھیر اور آنکھ کا دھوکا ہے، ورنہ درحقیقت اعلیٰ سرکاری عہدوں اور مناصب کی چمک دمک عارضی اور جلد معدوم ہو جانے والی ہے اور اس کے برعکس علم و تحقیق میں عمر صرف کرنے سے انسان کو بقائے دوام حاصل ہوتا ہے، اس کے بعد میں نے لکھا کہ ایک شخص ترقی اسی چیز میں کرسکتا ہے جس کی طرف اس کا میلان فطری اور حقیقی ہو، کسی شے کی مصنوعی چمک دمک سے مرعوب ہو کر غیر فطری طور پر اس کے پیچھے دوڑنے سے زندگی بنتی نہیں بگڑتی ہے" آسودگی نہیں ملتی اور پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں" خدا کی شان! اسلم نے یہ خط والد صاحب کو دکھا دیا، وہ اسے پڑھ کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا خیال بدل دیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔

انگلینڈ پہنچنے کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ برابر جاری رہا اور وہ برہان اور میری کتابوں کا مطالعہ اہتمام سے کرتے رہے، لیکن کلکتہ کی ملاقات کے دس برس بعد دوسری ملاقات ان سے لندن میں ہوئی اور وہ بھی عجیب ڈرامائی انداز میں، ہوا یہ کہ اپنا ٹرم پورا کرنے کے بعد جب مئی [illegible]ء میں کناڈا سے واپسی میں میں نے لندن میں ایک ہفتہ گزارنے

کا ارادہ کیا تو میاں اسلم کو اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو لندن پہنچوں گا، مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ قیام کہاں کروں گا، ایک عزیز کو لکھا ہے، وہ انتظام کریں گے، میں معینہ تاریخ پر لندن پہنچا اور ایک مکان میں مہمان ہو کر مقیم ہو گیا، دوسرے دن ناشتہ سے فارغ ہو کر برٹش میوزیم گیا۔ اس کا ایک حصہ (wing) خوب اچھی طرح دیکھتے دیکھتے جب تھک گیا تو سستانے کی غرض سے باہر ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا، ابھی بیٹھے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ اچانک اسلم آ گئے، بڑی خوشی ہوئی، میں نے پوچھا: مگر تمھیں خبر کیسے ہوئی کہ میں یہاں ہوں، بولے: مجھ کو آپ کے ذوق کا علم ہے، اس کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ لندن پہنچ کر آپ پہلا کام یہ کریں گے کہ برٹش میوزیم آئیں گے، چنانچہ الحمد للہ میرا قیاس صحیح نکلا، پھر انھوں نے بتایا کہ جب میں کیمبرج سے روانہ ہو رہا تھا تو ایک پروفیسر مل گئے، انھوں نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا: لندن" انھوں نے کہا: کیوں؟ میں نے جواب دیا: سعید احمد اکبر آبادی آئے ہوئے ہیں، ان سے ملنے،،

وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟

"مجھے معلوم نہیں"

آپ بھی خوب آدمی ہیں، لندن جیسے شہر میں آپ کو جائے قیام کا علم نہیں اور آپ جا رہے ہیں ملنے یہ ایک ہی رہی۔

مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ زمین دوز ریلوے (Sub way) کے ذریعہ میں فلاں جگہ پہنچوں گا اور اس کے بعد آدھے گھنٹہ کے اندر اندر اکبر آبادی کو پالوں گا۔

پروفیسر نے ایک حیرت آمیز قہقہہ لگایا اور کہا: اچھا! اگر آپ اس میں کامیاب ہو جائیں تو آ کر ذرا بتا مجھے بھی دیجیے،

یہ تعلق بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ میرے گھر کے چشم و چراغ بن گئے، کہا گیا ہے: الارواح جنود مجندۃ یعنی عالم ارواح میں جو روحیں ایک دوسرے کے قریب اور

مرتبط ہوتی ہیں وہ عالم اجسام میں بھی اسی طرح رہتی ہیں، میاں اسلم سے تعلق بڑھتا رہا تو اسی تناسب سے ڈار صاحب سے قربت میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ آج وہ بھی میرے لیے مثل اعزہ و اقرباء کے ہیں، اب چار برس کے بعد پھر ملے تو اسی تعلق خاطر کے جوش اور ولولہ کے ساتھ، مختلف مجلسوں میں ان سے بہت سی باتیں ہوئیں، ایک موقع پر انھوں نے زور دے کر کہا: اگر بھٹو گورنمنٹ کچھ دنوں اور رہ جاتی تو جہاں تک سرکاری دفتروں اور محکموں کا تعلق ہے اسلام اور اردو کا خاتمہ تو ہو ہی جاتا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہم جیسے لوگ قرآن و حدیث کا نام لیتے یا اردو بولتے تھے تو ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ آج اللہ کا شکر ہے وہ حالت ختم ہو گئی ہے، دفتروں میں نماز باجماعت ہوتی ہے اور لوگ بے تکلف اردو میں بات چیت کرتے ہیں، انھوں نے مزید کہا: اور باتوں کو سردست چھوڑ دیجیے، انھیں دو چیزوں کو لے لیجیے جو نظریۂ پاکستان کی بنیاد ہیں اس معاملہ میں صدر ضیاء الحق جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں، اور ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

محترمہ عطیہ اویس کم و بیش نصف صدی قبل عربی زبان و ادب کے نامور فاضل الاستاذ خلیل عرب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ میں پروفیسر تھے، ان سے جن لوگوں نے فیض اٹھایا وہ آسمان علم و ادب پر مہر و ماہ بن کے چمکے، مولانا سید ابوالحسن علی الندوی بھی ان کے شاگرد رہے ہیں، آں محترمہ ان کی صاحبزادی ہیں، اس لیے بعض لوگ انھیں عطیہ خلیل بھی کہتے ہیں، اویس احمد صاحب جو ان کے شوہر ہیں اعلیٰ سول آفیسر تھے، اب ریٹائرڈ ہیں اور ایک خاص طریقہ پر قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں، عطیہ آج کل کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں استاد ہیں، نہایت ذہین و طباع اور بے تکلف عربی تقریر و تحریر پر قدرت رکھتی ہیں، دسمبر [illegible] میں نئی دہلی میں گورنمنٹ آف انڈیا کی سرپرستی میں پندرھویں صدی ہجری تقریبات کے سلسلہ میں جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا عطیہ اس میں اپنے شوہر کے ساتھ پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئی تھیں، میری ان سے پہلی ملاقات

یہیں کانفرنس میں ہوئی۔ برہان اور میری کتابوں کے ذریعہ مجھ سے واقف پہلے سے تھے اس طرح ملیں کہ گویا برسوں کی دیرینہ ملاقات تھی۔ پھر جتنے دن کانفرنس رہی ان سے بار بار ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی، کبھی اردو میں اور کبھی عربی میں، شیریں گفتار ہونے کے ساتھ بذلہ سنج بھی ہیں، اب سوا دو ماہ کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات ان کے وطن میں ہوئی تو حسب معمول بڑے تپاک سے ملیں اور بولیں: بھئی دلّی کی کانفرنس میں آپ اپنا مقالہ سنا نہیں سکے تھے اور دلی کے قیام کے دنوں میں ہم مصروف بھی بہت رہے، پڑھنے کا موقع ملا ہی نہیں، مگر پاکستان واپس آکر میں نے ادارہ اولیس صاحب نے آپ کا مقالہ (یہ وہی مقالہ "اسلامی قانون عہد حاضر میں" ہے جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ماجد علی خان کے قلم سے پچھلے دنوں برہان میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے) پڑھا تو طبیعت بڑی خوش ہوئی، بڑا فکر انگیز مقالہ ہے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن ڈوئی | اصلاً گجراتی ہیں مگر ایک عرصہ سے نائیجیریا میں مقیم ہیں اور اب متوطن ہو گئے ہیں، آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں اور آج کل مرکز دراسات قوانین اسلامیہ، احمد بیلو یونیورسٹی آف زاریا (نائیجیریا) کے ڈائرکٹر ہیں، بڑے فاضل اور قابل ہونے کے ساتھ بڑے جذبہ کے مسلمان بھی ہیں، چند برس ہوئے ان کے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چند اسامیوں کا اعلان ہوا تھا اور ان کے لیے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے بعض اساتذہ شعبۂ قانون نے درخواستیں بھیج رکھی تھیں، عبدالرحمٰن صاحب ڈوئی ان حضرات سے انٹرویو لینے کی غرض سے علی گڈھ تشریف لائے اور وائس چانسلر خسرو صاحب سے درخواست کی کہ وہ انٹرویو کے لیے ایک انتخابی کمیٹی بنا دیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کمیٹی پر سعید احمد اکبرآبادی کا نام ضرور ہونا چاہیے۔" خسرو صاحب نے تعجب سے پوچھا: آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟ بولے: جس سال وہ کناڈا میں تھے میں بھی تھا اور وہاں میں نے ان کے متعدد لکچر سنے ہیں، غرض اس طرح میری اور ان کی پہلی ملاقات سلکشن کمیٹی کے جلسہ میں ہوئی اس کے بعد متعدد انٹرنیشنل کانفرنسوں میں ملتے رہے،

یہاں پھر ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے پیش آئے، اور فرمایا: آپ نے علیگڈھ میں ... اسلامی قانون میں مہارت عربی کی اچھی استعداد کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ بات ... کو لگ گئی اور اسے میں نے گرہ میں باندھ لیا ہے۔

... حضرات کے علاوہ بنگلہ دیش کے ڈاکٹر سید محمد امام الدین (ڈھاکہ یونیورسٹی) ... ڈاکٹر احتشام امام جو اصلاً بہار کے باشندہ تھے، لیکن برسوں سے سیلون میں مقیم ہیں اور ... شادی بیاہ کر کے وہیں کے شہری ہو گئے ہیں، ملے، دونوں ملے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے، لیکن امام الدین صاحب سنجیدہ اور کم گو بزرگ ہیں، البتہ احتشام امام صاحب بڑے دلچسپ اور خوش گفتار شخص ہیں، ہر موضوع پر خود اعتمادی اور معلومات کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

وشوابھارتی یونیورسٹی کے

فارسی، عربی اور اُردو مخطوطات

مولانا عبدالوہاب بدرستوی، سنٹرل لائبریری، وشوابھارتی یونیورسٹی، شانتی نیکیتن۔

(۲)

غزلیات ظہیر فاریابی | صفحات ۱۹۲، جن میں از ابتدار تا ۱۸۳ غزلیات، ۱۸۴ پر ایک رباعی، ۱۸۵ تا ۱۸۶ بیدل عظیم آبادی کی غزل کے تین بند اور آخر کے صفحات ۱۸۷ تا ۱۹۲ بیاض ہیں۔ کتاب خوشخط اور ہر صفحہ زرافشاں وسنہری لائنوں سے گھرا ہوا ہے، کاتب محب علی، سال کتابت مرقوم نہیں ہے۔

نسخہ بظاہر نہایت ہی دیدہ زیب اور صاف ہے لیکن اوراق اس قدر خستہ اور قدامت زدہ ہیں کہ اگر ذراسی بے احتیاطی سے ورق گردانی ہو تو جسام اوراق سلامت نہیں رہیں گے غنیمت یہ ہے کہ کتب خورجراثیم کے حملوں سے محفوظ ہیں۔ حیرت ہے کہ اس کے ساتھ ہی ہلالی استرابادی کی مثنوی شاہ وگدا بھی مجلّد ہے لیکن اس بیچاری پر ظالم کیڑوں نے نہایت بے باکی کے ساتھ اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

یہ غزلیات بترتیب حروف تہجی مرتب ہیں۔ حرف الیاء کے بعد ہی تین رباعیاں ہیں۔ غزلیات کا ہر بند "ولہ ایضاً" "ولہ غفر اللہ لہ" "ولہ طاب اللہ لہ" جیسے جملوں سے بطور عنوان شروع ہوتا ہے۔

قصائد ظہیر فاریابی | صفحات ۸۴، آخر ناقص، کتابت بخط شکستہ، کاتب اور تاریخ کتابت

دریدہ ہیں۔ یہ نسخہ جا بجا کرم خوردہ ہے۔ یہ قصائد سلطان قزل ارسلان، نصرۃ الدین ابوبکر بن محمد و طغان شاہ ثانی سے متعلق ہیں نیز سیف احمد اور صدر جہان شرف الملک تاج الدین کی مدح بھی شامل ہے۔ بین السطور مشکل الفاظ کے معانی آسان فارسی میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ قصائد حروف تہجی کی ترتیب سے بے نیاز ہیں۔

حقیقت میں ظہیر کی ذہنی یادگار صرف ایک دیوان ہے جس میں قصائد، غزلیات، رباعیات، مقطعات اور ترجیع بند بھی شامل ہیں جس کے متعلق حمد اللہ مستوفی قزوینی (متوفی ۷۵۰ھ / ۱۳۴۹ء) نے لکھا ہے کہ اس دیوان کو سنہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء میں شمس کاشی (متوفی ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء) نے جمع کیا[1] حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء) نے جامع دیوان کا پورا نام شمس الدین السجاسی تحریر کیا ہے[2] اور مسٹر ہرمن ایتھے (Hermann Ethe) کی تحریر کے مطابق یہ دیوان ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے طبع ہو چکا ہے[3] مذکورہ دیوان سے "قصائد" بھی الگ صورت میں ہندوستان سے طبع ہو چکے ہیں۔ جو یہاں نور لکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۲۶ء کا مطبوعہ بھی موجود ہے جس کے پیشِ نظر قلمی قصیدہ کا جب موازنہ کیا گیا تو کافی فرق نظر آیا۔ مصرعوں اور اشعار کی کمی و زیادتی، الفاظ کا اختلاف بھی بکثرت موجود ہے۔ اس فرق کے علاوہ مطبوعہ میں ہر قصیدہ کا الگ الگ مستقل عنوان ہے لیکن اس قلمی نسخہ میں صرف لفظ "قصیدہ" ہی کا عنوان از ابتدا تا آخر کتابت کیا گیا ہے۔

حیاتِ ظہیر:۔ ظہیر الدین ابوالفضل طاہر بن محمد فاریابی پورا نام، پیدائشی وطن قصبہ فاریاب۔ یہ مقام صوبہ بلخ کے شہر جوزجان کے قریب واقع تھا۔ دورِ شباب تک وطن ہی پر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر نیشاپور چلا آیا، یہاں ۶ سال تک رہا اور مزید مختلف علوم و فنون میں

---

[1] تاریخ گزیدہ جلد اول: ص ۸۲۱۔ [2] کشف الظنون جلد اول: ص ۵۱۵۔ [3] فارسی کٹلاگ انڈیا آفس لائبریری لندن، جلد اول: ص ۵۹۴۔

کافی دستگاہ پیدا کی۔ اس کے بعد ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں عراق گیا۔[۱] دولت شاہ سمرقندی (متوفی ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) نے بھی لکھا ہے کہ وہ ابتداءً فاریاب سے نیشاپور آیا۔[۲] ظہیر کے استاذ اپنے وقت کے مشہور شاعر اور صاحبِ علم و فضل رشیدی سمرقندی تھے جنھوں نے قصہ "مہر و وفا" منظوم تصنیف کیا تھا۔[۳]

ظہیر قصیدہ گوئی کا بڑا باکمال شاعر مانا جاتا ہے، بعض اہلِ علم اسے انوری (متوفی ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء) سے برتر قصیدہ گو مانتے ہیں۔ ملکۂ شعر و شاعری کے علاوہ نجوم و حکمت میں بھی بہت اچھی صلاحیت رکھتا تھا جس کی وجہ سے قوم نے صدرالحکماء کا خطاب عنایت کیا تھا۔ زبان عربی کی تعلیم حاصل کی تو اس میں بھی پوری دستگاہ پیدا کر لی جس کا نمونہ وہ اشعار ہیں جو دیوان میں جابجا موجود ہیں۔ حمداللہ مستوفی قزوینی نے عربی کے دو اشعار نقل کیے ہیں جن میں فارسی کے حرف دال اور ذال کے فرق کی وضاحت کی ہے:

"اعرف الفرق بین دالٍ و ذالٍ ... وھی اصلٌ بالفارسیۃ معظم
کل ما قبلہ سکونٌ بلا واوٍ ... فذال و ماسواہ فمُعجم۔"[۴]

خود ظہیر کے جو قصائد ہیں ان میں بھی عربی اشعار پائے جاتے ہیں لیکن افسوس کہ جن علوم نجوم و حکمت پر اسے صدرالحکماء کا خطاب ملا تھا اس پر کوئی تصنیف معلوم نہیں ہوتی۔

دولت شاہ سمرقندی لکھتے ہیں کہ ظہیر جب نیشاپور سے بغرض سیاحت اصفہان گیا تو اُن دنوں یہاں صدرالدین عبداللطیف خجندی قاضی القضاۃ تھے جن کے علم و فضل کی شہرت سن کر حصولِ شرف زیارت کے لیے قاضی موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ علماء و فضلاء کا ایک اژدحام قاضی محترم کے اردگرد لگا ہوا ہے تو وہ بھی سلام کر کے

---

[۱] دائرۃ المعارف ایران، چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۰ء: ص ۵۴۴۔ [۲] تذکرۃ الشعراء: ص ۱۱۰۔
[۳] ایضاً۔ [۴] تاریخ گزیدہ جلد اول: ص ۸۲۲۔

مسکین صورت ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ پھر متعدد بار قبلہ قاضی کی توجہ اپنی جانب منعطف کرانے کی تدبیریں کیں لیکن حضرت نے جب باریابی نہ دی تو مایوس اور بدظن ہو کر برجستہ ایک قطعہ لکھا اور قاضی موصوف کے ہاتھ میں تھما کر واپس لوٹ گیا۔ قطعہ :

"بزرگوارا دنیا ندارد آں عظمت — کہ ہیچ کس را زیبد بداں سرفرازی
شرف بفضل و ہنر باشد و ترا ہمہ ہست — بدیں نعیم مزوّر چرا ہمی نازی
ز چیست کاہل ہنر را نمی کنی تمیز — تو نیز ہم بہنر در زمانہ ممتازی
بمن نگہ تو ببازی مکن ازآنکہ بفضل — دلم بگیسوی حوران نمی کند بازی
اگر چہ نیست خوشت یک سخن زمن بشنو — چنانکہ آں را دستور حال خود سازی
تو ایں سپر کہ ز دنیا کشیدۂ در رُو — بروز عرض مظالم چناں بیندازی
کہ از جواب سلامی کہ خلق را بر تست — بہیچ مظلمۂ دیگری نپردازی[1]"

ظہیر کے واپس ہوتے وقت قاضی صاحب نے توجہ فرمائی اور اسے منانے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے اپنی خودداریِ طبع کی بنا پر اصفہان میں مزید قیام گوارا نہ کیا۔ وہاں سے آذربائیجان[2] چلا گیا۔

ابتداءً ظہیر جب فاریاب سے نیشاپور آیا تھا تو اس عرصے میں وہاں کا حاکم طغان شاہ ثانی (عہدِ حکومت ۵۶۹-۵۸۱ھ / ۱۱۷۳-۱۱۸۵ء) تھا جس نے اس شاعر کی قدر افزائی کی۔ ایک بار طغان شاہ فیروزہ کی کان دیکھنے گیا، ساتھ میں ظہیر بھی تھا۔ شاہ نے ایک قصیدہ کی فرمائش کی، ظہیر نے حسبِ حال دہیں ایک قافیہ گوہر ایک طویل قصیدہ فی البدیہہ کہہ ڈالا۔ جس کے دو۲ اشعار دولت شاہ نے نقل کیے ہیں :-

"ز آنکہ لعل شکر بار و در میاں گوہر — میان لعل چرا کردۂ نہاں گوہر
بخندہ چوں لب یاقوت رنگ بکشائی — ز شرم زرد شود ہمچوں زعفران گوہر[3]"

---

[1] تذکرۃ الشعراء: ص ۱۱۲۔ [2] یہ علاقہ اب سوویت روس کے قبضہ میں ہے۔

[3] تذکرۃ الشعراء: ص ۱۱۱۔

لیکن اس بادشاہ سے بعد میں بدظن ہوکر نیشاپور سے اصفہان چلا گیا تھا جہاں قاضی القضاۃ خجندی کی ذات نے بھی ظہیر نے مدح کیا جس کا ذکر پچھلے صفحہ پر گذر چکا ہے۔ غرضیکہ اصفہان سے آذربائیجان گیا جہاں اتابک مظفر الدین محمد بن ایلدگز (عہد حکومت ۵۶۸-۸۲ھ / ۱۱۷۲-۸۶ء) فرماں روائی کر رہا تھا۔ یہاں ظہیر دس سال تک رہا۔ بالآخر اس حاکم سے بھی اس کی نہ نبھ سکی چنانچہ ایک شکایت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔

"شاید کہ بعد خدمتِ دہ سال در عراق   نانم ہنوز خسرو ما زندراں دہد"[1]

محمد بن ایلدگز کی وفات کے بعد جب اس کا بھائی قزل ارسلان (عہد حکومت ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء تا ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) عراق اور آذربائیجان کا حاکم ہوا تو ان ایام میں قزل ارسلان کا برادرزادہ (محمد بن ایلدگز مرحوم کا لڑکا) ابوبکر چاہتا تھا کہ ظہیر اس کا مقرب اور مخصوص شاعر بن جائے۔ ادھر ظہیر قزل ارسلان کی دربارداری سے تنگ آچکا تھا اور ابوبکر کی جانب مائل تھا، بس صرف ایک اشارہ کا منتظر تھا۔ چنانچہ جب ابوبکر کی جانب سے ہمت افزائی ہوئی تو قزل ارسلان کے دربار سے نکل کر ابوبکر کے زیرِ سایہ آگیا۔ ظہیر کے اس عمل سے قزل ارسلان کے آبگینۂ دل کو سخت ٹھیس لگی جس کا عوض اس نے ایک دوسرے شاعر مجیر الدین بیلقانی (متوفی ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء) کو اپنا مقرب خاص بنا کر دینا چاہا۔ وہ اس طرح کہ شاعر بیلقانی کو ایسے ایسے انعامات وعطیات سے نوازتا رہا کہ جنھیں ظہیر دیکھ دیکھ کر آتشِ حسد میں تڑپتا رہے۔ دولت شاہ لکھتے ہیں:

- "ہر ہفتہ اورا جامۂ کمخواب و اطلس بخشیدی و مجیر آں را بتفاخر پوشیدی و فضلاء آں رعونت را پسندیدہ نداشتندے"[2]

اس قدر افزائی پر ظہیر براہ راست قزل ارسلان کو تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن مجیر بیلقانی کے بارے میں جو کچھ دیا وہ بالواسطہ قزل ارسلان کی عنایتوں پر زبردست چوٹ تھی۔

---

[1] تذکرۃ الشعراء ص ۱۱۳۔ [2] ایضاً: ص ۱۱۰۔

گر دہیاری خاطر آدمی گردد کسے — پس در اطلس چیست گرگ و در عبائی سوسمار[۱]

ظہیر کا آخری حکمراں ممدوح اتابک محمد تھا جو اپنے چچا قزل ارسلان کے مقتول (۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء) ہونے کے بعد تبریز پر فرماں روائی کر رہا تھا۔ اسی کے زمانے میں ظہیر نے سلاطین، امراء اور وزراء کی دربارداری سے بے نیاز ہو کر علمی مشغلہ اختیار کر لیا اور اسی شغل کے ساتھ ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء میں بمقام تبریز انتقال کیا۔

سالِ وفات میں اختلاف ہے: حاجی خلیفہ نے ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء[۲] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم (متوفی ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) نے بروایت دولت شاہ ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء و بحوالہ ہفت اقلیم مصنفہ امین احمد رازی (متوفی ۱۲ ویں صدی ہجری) ۵۹۲ھ/۱۱۹۵ء[۳] - اور مولانا شبلی نعمانی مرحوم (متوفی ۱۹۱۴ء) نے ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء و دولت شاہ کے حوالہ سے ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء[۴] تحریر کیے ہیں۔ لیکن یہ مذکورہ تاریخیں چند وجوہات کی بنا پر محلِ نظر ہیں۔

حاجی خلیفہ مرحوم (متوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء) کی کتاب "کشف الظنون" کا جو پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء پیش نظر ہے اس میں کئی جگہ خامیاں نظر آتی ہیں۔ خلیفہ مرحوم کی اہم تحقیقی تصنیف کے بارے میں کسی اعتراض یا شبہہ کی اپنے اندر نہ ہمت ہے اور نہ اہلیت لیکن کتابت و طباعت کی خامیوں کو نشانہ ضرور بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جامی کی وفات کا سال کہیں ۴۹۸ھ، کہیں ۸۹۸ھ اور کسی جگہ ۶۹۸ھ درج ہے۔ اور نظامی گنجوی کا سال وفات ۵۹۹ھ، ۵۷۶ھ اور ۵۹۷ھ طبع ہو گیا ہے۔ آزاد بلگرامی مرحوم اور مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے معلوم نہیں دولت شاہ کے "تذکرۃ الشعراء" کے کس نسخۂ رقمی یا مطبوعہ ایڈیشن سے مذکورہ سال لکھا ہے۔ حالانکہ اسی تذکرۃ الشعراء کا وہ ایڈیشن جسے پروفیسر براؤن (متوفی ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء) نے

---

۱ تذکرۃ الشعراء ص ۱۱۰ - ۲ کشف الظنون جلد اول: ص ۵۱۵ - ۳ خزانۂ عامرہ: ص ۲۴۷ - ۴ شعر العجم جلد پنجم: ص ۳-

مرتب کیا ہے[۱] اور ایک جدید ایرانی ایڈیشن جسے محمد رمضانی نے ترتیب دیا ہے[۲]۔ یہ دونوں ہی ایڈیشن سامنے ہیں۔ ان میں ۵۹۸ھ ہی لکھا ہے۔ رہ گئی مصنف "ہفت اقلیم" کی رائے، افسوس ہے کہ یہ کتاب یہاں موجود نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ عرض کیا جا سکے۔

سالِ وفات ۵۹۸ھ ۱۲۰۱-۲ء کی حمایت میں ذیل کے شواہد ہیں :

حمد اللہ مستوفی قزوینی (تاریخ گزیدہ)، رضا قلی خاں ہدایت (مجمع الفصحاء)، پروفیسر ذبیح اللہ ایرانی[۳] ڈاکٹر رضا زادہ شفق (تاریخ ادبیات ایران)، دائرۃ المعارف ایران، ہرمن ایتھے، چارلس ریو، ڈبلو۔ اوانو، مسٹر طامس ولیم بیل (مفتاح التواریخ) اور ان کے علاوہ متعدد اہم مصنفین۔ خود ظہیر کے حالاتِ زندگی اور مختلف حکمرانوں کے ساتھ وابستگی کی جو مدتیں مختلف حوالہ جات سے پیش کی گئی ہیں انھیں سے صاحبِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ ظہیر کی پوری حیات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فطرتاً وہ نازک مزاج تھا۔ کوئی بھی ایسا سلوک یا برتاؤ جو اس کی افتادِ طبع کو ٹھیس پہنچائے، ناقابلِ برداشت تھا جس کا جواب وہ کسی نہ کسی صورت میں دیے بغیر بخشتا نہیں تھا۔ چاہے کسی امیر، وزیر اور حکمران سے متعلق ہو یا کسی قاضی، عالم اور شاعر سے واسطہ ہو۔ دورِ حاضر کے کچھ ایرانی اہلِ قلم اسے مغرور اور متکبر کہتے ہیں :

"ہیچیک از معاصران خود را بچیزی نمی گرفت و خود را برتر از ہر کس می دانست"[۴]

---

۱ مطبوعہ لوزک اینڈ کمپنی، لندن ۱۹۱۰ء ۲ چاپخانہ خاور، تہران ۱۳۳۸ شمسی۔

۳ موصوف کی تصنیف کا نام "مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر فارسی" جس کا اردو ترجمہ بنام "فارسی ادب کے ارتقاء کی مختصر تاریخ" محترمہ عندلیب زہرا کاظمی پوری نے کیا ہے۔

۴ دائرۃ المعارف ایران : ص ۹۳۔

مجمع الفرس | مؤلفہ محمد قاسم سُروری بن حاجی محمد کاشانی، صفحات ۷۸۲، سائز کلاں، کتابت نستعلیق، کاتب اور سنِ کتابت مذکور نہیں۔ صفحہ اول کے اوپری گوشے پر ایک تحریر انگریزی میں تین[۳] سطری ہے جس کا پڑھنا در دسری اور چشم سوزی ہے۔ خود پڑھنے کی کوشش کی، دیگر انگریزی داں احباب سے مدد لی پھر بھی عقدۂ تحریر پورا حل نہ ہو سکا۔ صرف ذیل کے چند الفاظ معلوم ہوتے ہیں:

"پہلی سطر: (سُروری) ....Sururi

دوسری سطر: (ہیری این۔ ڈاؤٹ) Harry N. Dautt

تیسری سطر: (۲۷ مئی ۱۷۹۴ء) 27th May 1794 ....."

دوسری سطر میں کسی یورپین کا نام معلوم ہوتا ہے جس کی ملکیت میں غالباً یہ نسخہ رہا ہوگا اور تیسری سطر وہ سال ہے جب کہ نسخہ ہذا موصوف کی ملکیت میں تھا۔ مذکورہ سال سے کم از کم یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ تقریباً دو سو[۳] سال قبل اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے۔

یہ کتاب "لغات سُروری" یا "فرہنگ سُروری" کے نام سے بھی متعارف ہے جسے شاہ عباس اول شہنشاہ ایران (عہد ۹۹۶ھ / ۱۵۸۷ء تا ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۸ء) کے زمانے میں بسال ۱۰۰۸ھ / ۱۶۰۰-۱۵۹۹ء مصنف موصوف نے اپنے دورانِ قیام اصفہان کے دوران قیام ترتیب دی اور شاہ موصوف ہی کے نام سے معنون بھی کی۔ تکمیلِ تالیف کے سلسلے میں سُروری نے حسب ذیل سولہ[۱۶] کتب سے استفادہ کیا جس کی فہرست اپنے مقدمہ میں درج کی ہے:

۱۔ شرف نامہ احمد منیری (متوفی ۷۸۲ھ / ۸۱-۱۳۸۰ء) مرتب ابراہیم قوام فاروقی (سالِ تصنیف ۸۷۸ھ / ۷۴-۱۴۷۳ء)

۲۔ معیار جمالی۔ مصنفہ شمس فخری (شمس الدین محمد فخری اصفہانی) (سالِ تصنیف ۷۴۵ھ / ۱۳۴۴ء)

۳۔ تحفۃ الاحباب مصنفہ حافظ اوبہی

۴۔ نسخہ حسینی وفائی (فرہنگ وفائی) (سالِ تصنیف ۹۳۳ھ / ۲۷-۱۵۲۶ء)

۵۔ رسالہ الاستشہاد علی الاصطلاحات الطوسی (سالِ تصنیف ۹۶۵ھ / ۱۰۵۸ء اور ۹۷۶ھ / ۱۰۶۸ء کے درمیان)

۶۔ نسخۂ مرزا ابراہیم بن مرزا شاہ حسین اصفہانی۔

۷۔ رسالۂ محمود ہندو شاہ

۸۔ مؤید الفضلاء محمد لاد (محمد لاد) (سال تصنیف ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء)

۹۔ شرح سامی فی الاسامی (ابو الفضل میدانی) (سال تصنیف ۱۱۰۴ء)

۱۰۔ رسالہ ابو حفص سغدی (مصنف گیارھویں صدی ہجری (۱۷ ویں صدی عیسوی) کے ہیں)

۱۱۔ اداۃ الفضلاء قاضی خان بدر محمد دہلوی (سال تصنیف ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء)

۱۲۔ جامع اللغات منظوم نیازی حجازی

۱۳۔ نسخہ.......... (نقلوں والے الفاظ صاف نہیں ہیں)

۱۴۔ ترجمۂ صیدنہ ابو ریحان بیرونی

۱۵۔ نسخہ لطف الدین یوسف حلمی

۱۶۔ لسان الشعراء

مذکورہ بالا فہرست کتب کے ساتھ قوسین میں جو مصنفین کے نام اور سالِ تصنیف درج ہیں وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد چہارم، نیو ایڈیشن صفحات ۵۲۵ تا ۵۲۶ سے ذکر کیے گئے ہیں۔

سروری نے خود ہی اس لغت کی تلخیص بنام "خلاصۃ المجمع" ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء میں مرتب کی تھی[۱] اس کے بعد ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۸ء میں فرہنگ جہانگیری[۲] کی بنیاد پر اور شامل اللغۃ اور تحفۃ السعادت[۳] کی مدد سے

---

[۱] لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۱۲۲، حرف س: ص ۳ و ۴۔ [۲] اس لغت کے مصنف جمال الدین حسین انجو ہیں جو شیراز کے ایک سیّد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عہدِ اکبری میں ہندوستان آئے اور اکبر کے دربار میں اعلیٰ منصب سے سرفراز کیے گئے۔ اکبر ہی کے عہد میں مصنف نے اپنی اس لغت کی تالیف شروع کی تھی لیکن تکمیل سے قبل ہی جب اکبر کی وفات ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء میں ہوگئی اور جہانگیر تخت شاہی پر متمکن ہوا تو ۱۰۱۷ھ / ۱۶۰۸ء میں مکمل کر کے جہانگیر کے نام سے موسوم کر دی۔ (بقیہ صفحہ ۵۱ پر حاشیہ ۳ و ۴ میں)

دیباچہ بصورت سابق کامل ترتیب دی۔ اسی بنا پر لغت ہذا کے دو دیباچے ہیں:

دیباچۂ اول کی ابتدا: " ابتدائے کلام ہر دانشمند سخنور و افتتاح سخن ہر خردمند ہنر پرور" الخ

" دوم " " : " بر ضمیر اکسیر تاثیر مطالعہ کنندگان کہ چشمۂ حیات طبع شان" الخ

ایچ۔ بلاکمن[1] (H. Blochmann) لغت ہذا کا دوبارہ ترتیب سال ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء لکھتے ہیں[2] جو کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دیباچہ ثانی میں صراحۃً ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء مذکور ہے۔ چنانچہ چارلس ریو (Charles Rieu) نے ایچ۔ بلاکمن کی تردید کی ہے[3]۔ نیز ہرمن ایتھے (Hermann Ethe) نے بھی ترتیب ثانی کا سال ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء ہی لکھا ہے[4]

مصنف موصوف کی اِس لغت پر ملّا عبدالرشید ٹھٹھوی[5] نے زبردست تنقید کی ہے جس کی پوری تفصیل ایچ۔ بلاکمن نے دی ہے۔ اس سلسلے میں "فرہنگ رشیدی" کے دیباچے سے ایچ بلاکمن نے جو عبارات نقل کی ہے اس کا کچھ حصہ یہاں نمونۃً دیا جا رہا ہے:

(بقیہ حاشیہ ص۵۰ و حاشیہ نمبر ۳ و ۴) پھر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں مصنف موصوف نے آگرہ میں وفات پائی۔

[3] مصنف قرۃ احصاری (القرآحصاری) [4] مؤلف محمود بن شیخ ضیاء الدین محمد۔

[1] یہ مسٹر کلکتہ مدرسہ (مدرسہ عالیہ) میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی تھے۔ [2] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد ۳۷، حصہ ۱، ۱۹۶۸ء: ص ۱۲ و ۱۶۔ [3] کیٹلاگ فارسی برٹش میوزیم، لندن، جلد دوم: ص ۴۹۹۔ [4] کیٹلاگ فارسی انڈیا آفس لائبریری، لندن، جلد ۱: ص ۱۳۴۲۔ [5] موصوف مقام ٹھٹھہ (سندھ) کے رہنے والے تھے جن کی یادگار دو لغات ہیں۔ ایک عربی لغت موسوم بہ "منتخب"، (بسال ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) اور ایک فارسی لغت بنام "فرہنگ رشیدی" (بسال ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء)۔ یہ آخری لغت بہت مشہور اور مستند مانی جاتی ہے۔ موصوف شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھے۔ وفات ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸-۵۹ء میں ہوئی۔

"چون فرہنگ جہانگیری و سروری مطالعہ افتاد، جامع ترین فرہنگہا دیدہ اما مشتمل بود برامری چند کہ احتراز و اجتناب ازاں لازم و متحتم گردید اول آنکہ مؤلفان آن دو فرہنگہا در حل لغات اطناب کردہ اند بایراد عبارت مکررہ بیحاصل و اشعار متکثرۂ لاطائل، دوم تصحیح لفظ و توضیح اعراب و تنقیح معانی چنانکہ باید نکردہ اند، سوم آنکہ بعضی لغات عربی درمیان لغات فرس درج کردہ اند و تنبیہ نہ نمودہ اند کہ فرس نیست و چہارم آنکہ بعضی لغات بتصحیفات خواندہ و لغات متعددہ پنداشتہ چندجا ذکر کردہ اند[۱] الخ

"مجمع الفرس"، ترکی، عربی اور فارسی لغت پر مشتمل ہے جو پہلی بار ۱۸۴۴ء میں تبریز سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اور قلمی صورت میں خدا بخش لائبریری پٹنہ اور ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ میں بھی موجود ہے۔

سروری کا اصل وطن اصفہان تھا۔ بعہد شاہجہاں ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۲ء میں ہندوستان آئے اور ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء میں لاہور آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ پھر یہاں سے بقصد حج خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستے ہی میں پروانۂ مرگ آگیا۔ مخصوص مقام و سالِ وفات کی صراحت نہیں مل سکی۔

---

[۱] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد ۳، حصہ اول، ۱۸۶۸ء

مولانا عرشی

ادب میں حق و صداقت کی قابلِ رشک مثال

پروفیسر ڈاکٹر آمنہ خاتون

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم رضا لائبریری رامپور[۱] نے سید احد علی یکتا لکھنوی کی دستور الفصاحت کو اپنے مقدمے اور حاشئے کے ساتھ ۱۹۴۳ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ کتاب خود مولانا عرشی سے ۱۹۴۶ء کے اوائل میں منگوائی تھی یہی پہلا خط تھا جو میں نے مولانا کو لکھا تھا انھوں نے کتاب بھیجی اور ساتھ ہی خط لکھا کہ میں کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجوں میں نے جو رائے لکھ کر بھیجی تھی اس کو مولانا ہی نے رسالہ برہان دہلی بابت اپریل ۱۹۴۷ء میں "دستور الفصاحت اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک نظر" کے عنوان سے شائع کرایا پھر یہ تبصرہ میرے مجموعہ مضامین تحقیقی نوادر ۱۹۴۹ء میں شامل ہوا، مولانا عرشی اپنے خط مؤرخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"آپ نے جس محنت اور دیدہ ریزی سے اس تبصرے کو لکھا ہے اس کی قدر و قیمت اور کوئی جانے یا نہ جانے میں خوب جانتا پہچانتا ہوں آخر میرا کام ہی دن رات یہ ہے۔

مضمون رکھا کیوں رہا حالانکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اسے پاتے ہی رسالہ برہان

---

[۱] افسوس ہے کہ ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء کو بعمر ۷۶ سال مولانا کا رام پور میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ الخ۔

دیں گو کہ بھیج دوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے تبصرہ کرتے وقت مجھے مخاطب بنایا اور اس تعلق کی بنا پر جو ہم قومی اور ہم ذوقی نے میرے اور آپ کے درمیان پیدا کر دیا ہے کچھ ایسی کھری کھری بھی سنا دیں جو عالم آشکارا ہونے کے قابل نہ تھیں۔ آپ خوامخواہ سوچیں گی اور کہیں گی کہ دیکھا نا، یہی بات برداشت نہ ہو سکی۔ اور میں نے جو ایک ایک کر کے میاں کی غلطیاں نکال دیں تو لگے کونے جھانکنے اور باتیں بنانے، حاشا وکلا کہ یہ بات ہو۔ میں تو اپنی کوتاہیاں اجاگر ہونے سے خوش ہوتا ہوں، چنانچہ مضمون آج بھیج رہا ہوں اور انشاء اللہ وہ سب باتیں خود بھی پڑھوں گا اور دوسروں کے پڑھنے کا باعث بھی بنوں گا۔ اصل میں آپ نے اس میں میری بعض ایسی کوتاہیاں پکڑ لی ہیں جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھیں۔ یا حالات سے مجبور ہو کر ان کا مرتکب ہوا ہوں، آپ کے انھیں لکھنے سے یہ احتمال بلکہ کسی حد تک یقین ہے کہ جن اصحاب سے ان کا تعلق ہے وہ میری جانب سے سوءظن پیدا کر لیں گے اور چونکہ ان سے خردانہ تعلق رکھتا ہوں اس لیے مجھے کسی طرح گوارا نہ ہوتا تھا کہ خدانخواستہ یہ صورت حال پیدا ہو جائے۔

میری مراد ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور نواب صدر یار جنگ کی گرامی ذاتوں سے ہے، پہلے میں نے سوچا کہ ان حصّوں کو قلم زد کر دوں مگر یہ بد دیانتی تھی، خیال آیا کہ آپ کو لکھ کر اجازت حاصل کر لوں۔ اتفاق دیکھیے کہ اس عرصے میں تقریباً ایک ہفتہ یا اس سے کچھ زیادہ ایک انگریزی مضمون کی تیاری میں لگ گیا۔ اب جو یاد آیا تو دیر ہو چکی تھی۔

آخر میں یہ طے کیا کہ مضمون جوں کا توں اشاعت کے لیے روانہ کر دوں، سوچا کہ اگر آپ کے سوا کوئی اور یہ باتیں لکھتا تو مجھے اشاعت کے بعد خبر ہوتی تو میں اس وقت کس طرح اسے روک سکتا تھا۔[1]

---

[1] حالی نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے "لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں" (ص ۔۔۔ پر)

پھر مکتوب گرامی مورخہ ۲؍فروری ۱۹۴۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے آپ کا تبصرہ برہان دہلی کو بھیج دیا تھا۔ ۲۴؍جنوری کو اس کی رسید بھی آگئی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے مدیر برہان نے آپ کے متعلق جو لکھا ہے اس کے جستہ جستہ فقرے سنانے کو جی چاہا۔ اچھا اب ان کی سنیئے:

مقالہ دیکھ کر بڑی مسرت اس احساس سے ہوئی کہ ہمارے ملک میں اور خصوصاً خواتین میں افسانہ نگار اور ادب لطیف پر خامہ فرسائی کرنے والی ہی نہیں بلکہ ایسی بھی ہیں جو ایک مشہور ادبی کارنامے پر سنجیدہ اور متین تنقید بھی کر سکتی ہیں۔ کثر اللہ امثالہا"

مولانا عرشی نے ان خطوں میں حق بینی اور حق شناسی اور حق گوئی کا جو معیار اپنے قول اور فعل سے پیش کیا ہے فی زمانہ دنیائے اردو میں عدیم النظیر ہے۔ چنانچہ بعض دوسرے ادیبوں کے تاثرات میرے تبصروں کے بارے میں جو میں نے ان کی تحریروں پر لکھے اور ان کو بھیجے تھے مولانا عرشی کے تاثرات سے بالکل مختلف تھے۔ انھوں نے جواباً یہ تو نہیں لکھا کہ میرے تبصرے غلط ہیں لیکن دنیائے اردو کو ان سے فائدہ بھی اٹھانے نہ دیا۔

انشاء اللہ خاں انشا کی معرکتہ الآرا اور بے مثال تصنیف دریائے لطافت ہے اور انجمن ترقی اردو دہلی کے ذمے دار ادارے نے برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے مشہور و معروف ادیب سے اس کا ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا میں نے انشاء کے متعلق اپنا مطالعہ اسی ترجمے سے شروع کیا لیکن جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا گیا انشاء کی لسانی قابلیت اور قواعد دانی اور

(بقیہ حاشیہ ص۳۴)

دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب ان کے دوست کیوں نہ جتائیں گے بے خطر

اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور

جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پر

اصابت رائے پر میرے شبہات بڑھتے گئے اور مولوی عبدالحق مرحوم کی اس عبارت سے یہ شبہات اور قوی ہو گئے:۔

"پہلی بار میں نے زبان وہی رکھی تھی جو انشا کی تھی، طبع ثانی میں اس خیال سے کہ فہم مطالب میں حارج ہوتی ہو فارسی سے اردو کر دی"

میں نے خیال کیا تھا کہ فہم مطالب میں شروح و حواشی کے ذریعے آسانیاں بہم پہنچانے کے بعد بھی اگر دریائے لطافت کے سمجھنے میں یہ یہ دشواریاں ہیں تو انجمن کے مطبوعہ فارسی نسخے کا کیا حال ہوگا؟ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اردو ترجمے کا اصل فارسی سے مقابلہ کیا۔ دریائے لطافت کے افہام و تفہیم میں اس ترجمے سے صدہا مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں اور اگر انجمن ترقی اردو کا مطبوعہ فارسی نسخہ ناپید ہو جائے تو یقیناً انشار کی تحقیقات مسخ ہو جائیں گی۔ لیکن اس میں بھی دو ایک مقام مبہم ہیں اور کتابت کی غلطیاں تو بیسیوں ہیں۔

میں نے کیفی صاحب کی غلطیوں پر ایک مضمون لکھا۔ اور یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں اشاعت کے لیے ایڈیٹر ہمایوں لاہور بھیجا۔ انھوں نے اس کو کیفی صاحب کو بھیج دیا۔ دو برس بعد ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے کیفی صاحب کی خدمت میں مرقوم الذیل خط بھیجا:

"مخدومی تسلیم مؤرخہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۴ء کے عنایت نامے میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ میں مارچ تک بہت مصروف ہوں، کام کی معمولی کھکیڑ تو رہتی ہی ہے۔ بہرصورت جلد از جلد آپ کے مضمون کو دیکھنے کا وقت نکالوں گا۔ لیکن اس پر تقریباً دو سال گذر گئے" دریائے لطافت ہندوستان بھر کے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی نصابوں میں داخل ہے، اس وجہ سے نہیں کہ انشار کی تصنیف ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے اور آپ جیسے کثیر المشاغل دنیائے اردو کے زعیم اور مشرقی و مغربی ادبوں کے ماہر نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور آپ کی اور انجمن کی ساکھ دنیائے اردو میں اس حد تک قائم ہے کہ محض آپ کی اور انجمن کی ضمانت پر

گیارہ سال کے عرصے میں ترجمۂ دریائے لطافت کے کسی پڑھنے یا پڑھانے والے نے اس کو اصل کے ساتھ مطابق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی - اور مترجم کی لغزشوں کو انشاء کی تحقیقات یقین کر کے انھیں یاد کرتے چلے گئے۔ بہت ممکن ہے کہ بعضوں نے ان لغزشوں کو جانچا اور پرکھا ہو لیکن انھیں آپ تک یا اس ترجمے سے استفادہ کرنے والوں تک پہنچانے کی جرأت نہ ہوئی ہو یا اس امر میں تجاہل و تساہل سے کام لیا ہو یا ممکن ہے کہ اس دوسری قسم کے لوگوں کی سعی کا انجام بھی وہی ہوا ہو جو میری کوشش کا ہوا اس لحاظ سے دریائے لطافت کے اس ترجمے نے انشاء کی ادبی کاوشوں کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا صحیح اندازہ آپ جیسا محسنِ اردو ہی کر سکتا ہے۔ میں نے ترجمے کی جو چند نہایت نمایاں اور موٹی غلطیاں اپنے مضمون "حضرت کیفی اور دریائے لطافت کا ترجمہ" میں بتائی ہیں، ان کی اشاعت ہماری زبان یا رسالۂ اردو میں بلکہ ہندوستان میں متعدد اور کثیرالاشاعت ادبی رسالوں میں ضروری تھی تاکہ جن جن کے پاس یہ ترجمہ ہے ان سب تک یہ غلطیاں پہنچ جائیں اور انشاء کی طرف غلط چیزیں منسوب نہ ہو جائیں۔

انسان آخر انسان ہے غلطیاں اس سے ضرور سرزد ہوں گی - اس میں غیر فطری کوئی امر نہیں لیکن جب ان کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے تو پھر سو پچاس تک نہیں بلکہ کروڑوں کے حق میں یہ مضر ثابت ہوں ہی ہیں تو اب تک ان کا تدارک ہو جانا چاہیے تھا۔ شخصی حیثیت یا ذاتی وقار مفاد اردو کے پیش نظر کوئی چیز نہیں۔

خدا گواہ ہے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں ادبی یا صحافتی دنیا میں آپ کے معترض کی حیثیت سے کوئی مقام حاصل کروں۔ آپ کا یہ جملہ میرا ایمان ہے "کہ رسالوں میں مناظرہ برپا کرنا نہ آپ کو پسند ہو گا اور نہ مجھے پسند ہے" میں احسان فراموش بھی نہیں ہوں آپ کی عنایتیں مجھے کبھی بھی نہ بھولیں گی۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں

لیکن جب دیکھتی ہوں کہ آپ کی شخصیت کی وجہ سے اردو کا نقصان ہو رہا ہے تو میری خاموشی دنیائے اردو کا ناقابلِ عفو جرم بن رہی ہے۔

لہٰذا مجھے اس ذہنی کوفت سے نجات دلوائیے اور جلد از جلد میرے حوالے کیے بغیر خود اپنی جانب سے اردو کے طالب علموں کو ترجمے کے اسقام سے مطلع کرکے انھیں رواج پا جانے سے روکیے۔ فقط۔

لیکن اس پر صاحب نے برخاست بالآخر پورے پانچ سال بعد میں نے اس مضمون کو خود شائع کرا دیا جو میرے مجموعۂ مضامین "تحقیق نوادر" (۱۹۴۹ء) میں شریک ہے۔

ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی طبیب نے ایک معجون بنائی لیکن ترکیب غلط ہو گئی اور قوام بگڑ گیا۔ اب جس کو بھی وہ معجون کھلائی جاتی ہے اس پر اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے طبیب ہی کو معجون کے اس نقص کی طرف توجہ ہونی چاہیے تھی لیکن وہ خود توجہ نہ کر سکا کسی دوسرے نے جب ہر طرح سے طبیب ہی کو یقین دلایا کہ معجون زہر بن گئی ہے تو طبیب نے کہا کہ اس معجون پر میری اتنی محنت اور اتنا روپیہ خرچ ہوا ہے مریض مر جائیں تو طبابت کے عیب کو مٹی چھپا لیتی ہے لیکن معجون دفن کر دی جائے تو اس میں شہرت اور روپے کا خون ہوتا ہے البتہ جب دوبارہ بنے گی تو اپنی طرف سے بھی احتیاط برتی جائے گی اور آپ کے بتائے ہوئے نقائص کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ یعنی دوسرے ایڈیشن کے موقع پر اس سے استفادہ کیا جائے گا۔"

اب بمصداق کس برتے پر تتا پانی، چونکہ پہلے ایڈیشن کے زہر کے ایک ایک قطرے کو پوری احتیاط کے ساتھ ضائع ہونے سے بچا لیا گیا تھا "ارادی یا تقلیدی طور پر اس کتاب کی شہرت اس قدر گھٹ جاتی ہے کہ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ہی نہیں آتی" اب اگر وہ کتاب جو شائع کی گئی تھی خود شائع کرنے والے کی تصنیف یا تالیف ہے تو وہ اکیلا ڈوبا اور اگر کسی دوسرے کی تھی تو اس کو بھی لے ڈوبا لیکن یہ مثال کوئی کلیہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ مولانا عرشی کی ذات گرامی اس سے مستثنیٰ ہے، اسی لیے قارئین کرام سے میری استدعا ہے کہ اگر وہ اردو ادب میں مولانا عرشی کے معاصرین

سے واقف ہوں تو ان کی راست گفتاری اور راست کرداری کو شائع کردیں ۔ تاکہ بددیانتی اور خود پرستی کے مقابلے میں حق پرستی اور دیانت داری کا معیار ایسی قابلِ رشک مثالوں سے دنیائے اردو میں اپنی موجودہ سطح سے بہت بلند ہو جائے جس کی شدید ضرورت ہے ۔

میں نے قارئین سے یہ التجا اس لیے کی ہے کہ مجھے تجربہ اور یقین ہے کہ کوئی اولی درجے کا ادیب بھی اپنے آپ کو غلطیوں سے مبرّا نہیں سمجھ سکتا لیکن اس امر کے ثبوت ملنے مشکل ہیں ۔۔ کہ معاصرین میں سے واقعی کتنے ادیبوں کو اس انسانی کمزوری کے اعتراف کے مواقع حاصل ہوئے ہیں ۔ سب جانتے ہیں کہ ادیب کی زندگی کا مقصد دنیا میں حقیقتوں کو تلاش کرنا اور دنیا والوں ۔۔۔ کو ان سے روشناس کرانا ہے ان پر پردہ ڈالنا یا اپنی شخصیت کو حقیقت پر فوقیت دینا نہیں اس ضمن میں مولانا عرشی کی یہ تحریر یاد رکھنے کے قابل ہے :۔

"میں بہرحال انسانی سہو و نسیان کو ایک پائیدار اور رواں دواں حقیقت مانتا ہوں اور ساتھ ہی یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ خدا نے اپنے فیض کے سوتے بند نہیں کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کچھ لکھتا ہوں اپنے مخلص احباب سے خواہش کرتا ہوں کہ مجھے اغلاط پر متنبہ کریں اور خدا نے انھیں جو علم عطا کیا ہے اس کی زکوٰۃ اس طرح ادا کریں کہ نئی معلومات سے میں بھی بہرہ یاب ہو جاؤں ۔"

(مکتوب مؤرخہ ۱۷ر جون ۱۹۷۶ء)

مولانا عرشی کے مزاج کی حق پسندی کا تجربہ صرف مجھی تک مخصوص نہیں بلکہ اردو ادب سے ذوق رکھنے والے دیگر حضرات کا بھی یہی تجربہ اور واقفیت ہے اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ مختارالدین احمد آرزو کے علم میں یہ امر نہ تھا کہ دستورالفصاحت پر مذکورہ تبصرہ دراصل مولانا عرشی کی فرمائش ہی کی تعمیل میں لکھا گیا ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ طباعت سے پہلے اسے ملاحظہ فرما چکے ہیں ، بلکہ انھیں کی کوشش سے یہ رسالۂ برہان دہلی میں شائع بھی ہوا ہے ، چنانچہ آرزو صاحب نے اس لاعلمی کی بنیاد ہی پر میرا تبصرہ برہان میں پڑھ کر مجھے تحریر کیا :

" یہ مضمون آپ خود عرشی صاحب کے پاس بھیج دیجیے تو مناسب ہوگا۔ وہ ایک عمدہ مصنف اور بڑے اچھے محقق ہیں، اپنی غلطیوں کے تسلیم کرنے میں میں نے ان کی طرح کم آدمی دیکھے ہیں۔ بعض مصنف تو ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کی کتاب پر تنقید لکھیں تو وہ خود اور ان کے حواریین مارنے مرنے اور لڑنے لڑانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سانحہ خود میرے ساتھ گزر چکا ہے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء کے نگار میں ایک تنقید میری شائع ہوئی یاروں نے وہ ہنگامہ کیا اور وہ چیخ و پکار کہ برسوں تک اس کا سلسلہ نہ ٹوٹا۔ نجیب اشرف ندوی، مسعود عالم ندوی اور بعض اچھے دوستوں کی دوستی سے محروم ہونا پڑا۔

عرشی صاحب ان لوگوں میں نہیں ہیں وہ آپ کی تنقید دیکھ کر خوش ہوں گے اور اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے۔"

مکتوب مؤرخہ ۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء

اس مقام پر حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی حق پسندی کے ضمن میں جو آخری پیراگراف لکھا ہے اس کا نقل کرنا ناگزیر ہے:

" ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں۔ بلکہ انصاف اور حق پسندی کی وہ شریف خصلت اور وہ ملکہ جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اس کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔"

اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی فن میں ترقی کے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں جس سے اونچا درجہ نہیں ہو سکتا، وہ نہ حالی کے مخاطب ہیں اور نہ میرے۔

تبصرے

نئے رسالے

الرشاد، مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی، تقطیع متوسط ضخامت ۳۸ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، سالانہ چندہ :/25 روپے، پتہ: دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔

جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ عربی کا نیک نام اور قابل قدر مدرسہ ہے، اس مدرسہ میں تالیف وترجمہ کا ایک ادارہ بھی قائم ہے، زیر تبصرہ مجلہ اس ادارہ کے ترجمان کی حیثیت سے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوا ہے، اب تک اس کے گیارہ نمبر شائع ہو چکے ہیں، اس کے فاضل مرتب ملک کے نامور عالم اور صاحب قلم ہیں، متعدد وقیع کتابوں کے مصنف ہیں، چنانچہ اس مجلہ کا رنگ بھی یہی ہے، اس میں اسلامیات اور خصوصاً فقہ اور حدیث پر سنجیدہ اور علمی مقالات ہوتے ہیں۔ جو پر از معلومات اور فکر انگیز ہوتے ہیں، عام ارباب ذوق کے علاوہ مدارس عربیہ کے اساتذہ اور طلباء کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، مرتبہ مولانا سید جلال الدین عمری، تقطیع خورد، ضخامت ۱۲۰ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، سالانہ چندہ: /25 روپے، پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڈھ۔

مولانا سید جلال الدین عمری سے قارئین برہان خوب واقف ہیں، مسرت کی بات ہے کہ اب آپ کی سربراہی میں اسلامیات پر تحقیق کا ایک ادارہ علی گڈھ میں قائم ہوا ہے، اور زیر تبصرہ رسالہ اس ادارہ کے مجلہ کا پہلا نمبر ہے، اس نمبر میں تعارف اور تبصرہ کے

علاوہ سات مضمون ہیں، ان میں دو مضمون (۱) آدم وحوا کا قصہ قرآن میں اور (۲) مگر زد کے مسائل اسلام نے حل کیے ہیں" تو خود فاضل مرتب کے قلم سے ہیں، ایک مضمون "مطالعہ اسلام میں فن شان نزول کی اہمیت" ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی کے قلم سے ہے جن کے تحقیقی مضامین برہان میں شائع ہو کر ارباب علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، باقی مضامین یہ ہیں: "وہ نبی جس کا انتظار تھا" از ڈاکٹر محمد ذکی، "مسلمان باپ کی ذمہ داریاں۔" مولانا صدرالدین اصلاحی، تصور مساوات کا پس منظر" سلطان احمد صاحب اصلاحی، تعدد ازدواج پر پابندیوں کا مسئلہ" ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری، یہ سب مضامین فکر انگیز اور مطالعہ کے لائق ہیں، امید ہے کہ یہ ادارہ ترقی کرے گا اور اسی کے پروگرام کے ماتحت صاحب ذوق نوجوانوں کو تصنیف و تالیف میں تربیت پانے کا موقع بھی ملے گا۔

ماہانہ القاسم، مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، تقطیع متوسط، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، سالانہ چندہ: ‎25/-‎ روپے۔ پتہ: دفتر ماہنامہ القاسم، دیوبند، ضلع سہارن پور۔

ایک زمانہ تھا جب کہ دارالعلوم دیوبند سے القاسم اور الرشید نام کے دو ماہنامے شائع ہوتے تھے اور ان کا غلغلہ پورے برصغیر میں برپا تھا کیونکہ اکابر دارالعلوم مثلاً حضرت شیخ الہند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی وغیرہم کے معرکۃ الآرا مضامین ومقالات شائع ہوتے تھے، اب عالمی مؤتمر ابنائے قدیم، دیوبند کی طرف سے پھر القاسم نام کا یہ ماہنامہ نکلنا شروع ہوا ہے، لیکن ہم نامی کے باوجود وہ پہلی سی بات کہاں؟ اور تو اور خود دارالعلوم دیوبند پھر دوبارہ ان دو مجلات جیسا کوئی مجلہ اب تک نہیں نکال سکا، تاہم یہ غنیمت ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بعض تبرکات شائع ہوتے رہتے ہیں، حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی کی علمی تقریر جو قسط وار شائع ہو رہی ہے وہ بھی بہت خوب اور مطالعہ کے لائق ہے اس کے علاوہ

عام مضامین بھی پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

تاریخ اطبائے بہار، از جناب حکیم محمد اسرار الحق، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۹۲، صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد: -/12 روپے، پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ـــ ۴

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طب یونانی کا مرکز دلی اور لکھنؤ کے بعد بہار ہی تھا جہاں مغل سلطنت کے عہد میں اور پھر انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس فن کے ماہر اور نہایت حاذق اطبا کثرت سے پیدا ہوئے اور خلق خدا نے ان سے بڑا فائدہ اٹھایا، لیکن ذرائع اشاعت کی کمی کے باعث جو شہرت اول الذکر اطبا کی ہوئی وہ بہار کے افاضلِ فن کی نہ ہوسکی، ان حالات میں خوشی کی بات ہے کہ حکیم محمد اسرار الحق صاحب نے جو صاحب فن ہونے کے ساتھ تاریخ طب سے بھی خوب واقف ہیں اور لکھنے کا اچھا سلیقہ بھی رکھتے ہیں اس طرف توجہ کی، اور اطبائے بہار کی تاریخ قلمبند کرنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ اس کتاب میں جو جلد اول ہے ۱۹۲ اطبار کا تذکرہ ہے۔ اس میں خاندانی اور شخصی حالات وسوانح کے علاوہ اطبار کا طریق علاج، خاص خاص نسخے اور علاج کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، زبان سلیس اور شگفتہ ہے، امید ہے طب کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ عام لوگوں کے لیے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سالنامہ اللطیف، مرتبہ مولانا محمد حسین ایم۔ اے و مولانا بشیر الحق قریشی، تقطیع کلاں، ضخامت ۲۱۲ صفحات، قیمت مذکور نہیں، پتہ: مدرسۂ دار العلوم لطیفیہ، ویلور (مدراس)

اللطیف مدرسہ دار العلوم لطیفیہ کا علمی، دینی اور اصلاحی ماہنامہ ہے، یہ اس کا خاص نمبر ہے جو محنت سے مرتب کیا گیا ہے، اس میں اگرچہ متعدد دینی اور علمی مضامین شامل

ہیں لیکن تصوف کا غلبہ ہے، اس مجلہ کے سرپرست مولانا ابوالنصر سید شاہ محمد باقر صاحب قادری خود جنوبی ہند کے ممتاز عالم دین اور شیخ طریقت ہیں، عام مضامین کے علاوہ سلوک و معرفت سے متعلق سوالات و جوابات کا بھی ایک باب ہے جو مفید ہے۔

برہان

جلد نمبر ۸۸، جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۲ھ، مطابق مارچ سنہ ۱۹۸۲ء، شمارہ نمبر ۳

مقالات

نظرات

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی اچانک علالت کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ معلوم ہو چکی ہوگی، قارئین برہان اس کی تفصیلات جاننے کے لیے بے چین ہوں گے اس لیے گزارش ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں ۲۱ر فروری سے ۲۳ر تک اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار تھا جو وہاں بڑے تزک و احتشام اور دھوم دھام سے انجام پذیر ہوا، مفتی صاحب کی طبیعت پچھلے چند روز سے ناساز چل رہی تھی اور ضعف و نقاہت کے آثار نمایاں تھے، لیکن اس کے باوجود سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا تقاضا شرکت پر اصرار زیادہ ہوا تو مفتی صاحب نے حسب عادت از راہِ مروت اعظم گڈھ کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۹ر اور ۲۰ر کی درمیانی شب میں وہ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب کی معیت میں گنگا جمنی ایکسپریس سے دہلی سے اور اسی ٹرین سے راقم الحروف چند احباب کے ساتھ علی گڈھ سے روانہ ہوئے، لیکن کمپارٹمنٹ الگ الگ تھا۔ ۲۰ر کی شام کو ہم لوگ اعظم گڈھ پہنچ گئے، یہاں ہمارا قیام تین دن رہا۔ ان دنوں میں اگرچہ ضعف و نقاہت کا اثر نمایاں تھا لیکن مفتی صاحب کی طبیعت ہشاش بشاش رہی، سیمینار کی دو تین نشستوں میں شریک ہوئے اور ایک نشست کی صدارت بھی کی، ۲۴ر کی صبح کو ہم لوگوں کی واپسی کا پروگرام تھا، ناشتہ کے بعد ہی دارالمصنفین سے روانہ ہو کر ایک بڑی جیپ کے ذریعہ ہم لوگ بنارس آئے اور وہاں سے اسی گنگا جمنی ایکسپریس سے روانہ ہوئے یہاں پر ہم رزرویشن کے باعث دو کمپارٹوں میں بٹ گئے تھے، ایک میں مفتی صاحب، قاضی صاحب اور مولانا ابو اللیث ندوی تھے اور دوسرے ڈبہ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور خاکسار راقم الحروف حسن اتفاق سے جس ڈبہ میں مفتی صاحب وغیرہ تھے اسی ڈبہ میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے دو حضرات [illegible] بھی ہمسفر تھے اور یہ بھی اعظم گڈھ سے آرہے تھے [illegible] کے اسٹیشن پر پہنچے [illegible] مفتی صاحب پر اچانک فالج کے حملہ کی خبر [illegible]

[illegible] ایک مفتی صاحب کے پاس پہنچ تو دیکھا کہ فالج کا اثر داہنے ہاتھ اور زبان پر ہے، اس حالت میں کچھ وہ بولتے تھے مگر الفاظ صاف نہیں تھے، سخت پریشانی کا عالم تھا۔ فوری طور پر ٹیلیفون کال [illegible] حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، مگر جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو بارہ بنکی کے اسٹیشن سے کنڈکٹر کے ذریعہ ڈاکٹر کو لکھنؤ فون کے ذریعہ اطلاع دے دی گئی، چنانچہ لکھنؤ پہنچتے ہی ڈاکٹر مع اپنے ایک اسسٹنٹ کے آگیا، ڈاکٹر نے پوری توجہ سے معائنہ کیا اور اس کے بعد مشورہ دیا کہ مریض کو یہیں اتار لیا جائے، کیونکہ فالج کا حملہ ابھی تو خفیف ہے، دلی جانے کی صورت میں پوری شب اسی حالت میں گزرے گی، اندیشہ ہے کہیں مرض بڑھ نہ جائے۔

ڈاکٹر کا مشورہ بالکل صائب تھا۔ اس لیے قاضی سجاد حسین صاحب اور راقم الحروف، ہم دونوں نے لکھنؤ اترنے کا فیصلہ کر لیا اور ہمارے ساتھ وہ دو نوجوان طالب علم بھی اتر گئے، ڈاکٹر نے ایمبولنس کار کا انتظام کر ہی دیا تھا، اسٹریچر کے ذریعہ مفتی صاحب کو کار میں منتقل کیا گیا اور ہم لوگ بلرام ہسپتال پہنچے، یہاں مفتی صاحب کو فوراً ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر لیا گیا، ڈاکٹر جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے نہایت شریف اور مستعد تھے، انھوں نے مفتی صاحب کا معائنہ کمال توجہ سے کیا اور ہمیں یقین دلایا کہ ابھی کوئی خطرہ کی بات نہیں، فالج کا حملہ سخت نہیں ہے، اس سے فراغت کے بعد ان دونوں طالب علموں کو مفتی صاحب کے پاس چھوڑا اور قاضی صاحب اور میں ہم دونوں ندوۃ العلماء آگئے، یہاں مولانا سید ابو الحسن علی میاں موجود تھے، ان کو اطلاع ہوئی تو سخت پریشان ہوئے اور اسی وقت اپنے عملہ کو ہوشیار کر دیا، چھ آدمیوں کی ڈیوٹی مقرر کر دی کہ ان میں دو دو آٹھ آٹھ گھنٹے کے لیے مفتی صاحب کے پاس رہیں گے، اور پھر نہایت پرتکلف ناشتہ سے فراغت کے بعد مولانا معین اللہ صاحب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کو اور ہم دونوں کو ساتھ لے کر مولانا بلرام ہسپتال پہنچے، ادھر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو خود ایک تجربہ کار اور مرض فالج کے کامیاب ہومیو پیتھک معالج ہیں الگ اپنی کار میں مولانا برہان الدین سنبھلی اور بعض اور اساتذہ ندوہ کی معیت میں ہسپتال پہنچ گئے، ان حضرات کے پہنچنے سے ہسپتال میں چہل پہل پیدا ہو گئی، اور ہسپتال کے چند اور ڈاکٹر بھی آگئے، ان کی موجودگی میں سب نے مفتی صاحب کو دیکھا، ان کی حالت قدرے بہتر تھی، مگر آکسیجن دیا جا رہا تھا،

اس کے بعد مولانا علی میاں اور ڈاکٹر قریشی نے ڈاکٹروں سے تبادلہ خیال کیا اور اس کے مطابق اپنے عملہ کو خاص خاص ہدایات دیں، حق یہ ہے کہ مولانا علی میاں اور ڈاکٹر قریشی اور ندوہ کے دوسرے معائنہ نے اس موقع پر جس درجہ ہمدردی اور مواسات کا معاملہ کیا ہے اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، فجزاہم اللہ عنا جزاءً خیراً۔ ان سطور کے قلمبند ہونے تک مفتی صاحب بلرام ہسپتال میں ہی زیر علاج ہیں اور حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے، اب وہ اسپیشل وارڈ میں منتقل ہو گئے ہیں، قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ جلد مکمل صحت یابی کی دعا کریں۔

جنوری کے آخری ہفتہ میں اسلامیہ ہائی اسکول، کلکتہ کے جشن جوبلی کے سلسلہ میں کلکتہ جانا ہوا تو وہاں اپنے قدیم اور عزیز احباب کے ساتھ احمد سعید صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر آزاد ہند اجالا سے بھی ملاقات ہوئی اور حسب معمول دیر تک گلچپ رہی، اسی درمیان دارالعلوم دیوبند کے موجودہ ناگفتہ بہ حالات کا ذکر آیا تو میں نے اپنے احساسات کا ذکر صفائی سے کیا۔ ابھی پچھلے دنوں دفتر برہان میں اجالا کا وہ پرچہ میری نظر سے گزرا جس میں ملیح آبادی صاحب نے میری دارالعلوم سے متعلق یہ گفتگو ایک انٹرویو کی صورت میں چھاپ دی ہے تو اس میں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب کی ذات کے متعلق دو نامناسب اور نازیبا لفظ طبع ہو گئے ہیں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دو لفظ میرے ہرگز نہیں ہیں، کیونکہ میں تقریر ہو یا تحریر ایسی کرخت زبان اپنے کسی مخالف کے خلاف بھی استعمال نہیں کرتا چہ جائیکہ ایک ایسی ذات کے متعلق جن کا ادب و احترام میں اب بھی ایسا ہی کرتا ہوں جیسا کہ پہلے کرتا تھا۔

خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ایک بنیادی اقدام

از:- جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی - ناظم فرقانیہ اکیڈمی - بنگلور - ۵۰

(۱)

فتنہ و فساد کی روک تھام:

قرآنی نظریات کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات اور اس کے تمام مظاہر کا علم (علم اسماء) اس لیے عطا فرمایا تاکہ وہ ان مظاہر کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے صحیح تعارف حاصل کر کے ہر ایک سے اُس کے مرتبے و مقام کے مطابق برتاؤ کرے۔ اور دوسری حیثیت سے ان مظاہر میں ودیعت شدہ نعمتوں اور پوشیدہ فوائد سے بھی بخوبی مستفید ہو کر خلافتِ ارض کے مقاصد اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

خلافتِ ارض کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد فکری و نظریاتی اعتبار سے عالم انسانی کی رہنمائی کرنا اور دنیا میں امن و امان قائم کرنا بھی ہے۔ درحقیقت اصلاحِ عالم کی دو شکلیں ہیں:

۱- نظریاتی اعتبار سے دلیل و استدلال اور حجت و برہان کی زبان میں کلام کر کے اقوامِ عالم کو قائل کرانا اور ان کی گمراہیوں پر متنبہ کر کے عقلی و استدلالی حیثیت سے ان پر اتمامِ حجت کرنا۔

۲- بدامنی اور فتنہ و فساد کی صورت میں ــــ جب کہ نظریات محض نظریات نہ رہیں۔

بلکہ فتنہ وا مصنفے کی شکل اختیار کرلیں ـــــ تلوار کے ذریعہ ان کی اصلاح کرتا۔ بالفاظ دیگر بوقت ضرورت فتنہ و فساد کی روک تھام اسلحہ کے ذریعہ کرتا۔

اگر آغاز اسلام اور خصوصاً دور رسالت اور خلافت راشدہ کے حالات وواقعات کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اس کی حکمت عملی ان ہی دو باتوں پر مشتمل رہی ہے۔ اور اُس دور کی تمام جنگیں دفاعی نقطۂ نظر سے اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لیے لڑی گئی تھیں۔ مگر مخالفین اسلام نے مشہور کر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ اسلام جیسے پُر امن اور انسانیت نواز مذہب پر یہ سراسر ایک بہتان ہے۔ جیسا کہ پچھلے ابواب کے تمام مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ اسلام سراسر ایک علمی و عقلی مذہب ہے جو ہمیشہ دلیل و استدلال اور حجت و برہان کو مقدم رکھتا ہے۔ اور تلوار اُٹھانے کی اجازت صرف اُسی وقت دیتا ہے جب کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو، اور اسی حد تک دیتا ہے جس حد تک کہ فتنہ و فساد دب جائے اور کم سے کم خونریزی عمل میں آئے یعنی انسانی تمدن و معاشرت میں جو "فاسد مواد" ہو وہ نکل جائے اور جو چیز انسانیت کا ناسور بن چکی ہو اس کو کاٹ کر پھینک دیا جائے، تاکہ معاشرے کا سُدھار عمل میں آسکے۔ اس اقدام کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ کے بندوں کو چین و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے فلسفۂ اجتماعیات کے اس بنیادی اور اہم ترین اصول پر اپنے خصوص انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ٥

اور اگر اللہ (اقوام عالم میں اپنی مصلحتوں کی بنا پر) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو خانقاہیں، مدرسے، عبادت خانے اور مسجدیں ـــــ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا

ہے سب ڈھا دیے گئے ہوتے۔ اور اللہ ضرور اُن کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ کیونکہ اللہ طاقتور اور زبردست ہے (حج: ۴۰)

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ غالب اور زبردست ہے اس لیے وہ اپنے دینِ متین کو بھی غالب اور زبردست دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ ذاکت اور کفر کشمکش کے وقت اس کے دینِ ابدی کا پھریرا بلند کرنے والوں کو سربکف ہونا چاہیے، ورنہ دین کا دفاع اور اپنی تہذیب و تمدن کا بچاؤ مشکل ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ نظریاتی اعتبار سے جو ملت اصلاحِ عالم کی دعویدار ہو اس کو سب سے پہلے خود اپنے آپ کو مضبوط اور قوی بنانا چاہئے۔ اس سیاق میں "وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ" (اور اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جو خود اس کی مدد کرے) کا یہی مطلب ہے۔

غرض اسلام عقلی اور نظریاتی اور پُرامن تبلیغ کا قائل ہے۔ دنیا کے دیگر متشددانہ فلسفوں (مثلاً کمیونزم) کی طرح وہ زبردستی اپنے نظریات کو تھوپنے اور بے جا قتل و غارت گری کا قائل نہیں۔ اور جنگ کی اجازت صرف اسی وقت دیتا ہے جب کہ اپنی تہذیب و تمدن کو خطرہ لاحق ہو یا امن عالم کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتبار سے آج روئے زمین پر اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو "پُرامن بقائے باہم"[1] کا قولاً اور فعلاً ہر اعتبار سے صحیح طور پہ قائل ہے۔

---

[1] یہ روسی کمیونزم کا نعرہ ہے جو محض ایک کھوکھلا دعویٰ ہے اور عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے برعکس روسی کمیونزم ماضی قریب میں رومانیہ، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور اب افغانستان میں اپنی جارحیت پوری طرح ثابت کر کے خود اپنے اس نظریے "پرامن بقائے باہم" کو غارت کر چکا ہے۔ اور اب پولینڈ اور دیگر ممالک میں مداخلت کر کے انھیں اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے۔

بہرحال آج دینِ اسلام کی نصرت اور اُس کے صحیح دفاع کے دو طریقے ہیں:

۱۔ علمی و عقلی اور نظریاتی اعتبار سے دینِ اسلام کی صحیح تبلیغ جو عصرِ جدید کے مزاج اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو، اس کا پہلا مرحلہ فکر و نظر کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے "قرآنی علمِ کلام" کی تدوین ہے، جس کی ضرورت اور طریقۂ کار کے متعلق پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

۲۔ مگر جب "بیضۂ اسلام" یا "ملت اسلامیہ" کو خطرہ لاحق ہو جائے، بالفاظِ دیگر جب طاغوتی قوتیں اسلامی مرکزوں پر چڑھ دوڑیں (جس طرح آج روس افغانستان پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے) تو اُس وقت ہتھیار سنبھال کر میدان میں آ جانا چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے ان فتنوں کا استیصال کرنا چاہیے۔

ملک و ملت کا دفاع اسلام کی نظر میں:

یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام کو عالمی سیاست کے مطابق فوجی و عسکری اعتبار سے اپنے آپ کو مسلح کرنے اور مخالفینِ اسلام کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ چوکنا اور چوکس رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ج لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ج اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

اور تم لوگ اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کا پڑاؤ (ہر وقت) تیار رکھو، جس کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو، اور اُن قوموں پر بھی جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے، اللہ اُن کو جانتا ہے (جن سے تمہارا سابقہ مستقبل میں پڑنے والا ہے۔) اور اللہ کی راہ میں (سامانِ جنگ کی تیاری پر) جو کچھ تم خرچ کرو گے (اُس کا بدلہ) تم کو پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔ (انفال: ۶۰)

قرآن حکیم میں ہر دور کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، چنانچہ اس آیت کریمہ میں گھوڑوں کا

لفظ عصر قدیم کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ اور ما بعد کے ادوار کی رعایت سے "قُوَّة" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور جدید سے جدید تر سامان جنگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ" سے مراد دورِ نزول کے منکرین حق اور دشمنان اسلام ہیں۔ اور "وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ" سے مراد ما بعد کی قومیں۔ "تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ" (تاکہ تم اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو) یہ مقصد عسکریت، فلسفۂ جنگ، خلافتِ ارض کی غرض و غایت اور امنِ عالم کی بنیادی اینٹ ہے۔ یعنی محض اس رعب و دبدبے ہی کی بدولت تمہیں امن و امان اور چین و سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کمزوری کی بدولت ہر قوم اور ہر ملک دبانے ستانے اور حق مارنے لگ جائے گا۔ کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری اُن کی موت کے مترادف ہوتی ہے۔ یہ اصول کل کی طرح آج بھی بین الاقوامی حیثیت سے پوری طرح صحیح نظر آتا ہے۔

اس طرح یہ آیت کریمہ بیک وقت نہ صرف حتیّ المقدور جنگ کی تیاری اور اس کی راہ میں انفاق کی ترغیب و تحریص دلا رہی ہیں بلکہ خلافت ارض کا فلسفہ سمجھاتے اور مستقبل کے بارے میں کچھ پیش گوئیاں کرتے ہوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہے، جو ہمیشہ مسلم حکومتوں کو دزدیدہ نگاہوں سے تاکا کرتے ہیں، جیسا کہ تاریخ اسلام شاہد ہے۔ خلافت ارض کے تعلق سے اس آیت کریمہ میں ہمارے لیے بہت سے اسباق و بصائر ودیعت کر دیے گئے ہیں، جن کی تھوڑی سی تفصیل اگلے صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

جدید اسلحہ کی تیاری:

اس آیت کریمہ کا منشا جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے "فتنوں" کو کچلنے اور باطل سے نبرد آزمائی کے لیے بہتر سے بہتر ہتھیاروں کی تیاری ہے۔ آج تیر کمان، تلوار اور نیزے کا دور نہیں رہا، بلکہ بندوق، مشین گن اور ٹینکوں کا دور بھی بہت بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب راکٹ، مزائیل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نیوٹران بم، جراثیمی بم اور خلائی سیاروں کا دور ہے۔ اب انسان خلا میں

بیٹھ کر جنگ کرنے اور اجرام سماوی میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ تاکہ وہ اپنا دفاع مضبوط کرکے ایک ہی وار میں اپنے دشمنوں کا صفایا کر سکے۔

لہٰذا اقوام عالم کو قابو میں رکھنے کے لیے جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر "تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ" کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مقصد "بھیک" کے چند ہتھیاروں کو جمع کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے بذاتِ خود محنت اور جدوجہد کرنے اور خود کفیل بننے کی ضرورت ہے۔

یہ آیت کریمہ دنیائے اسلام کو صاف طور پر متنبہ کر رہی ہے کہ اہل اسلام ہمیشہ چوکنا اور حالت جنگ میں رہیں۔ ورنہ غفلت اور بے خبری کی صورت میں وہ اچانک حملوں کا توڑ اور صحیح دفاع نہیں کر سکیں گے۔ جیساکہ ۱۹۶۷ء کی عرب — اسرائیل جنگ شاہد ہے۔

آغاز اسلام میں چونکہ صحابۂ کرامؓ قرآن حکیم کے رمز شناس تھے اور اس کی حکمتوں کو بخوبی سمجھتے تھے اس بنا پر وہ فوجی (عسکری) اعتبار سے ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہا کرتے تھے۔ چنانچہ فاتح مصر حضرت عمروؓ بن العاص (متوفی ۴۳ھ) نے اُس موقع پر جب کہ ملک مصر پوری طرح فتح ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے لیے بظاہر کسی قسم کے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، اہل اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے جو بات فرمائی تھی وہ قیامت تک تمام مسلمانوں کو یاد رکھنے کی ہے جو ایک زرّیں تاریخی اُصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا "انتم فی رباط دائم" (یاد رکھو کہ تم ہمیشہ پہرے پر ہو) یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے دشمنوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

اور پوری تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں کو جو بھی ملکی و سیاسی نقصانات ہوئے اور اسلامی حکومتوں پر جو زوال و ادبار طاری ہوا ہے وہ اسی زرّیں تاریخی اُصول کو فراموش کر دینے کے باعث ہے، چنانچہ سلطنت عباسیہ، مسلم اندلس (اسپین)، ملت اسلامیہ ہند، دولت عثمانیہ کے عروج و زوال اور خصوصیت کے ساتھ اُن کے آخری ادوار کے حالات اور خود عرب اسرائیل جنگوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو اس ربانی صداقت کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

بہر حال تاریخ شاہد ہے کہ مسلم حکومتوں کا رعب و دبدبہ ـــ اُن کے عروج کے زمانے میں ـــ جب تک اقوام عالم پر چھایا رہا، خلافت اسلامیہ بھی برقرار رہی اور دنیا میں امن و امان بھی قائم رہا۔ یعنی اُن کی رواداری، عدم تعصب اور وسیع المشربی کی بنا پر۔ وہ نہ صرف اپنے ماتحت رہنے والی غیر مسلم رعایا کے جان و مال کے محافظ تھے بلکہ وہ اپنے ماتحت رہنے والی حلیف قوموں اور ملکوں کے بھی محافظ تھے۔ مگر خلافت اسلامیہ کے زوال کے ساتھ ہی روئے زمین پر طوائف الملوکی پھیل گئی اور ظلم و عدوان کا بازار گرم ہوگیا۔ یہ بھی ایک نقصان عظیم ہے جس سے عالم انسانی ملت اسلامیہ کے زوال کے باعث دوچار ہوا۔

ہماری اس کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے اور دنیا میں پھر سے امن و امان کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلافت ارض کی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور فوجی و عسکری حیثیت سے خود کو قوی اور طاقتور بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بات خوب یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت دنیا میں جتنی بھی صنعتیں (Industries) کام کر رہی ہیں، ان میں فوجی و عسکری نوعیت کی صنعتیں سب سے زیادہ اور اول نمبر پر ہیں۔ (پھر اس کے بعد مختلف قسم کی ادویات کی صنعتوں کا نمبر آتا ہے۔) مثلاً مختلف قسم کی رائفلیں، مشین گن، توپ، ٹینک، قسم ہا قسم کا گولا بارود، ہوائی جہاز، راڈر، راکٹ، میزائیل، مختلف قسم کے بم، جنگی مشنری اور ایٹمی ہتھیار وغیرہ وغیرہ۔ اور اندازہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے دیگر عسکری سازوسامان اور کل پرزوں کی تیاری کے لیے ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا حال یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے سائنسی اور صنعتی علوم کو جنگی ضروریات اور حاملی اشیاء کی تیاری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ان تمام علوم کو پوری قوت کے ساتھ فوجی طاقت کے حصول کی راہ میں جھونک دیا ہے اور لاکھوں آدمی دن رات ان مقاصد کے حصول میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف ہیں؛ چنانچہ امریکہ کے صرف ایک خلائی صنعت کے ادارہ "ناسا" (NASA[1]) میں کام کرنے والے (۱؎ حاشیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھیے)

سائنس دانوں، انجینیروں اور دیگر افراد کی تعداد بارہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اسی سے آپ دیگر صنعتوں اور اُن کے پھیلاؤ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں خصوصیت کے ساتھ جاپانی قوم سے سبق سیکھنا چاہیے، جس نے دوسری جنگ عظیم میں اپنا سب کچھ برباد کر دینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ بلکہ تن، من دھن کی بازی لگا کر صرف ایک ربع صدی میں نہ صرف دنیا کے صف اول کے صنعتی ممالک میں شامل ہو گئی بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ معجزہ آخر کس طرح ظہور میں آیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مسلسل محنت، جفاکشی اور مقصد سے لگن کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

ماہرین عسکریات کا کہنا ہے کہ ایک اچھی فوج تیار کرنے کے لیے جہاں ایک طرف بہتر-ین اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسری طرف عددی طاقت اور تنظیم بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بہتر-ین اسلحہ، عددی طاقت اور تنظیم، یہ تین بنیادی عناصر ہیں جن سے کوئی اچھی فوج تشکیل پاتی ہے۔ اب اگر مختلف مسلم ممالک (جن کی تعداد اس وقت دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ ہے) کے درمیان صحیح معنی میں تال میل اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور اپنے وسائل کا بہتر سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو تینوں مقاصد بخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس اقدام کے ذریعہ اتنے سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو بیان سے بھی باہر ہیں۔ باہمی اشتراک اور باہمی امداد و اعانت کا ایک ایسا منظر سامنے آسکتا ہے جو بے مثال ہو سکتا ہے۔ آج عالم اسلام کی عددی قوت ایک ارب کے لگ بھگ (۹۰ کروڑ سے زیادہ) ہے۔ اگر پورا عالم اسلام متحد ہو جائے تو ایک ایسی عظیم الشان قوت عالم وجود میں آجائے گی جو پورے عالم کو تہ و بالا کر سکتی ہے اور دنیا کی ہر سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مسلم ممالک کی حیثیت اس وقت "کھوئی ہوئی بھیڑوں"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) National Aeronautical And Space Administration.

یا کتاب کے منتشر اوراق کی طرح ہے۔ جب تک ان کے درمیان اتحاد اسلامی (PAN — Islamism) عمل میں نہیں آتا ہمارے ملی و اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہم کو قرآن حکیم کا یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے:

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ یہ تمہاری امت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ (مؤمنون: ۵۲)

جنگی ہتھیاروں کے لیے جنگی صنعتوں کا قیام ناگزیر:

اس وقت دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں نظر آتی ہیں۔ مگر سب کی سب فوجی و عسکری نقطۂ نظر سے کمزور اور اسلحہ کے معاملے میں بڑی قوموں کی دست نگر ہیں۔ یہ حقیقت میں سزا ہے اس بات کی کہ وہ "علم اسماء" اور "تسخیر اشیاء"[1] کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئیں!

طاقت کے اعتبار سے "قومی کمزوری" حقیقتاً قومی موت ہے۔ اور یہ قانون فطری، شرعی، تاریخی اور سیاسی ہر اعتبار سے صحیح ہے۔ یہ صحیفۂ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور قومیں اس کائنات گیتی میں زیادہ دنوں تک قومی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ بلکہ وہ جلد یا بدیر یا تو غالب اور طاقتور قوموں کا لقمۂ تر بن جاتی ہیں یا پھر اُن پر ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا مقصد خلافت اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان قومیں "تسخیر اشیاء" کے میدان میں خود آگے نہ بڑھیں اور "مادہ" میں ودیعت شدہ قوتوں کو زیر کر کے اُن کا صحیح استعمال نہ سیکھ لیں۔ اس وقت مسلم حکومتوں کے پاس وسائل کا ایک انبار موجود ہے۔ اگر وہ صحیح سوجھ بوجھ سے کام لے کر تسخیر اشیاء یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کود پڑیں تو بہت جلد دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور موجودہ غیر یقینی صورت حال بدل سکتی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے بُرہان کے پچھلے شمارے (خلافت ارض کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت)

اس وقت عرب ممالک کو خصوصیت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس کرتے ہوئے جو دولت اللہ تعالیٰ نے انھیں دے رکھی ہے اس کا صحیح استعمال کرنا چاہیے۔ عرب ممالک آج اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو خلافت ارض کی از سر نو تشکیل و تعمیر میں ایک مؤثر، فعال اور مثبت رول ادا کرسکتے ہیں۔ اور پوری مسلم دنیا ان کے اقدامات کی تائید کے لیے ان کی پشت پناہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت (پندرھویں صدی ہجری میں) دنیائے اسلام کو ایک فیصلہ کن مرحلے اور بہت نازک امتحان میں کھڑا کر دیا ہے۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا۔ (جس نے کھلی آنکھوں سے کام لیا وہ فائدے میں رہا اور جو جان بوجھ کر اندھا بنا وہ زیاں کار ہوا۔)

اس مقصد عظیم کے حصول کے لیے محض چند کانفرنسیں منعقد کرا دینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ جب تک کہ ایک ٹھوس پروگرام بنا کر مثبت طور پر کام شروع نہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے سائنسی تعلیم کو عام کرنے، سائنسی مراکز، سائنسی تعلیم گاہیں اور صنعتیں (Industries) قائم کرنے کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے۔

اس وقت عرب ممالک کا کثیر سرمایہ یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں "بند" پڑا ہوا ہے یا اُس کا فائدہ غیر قوموں کو پہنچ رہا ہے[1] اگر وہ اسی سرمائے سے اپنے یا دوسرے مسلم ملکوں میں جدید صنعتیں قائم کریں تو اس کے نتیجے میں خود ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور ترقی پذیر مسلم ممالک کا بھی بھلا ہوگا، جو فنّی (Technical) اعتبار سے کچھ نہ کچھ معلومات تو رکھتے ہیں مگر سرمایہ

---

[1] ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس سرمائے سے جو سود حاصل ہو رہا ہے وہ مشنری اداروں کو تبلیغ مسیحیت کی خاطر دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ عرب ممالک شرعاً سود لینے کے روادار نہیں ہیں۔ اور اصل رقم (راس المال) سے یورپین تجارتوں اور صنعتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس طرح ہم اپنے سرمائے سے مغرب کو ہر اعتبار سے فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے؟

نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

عرب ممالک کو ایران اور امریکہ کے حالیہ واقعات سے سبق لینا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ اپنے سرمائے کی حفاظت کے معاملے میں انھیں بہت زیادہ حسّاس اور فکرمند ہونا چاہیے کیونکہ ضرورت پڑنے پر دنیا کی یہ بڑی اور حریص طاقتیں ـــ تمام بین الاقوامی ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ـــ کمزور قوموں کا سرمایہ تک ہڑپ کرنے سے نہیں ہچکچاتیں۔ بلکہ اس کو منجمد کر کے ان کو مفلس و قلاش کر سکتی ہیں۔ لہٰذا عربوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ آخر وہ سرمایہ، جس کو وہ "محفوظ" سمجھتے ہیں، کس کام کا جو بوقت ضرورت یا آڑے وقت میں نہ تو خود ان کے کام آسکتا ہو اور نہ اس سے دنیائے اسلام کا ہی کوئی بھلا ہو سکتا ہو!

ان تمام وجوہات کی بنا پر ضروری ہے کہ مسلم ممالک حسب ذیل اُمور پر خصوصی توجہ مبذول فرمائیں:

۱۔ فوری طور پر مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی (Industrial) تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے سائنسی تحقیقات کے ادارے، مراکز اور سائنسی و فنی تعلیم کے لیے خصوصی درسگاہیں (پالی ٹکنک اور انجینیرنگ کالج وغیرہ) زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کیے جائیں اور عوام کو سائنسی و صنعتی تعلیم کے حصول کی مؤثر انداز میں ترغیب دی جائے اور سائنسی معلومات کو عام کرنے اور ان کو مقبول بنانے کے لیے کثرت کے ساتھ لٹریچر (اپنی قومی اور مادری زبانوں میں) شائع کیا جائے۔ یہ عمل دیگر تمام اقدامات کے لیے ایک بنیادی اینٹ اور اولین منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک میں مختلف مصنوعات اور جنگی اوزار تیار کرنے کے لیے فوری طور پر ضروری اور اہم صنعتیں قائم کی جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ تمام آلات و اوزار اور ہر قسم کی مشینیں حتی المقدور خود ہی تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ مسلم ممالک کی ایک مشترکہ تجارتی منڈی (کامن مارکیٹ) ہونا چاہیے۔ اس کے

ذریعہ ایک دوسرے کی ضروریات آپس میں بخوبی پوری ہو سکتی ہیں۔

۴۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے اپنے خام مال اور خام اشیاء کا تبادلہ جہاں تک ممکن ہو آپس ہی میں کر لینا چاہیے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہوگا کہ جہاں پر خام مال پیدا ہوتا ہو اُسی ملک میں اُس کی صنعتیں قائم کی جائیں۔ اس طرح نقل و حمل کے اخراجات میں کفایت رہے گی۔

۵۔ جو ممالک فنی اور ٹیکنیکل حیثیت سے جانکاری رکھتے ہیں وہ آگے بڑھ کر (صنعتی ترقی میں) خام مال تیار کرنے والوں کی مدد کریں اور جو مالدار ممالک ہیں وہ ان صنعتوں کی ترقی میں سرمایہ لگائیں۔ اس طرح سہ گونہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اس اقدام میں نوّے کروڑ مسلمانوں کے معاشی فوائد بھی چھپے ہوئے ہیں: —

ان اقدامات کے ذریعہ حاصل ہونے والے بعض اہم ترین فوائد یہ ہیں: —

۱۔ مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ جس کے نتیجے میں ایک عام بیداری پیدا ہوگی اور علمی و سائنسی تحقیقات و انکشافات کا ملکہ پیدا ہوگا، جو رفتہ رفتہ اُنھیں ترقی یافتہ قوموں کی صنعتوں میں لا کھڑا کرے گا۔

۲۔ مسلم ممالک اپنی ضروریات میں خود کفیل ہو جائیں گے اور ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کم ہو جائے گا۔

۳۔ مسلم ممالک میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا جو اپنی قومی و ملّی بقا اور تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے۔

۴۔ مسلم ممالک سے جہالت اور بے روزگاری دور ہو جائے گی۔

۵۔ مسلم ممالک میں حقیقی اتحاد کی بنیاد پڑ جائے گی اور وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی اور مددگار سمجھنے لگیں گے۔ اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ جو کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) کا فطری اور ایمانی مظاہرہ ہوگا۔ کیونکہ دینی و ایمانی رشتہ سب رشتوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بہر حال جتنی جلد ہو سکے ان اقدامات کے ذریعہ بڑی طاقتوں کے چنگل سے آزاد ہو کر ہم کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ورنہ دین الٰہی کے غلبے اور اس کے استیلا، و سربلندی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اپنی بنیادی ضرورتوں میں دوسروں کی محتاج بنی رہنے اور کاسۂ گدائی دراز کرنے والی قوم وملت دنیا میں کبھی غلبہ واقتدار کا خواب تک نہیں دیکھ سکتی۔ مسلم ممالک کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے اور اتنی بہترین جغرافیائی پوزیشن عطا کی ہے کہ وہ اس راہ میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بلکہ جو چاہے وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ایک مرکزی آئیڈیالوجی کے تحت باہم متفق ومتحد ہو جائیں۔ اب یہ مرکزی آئیڈیالوجی اور اتحاد باہمی کا یہ بنیادی اور مرکزی ستون سوائے دین الٰہی یا وحدت کلمہ کے اور کیا ہو سکتا ہے! اسی وحدت میں دنیائے اسلام کی تمام دینی ودنیوی بھلائیاں مضمر ہیں۔ اور اسی وحدت کلمہ کے باعث وہ متحد اور سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ دوسری ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جو دنیا کے نوے کروڑ مسلمانوں کو متفق ومتحد کر کے سب کو ایک اور شیر وشکر کر سکے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن بن جاؤ۔ (آل عمران: ۱۳۹)

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ: عزت وبڑائی صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور اہل ایمان کے لیے ہے۔ (منافقون: ۸)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط یقیناً اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ (رعد: ۱۱)

ایٹم بم کی حرمت پر قرآن کا فتویٰ:

اگر مسلمان علوم وفنون کے باب میں امام ہوتے تو وہ منشائے الٰہی کے مطابق "تسخیر اشیاء"

کا صرف افادی پہلو مدنظر رکھتے اور اس کے مضر و ہلاکت خیز پہلوؤں سے گریز عاجت سب کرتے۔ آج حال یہ ہے کہ دنیا کی جنگ باز قومیں دنیا نے انسانیت پر جوہری دجدانی جنگ مسلط کر کے تمام انسانوں کو موت کی نیند سلا دینے کے درپے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ علم اسماء "صالح" ہاتھوں سے نکل کر "غیر صالح" ہاتھوں میں پڑ گیا۔ اور انھیں قابو میں رکھنے والی کوئی موثر طاقت باقی نہیں رہی۔ جب معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو اس کا خطرناک نتیجہ وہی نکلا جس کو لا محالہ نکلنا چاہیے تھا۔ جب کسی برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کا تصور ہی ذہنوں سے نکل گیا تو انسان تمام بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔

یہ موجودہ جنگ باز انسانوں کی بڑی خطرناک روش ہے جو خود ان کے لیے پیام موت کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان کا پورا مستقبل بھیانک اور تاریک نظر آتا ہے۔ یہ دراصل عالم انسانی کا ایک بہت بڑا اور زبردست نقصان ہے جو زوال ملت اسلامیہ کے بعد کے ادوار میں کلیسائی ناعاقبت اندیشیوں کی بنا پر پیش آیا۔ اور اب قیادت کے اس خلا کو پر کرنا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک دین ابدی کی فکری و نظریاتی قیادت کا تعلق ہے وہ اس مسئلے میں بھی پوری طرح عالم انسانی کی رہنمائی کر کے ایسے خطوط متعین کرتا ہے جن سے معاشرے کی تعمیر ہوتی ہو۔ اور اُن تمام غلط رجحانات پر بندش لگاتا ہے جو معاشرے کی تخریب کا باعث ہوں۔ اور یہ تمام خصوصیات ایک زندہ مذہب اور زندہ کتاب ہی کی ہو سکتی ہیں کہ وہ ہر حال میں عالم انسانی کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بہرحال جن آیات میں موجودات کائنات کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے اُن ہی میں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ظاہری و باطنی تمام نعمتوں کا استعمال نوع انسانی کے فائدے اور کل بنی آدم کی بہبودی کے طور پر ہونا چاہیے۔ مثلاً:

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ط کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ زمین اور اجرام سماوی

میں ہر چیز کو یہ سب کچھ اللہ نے تمہارے (فائدے کے) لیے مسخر کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی (تمام) نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ (لقمان : ۲۰)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ط کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے اور کشتیاں بھی اسی کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں۔ (الحج : ۶۵)

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ٥ اور اس نے تمہاری (بہبودی) کے لیے ارض و سماوات کی تمام چیزوں کو رام کر دیا ہے۔ (یہ سب) اسی کی جانب سے (بطور تحفہ) ہیں یقیناً ان امور میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ : ۱۳)

یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں بعض احکام لفظاً مذکور ہیں اور بعض معنوی اعتبار سے ودیعت کر دیے گئے ہیں جو غور و فکر کے باعث واضح ہوتے ہیں۔ اور اس طرح قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ اور اس قسم کے مسائل کے استنباط میں بنیادی طور پر دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو عقلی حیثیت سے ان دلائل کا وزن ہو۔ اور دوسرے وہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے ہوں۔ اس طرح عقل و نقل دونوں کی نظر میں ان کا قابل تحسین ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے آیات بالا میں غور کیا جائے تو بہت سے جدید مسائل میں بھی ہماری رہنمائی ہو جاتی ہے اور ہمیں تشفی بخش جوابات مل جاتے ہیں۔

پچھلے ابواب میں ظاہری و باطنی نعمتوں کی تفصیل بتائی جا چکی ہے۔[1] اور بتایا جا چکا ہے کہ باطنی نعمتوں کے تحت مادہ اور توانائی کے وہ تمام اسرار آ جاتے ہیں جن سے انسان آج

---

[1] ملاحظہ ہو برہان بابت جون سنہ۱۹۸۱ء۔

فائدہ اٹھاکر بر و بحر کی تسخیر کر رہا ہے۔ جیسے برق، بھاپ اور اٹیمی توانائی وغیرہ۔ اب اس موقع پر غور فرمائیے اوپر کی تمام آیات میں "لکم" [1] کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس میں لام (لَ) عربی زبان وادب کے قواعد کے اعتبار سے "غایت" یا مقصد کے لیے ہے۔ اس طرح یہ لفظ عربی ادب میں عموماً افادیت اور حصول منفعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل لفظ "عَلیٰ" [2] ہے جو نقصان یا ضرر کا پہلو دکھانے کے لیے لایا جاتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:-

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط جو کچھ اُس نے کمایا اس کا فائدہ اُسی کو ہوگا اور جو کچھ اُس نے کیا اُس کا وبال بھی اُسی پر ہوگا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

یہ عربی زبان کی انتہادرجے کی اختصار پسندی کا ایک نمونہ ہے۔ غرض اس لحاظ سے ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ "تسخیر اشیاء" میں دنیائے انسانیت کا فائدہ اور تعمیری پہلو مد نظر رہنا چاہیے۔ پھر لفظ "نعمت" کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے لیے زحمت یا مصیبت نہ بنے بلکہ وہ خدائے رحمان کا عطیہ ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں اُس کی رحمت و رأفت کا مظہر رہے۔

اس لحاظ سے اسلام کی نظر میں جوہری بموں، نیپام بموں، جراثیمی بموں اور دیگر اٹیمی اسلحہ کا استعمال بہت بُرا اور سخت گناہ ہے، جو عالم انسانی کی تباہی و بربادی کا باعث تو ہے ہی مگر یہ بے گناہ اور معصوم انسانوں کی ہلاکت کا باعث بھی ہے۔ تمام بنی نوع انسان اسلامی نقطۂ نظر سے

---

[1] یہ ایک مرکب لفظ ہے، جو دو الفاظ سے مل کر بنا ہے: لَ + کُمْ۔ اس میں پہلا لفظ (لَ) ایک حرف جر (Preposition) ہے اور دوسرا لفظ (کُمْ) ضمیر متصل برائے جمع مخاطب ہے۔ اس مرکب لفظ کے معنی ہوئے: "تمہارے لیے"؛ اور حاصل مطلب ہے: "تمہارے فائدے کے لیے"۔

[2] یہ بھی ایک حرف جر ہے جو "پر" یا "اوپر" کے معنی میں آتا ہے۔

"عیال اللہ" (اللہ کا کنبہ) ہیں۔ لہٰذا وہ ان کی بلا وجہ اور بغیر کسی گناہ کے تباہی و بربادی کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کی نظر میں ہر انسانی جان قیمتی اور قابل احترام ہے؛ بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ کسی انسان کو — کسی جان کے عوض یا بغیر کسی فساد کے — بلا وجہ مارنا اور خواہ مخواہ قتل کرنا گویا کہ ساری انسانیت کو قتل کرنا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط

جس نے کسی شخص کو کسی جان کے بدلے یا فساد کے بغیر جو زمین میں (اس شخص سے پھیلا ہو) قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ (مائدہ : ۳۲)

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ — ۱۹۴۵ء) میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ایک ایک ایٹم بم گرا کر جو خوفناک تباہی مچائی تھی اور لاکھوں بے گناہوں کو سالہا سال تک جس جسمانی اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیا تھا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں[1] اس قسم کی عالمگیر تباہی، بے گناہ انسانوں کو آن کی آن میں موت کی نیند سلا دینا، شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دینا اور نسل کشی بہت ہی معیوب اور سخت گناہ کا فعل ہے، جس کی قرآن حکیم کھل کر اور بہت واضح انداز میں مذمت کرتا ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط

---

[1] یہ دونوں شہر تقریباً ایک ایک لاکھ (یا کچھ زائد) آبادی والے تھے؛ جو بُری طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ اور کُل آبادی تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ مستند رپورٹ کے مطابق: "ہیروشیما میں اسّی ہزار شہری تیس ہزار فوجی ہلاک ہوئے اور چودہ ہزار اشخاص لاپتہ ہو گئے۔ نیز دس ہزار افراد شدید طور پر اور تیس ہزار افراد معمولی طور پر زخمی ہوئے۔" (ایٹم کی کہانی، ص ۱۰۵) یہ زخمی سالہا سال تک سخت اذیت و تکلیف میں مبتلا مختلف ہسپتالوں میں پڑے رہے؛ جن کی جسمانی حالت بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ اور جب وہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دے[1] حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (بقرہ: ۲۰۵)

یہ تھا اس مسئلے کا نظریاتی حیثیت سے ایک مختصر جائزہ۔ مگر عملی حیثیت سے اور عملی دنیا میں اس وقت ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے دیگر ممالک ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور وہ فوجی لحاظ سے کمتر قوموں اور خصوصاً اسلامی ممالک کو ——— بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ——— دھمکاتے رہتے ہیں تو کیا مسلم ممالک کو بھی "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار تیار کرنا چاہیے۔؟

ماہرین کا کہنا ہے کہ جب کسی ملک کے پاس ایسا ہتھیار موجود ہو جس سے دوسرا ملک محروم ہو تو وقت پڑنے پر پہلا ملک دوسرے ملک کے خلاف وہ ہتھیار ضرور استعمال کرے گا۔ مگر جب دوسرا ملک بھی اسی قسم کے ہتھیار سے مسلّح ہو تو پھر پہلا ملک اُس کے استعمال سے احتراز کرے گا۔ چنانچہ امریکہ نے دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے خلاف ایٹم بم اسی وجہ سے استعمال کیا کہ جاپان اس قوت سے محروم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو ایٹم بموں کی تباہی کو دیکھ کر جاپان کے ہوش اڑ گئے اور فوراً ہی اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عقل و منطق کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک بھی اپنے دفاع کی خاطر ایٹمی ہتھیار تیار کریں۔ مگر جب دینی و شرعی نصوص کی طرف نظر جاتی ہے تو اس کی قباحت بالکل واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ فقہائے اُمت کا کام ہے کہ وہ تمام نصوص کو

---

[1] قرآنی الفاظ میں بڑی لچک ہوتی ہے اور وہ جدید سے جدید تر ہر قسم کے مفہوم کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ "کھیتی اور نسل کی تباہی" یا قابلِ کاشت زمینوں اور انسانی نسلوں کو برباد کر دینے کا جو وسیع مفہوم آج پایا جاتا ہے؛ وہ اس آیتِ کریمہ اور اس کے الفاظ کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے۔

سامنے رکھ کر غور کریں کہ آیا "الضرورات تبیح المحظورات" (ضرورت ممنوعات کو بھی جائز کر دیتی ہے) کے کلیے کی رُو سے کم از کم "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے اور اس کی تیاری کی حد تک اس کا جواز نکل سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عبرت اور ایک خوشخبری:

یہ عجیب بات ہے کہ آج روئے زمین پر مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ایک ارب ہے۔ اور چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں دنیا کے نقشے پر نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض تیل کی دولت اور دیگر قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کی بنا پر نہایت درجہ خوش حال ہیں بلکہ دنیا بھر کی جائیدادوں کو خرید رہی ہیں۔ جسے دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ چند ہی سالوں میں گویا کہ وہ ساری دنیا پر قابض ہو جائیں گی مگر جب ایک دوسرے لحاظ سے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود دنیا میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے اور دنیا کا کوئی بھی بڑا ملک انھیں خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ بڑی طاقتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور ان کی کوئی بھی بات نہیں چلتی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت فلسطین اور افغانستان وغیرہ کے حالات ہیں۔ آخر کیا بات ہے کہ اقوام عالم کے دلوں میں اہل اسلام کا رعب و دبدبہ قائم ہونا تو درکنار کوئی انھیں شمار اور گنتی میں بھی نہیں لاتا؟ حالانکہ حدیث شریف میں جن خصائص نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی دیگر انبیاء پر رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیات) کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک دشمنوں پر رعب اور دبدبہ بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے:

عن جابر بن عبد اللہ الانصاری قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أعطیت خمساً لم یعطھن أحد قبلی۔ کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصۃ، وبعثت الی کل أحمر وأسود، وأحلت لی الغنائم، ولم تحل لأحد قبلی. وجعلت لی الارض طیبۃ طھوراً ومسجداً۔ فأیما رجل ادرکتہ الصلاۃ صلّی حیث کان۔ ونصرت بالرعب بین یدی مسیرۃ شھر۔ وأعطیت الشفاعۃ۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے (پیغمبر) کو نہیں دی گئیں: (۱) ہر نبی کی بعثت اپنی ہی قوم کے لیے مخصوص تھی، اور میری بعثت تمام سیاہ و سپید (اقوام) کے لیے ہے (۲) میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے، جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے نبی کے لیے حلال نہیں تھا۔ (۳) میرے لیے پوری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنادی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کے جہاں کہیں بھی (سفر و حضر میں) نماز کا وقت آجائے وہ وہیں پر نماز پڑھ لے۔ (۴) اور مجھے رعب دیا گیا ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک (کارگر ہو سکتا) ہے۔ (۵) اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا ہے[۱]

اس چوتھی خصوصیت کے الفاظ یہ ہیں: "وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيْرَةِ شَهْرٍ" اس کی تشریح میں علامہ محمد طاہر پٹنی تحریر فرماتے ہیں: الرعب: الخوف والفزع قد أوقع الله الخوف فى أعدائه فخافوه من مسيرة شهر وفزعوا منه[۲]

یعنی رعب کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے ہیں، جو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔ لہٰذا وہ آپ سے ایک مہینے کی مسافت (کی دوری) سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔

اس سے مراد متعین طور پر ایک ماہ کی مسافت مقصود نہیں بلکہ اصل میں اس کی شدت وہیبت کا احساس دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال سوال یہ ہے کہ آج دشمنوں کے دلوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ یا مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی کیوں نہیں رہا، جب کہ وہ آپ کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، ۱/۳۷۰-۳۷۱، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

[۲] مجمع بحار الانوار، ۲/۳۳۹، طبع حیدرآباد، ۱۹۷۰ء۔

اور اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم نے دین سے روگردانی تو کی ہی ہے مگر دین کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے میں بھی روگردانی اور اعراض سے کام لیا ہے۔ اگر دین کو اس کے وسیع تناظر یا اس کے صحیح منظر میں دیکھتے تو یہ حقیقت ہم پر پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتی کہ دین کے شعائر اور ان کے دفاع کے لیے بھی بہت زیادہ دوراندیشی اور تمام مادی وسائل اور منصوبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ہم رسول اکرم صلعم کی سیرت طیبہ میں غور کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ آپ جس طرح ایک بہترین ہادی و رہنما اور شارع و قاضی ——— دینی و شرعی اعتبار سے ——— تھے؛ اسی طرح آپ دنیوی اعتبار سے بھی ایک بہترین مدبّر، دوراندیش، سیاست داں اور فوجی کمانڈر بھی تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے آپ حسب ضرورت اپنی کمان اور ڈپلومیسی[1] کا رخ متعین کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور صلح حدیبیہ کے موقع پر نظر آتا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال یہ رعب و دبدبہ ——— جو خصائص نبوت محمدیہ میں سے ہے ——— اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ دین کی حقیقت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھا جائے اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس لحاظ سے مادی ذرائع و وسائل کے حصول اور ان کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی اقدار سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ جب تک مادی حیثیت سے بھی خود کو طاقتور نہ کیا جائے، دشمنوں پر رعب طاری نہیں ہو سکتا اور کائناتِ ارضی کی تسخیر عمل میں نہیں آسکتی۔ جس کی پیشین گوئی مسلم شریف کے

---

[1] موجودہ دور کی گندہ ڈپلومیسی نہیں جس میں جائز و ناجائز کی تمیز بالکل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب تدبر و ہوشیاری کی حکمت عملی اور بیدار مغزی ہے۔ یہ لفظ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اور اس مفہوم کی ادائیگی کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ مشکل نظر آتی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے (پیغمبر) کو نہیں دی گئیں: (۱) ہر نبی کی بعثت اپنی ہی قوم کے لیے مخصوص تھی، اور میری بعثت تمام سیاہ وسپید (اقوام) کے لیے ہے۔ (۲) میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے، جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے نبی کے لیے حلال نہیں تھا۔ (۳) میرے لیے پوری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنادی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کے لیے جہاں کہیں بھی (سفر وحضر میں) نماز کا وقت آجائے وہ وہیں پر نماز پڑھ لے۔ (۴) اور مجھے رعب دیا گیا ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک (کارگر ہو سکتا) ہے۔ (۵) اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا ہے۔[۱]

اس چوتھی خصوصیت کے الفاظ یہ ہیں: "وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيْرَةِ شَهْرٍ" اس کی تشریح میں علامہ محمد طاہر پٹنی تحریر فرماتے ہیں: الرعب: الخوف والفزع، قد أوقع اللہ الخوف فی أعدائه مخافة من مسيرة شهر وفزعوا منه[۲]

یعنی رعب کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے ہیں، جو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔ لہٰذا وہ آپ سے ایک مہینے کی مسافت (کی دوری) سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔

اس سے مراد متعین طور پر ایک ماہ کی مسافت مقصود نہیں بلکہ اصل میں اس کی شدت وہیبت کا احساس دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ آج دشمنوں کے دلوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ یا مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی کیوں نہیں رہا، جب کہ وہ آپ کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔

---

۱ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، ۱/۳۷۰-۳۷۱، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

۲ مجمع بحار الأنوار، ۲/۳۳۹، طبع حیدرآباد، ۱۹۷۰ء۔

اور اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم نے دین سے روگردانی تو کی ہی ہے مگر دین کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے میں بھی روگردانی اور اعراض سے کام لیا ہے۔ اگر دین کو اس کے وسیع تناظر یا اس کے صحیح منظر و پس منظر میں دیکھئے تو یہ حقیقت ہم پر پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتی کہ دین کے شعائر اور ان کے دفاع کے لیے بھی بہت زیادہ دور اندیشی اور تمام مادی وسائل اور منصوبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ہم رسول اکرم صلعم کی سیرت طیبہ میں غور کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ آپ جس طرح ایک بہترین ہادی و رہنما اور شارع و قاضی — دینی و شرعی اعتبار سے — تھے؛ اسی طرح آپ دنیوی اعتبار سے بھی ایک بہترین مدبّر، دور اندیش، سیاست داں اور فوجی کمانڈر بھی تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے آپ حسب ضرورت اپنی کمان اور ڈپلومیسی[1] کا رخ متعین کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور صلح حدیبیہ کے موقع پر نظر آتا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال یہ رعب و دبدبہ — جو خصائص نبوت محمدیہ میں سے ہے — اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ دین کی حقیقت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھا جائے اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس لحاظ سے مادی ذرائع و وسائل کے حصول اور ان کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی اقدار سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ جب تک مادی حیثیت سے بھی خود کو طاقتور نہ کیا جائے، دشمنوں پر رعب طاری نہیں ہو سکتا اور کائناتِ ارضی کی تسخیر عمل میں نہیں آسکتی۔ جس کی پیش گوئی مسلم شریف کے

---

[1] موجودہ دور کی گندہ ڈپلومیسی نہیں جس میں جائز و ناجائز کی تمیز بالکل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب تدبر و ہوشیاری کی حکمت عملی اور بیدار مغزی ہے۔ یہ لفظ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اور اس مفہوم کی ادائیگی کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ مشکل نظر آتی ہے۔

اسی باب کی ایک دوسری حدیث میں اس طرح کی گئی ہے :

" حضرت ابوہریرہ رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا : میں جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے رعب دیا گیا ہے۔ اور جب کہ میں سو رہا تھا زمین کے خزانوں کی کنجیاں لائی گئیں اور میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ ابوہریرۃ رض نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم تو رخصت ہو گئے اور تم ان خزانوں کو نکال رہے ہو[1]

اس حدیث میں " فَوُضِعَتْ بَیْنَ یَدَیَّ " (یہ کنجیاں میرے سامنے رکھ دی گئیں) کے الفاظ ہیں۔ اور ایک دوسری حدیث میں " فَوُضِعَتْ فِی یَدَیَّ " (یہ کنجیاں میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئیں)[2] کے الفاظ موجود ہیں مگر دونوں کا حاصل ایک ہے۔

یہ پیش گوئیاں اگرچہ صحابہ کرام رض کے دور میں ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں،[3] جب کہ انھوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو پاش پاش کر کے اس دور کے خزائن ارضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر عمومی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات قیامت تک ہر دور میں صادق آسکتی ہے[4]۔ اس اعتبار سے یہاں بیان دونوں فقروں: (۱) مجھے رعب دیا گیا ہے، اور (۲) زمین کی کنجیاں میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئی ہیں، کے درمیان بہت گہرا ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ جس کی ترتیب یوں ہو گی :

۱۔ رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے خود کو طاقتور بنانا ضروری ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، ۱/۳۷۱-۳۷۲۔

[2] ایضاً، ۱/۳۷۲

[3] ملاحظہ ہو مسلم کی شرح نووی، برحاشیہ صحیح مسلم، ۱/۱۹۹، رشیدیہ دہلی۔

[4] ان احادیث میں " خزائن الارض " کے الفاظ مذکور ہیں۔ اگر اس پیش خبری کا دائرہ صرف صحابہ کرام رض ہی کے دور تک محدود رکھا جائے تو " الارض " سے مراد ایک معہود ذہنی کے طور پر محض ایک مخصوص خطۂ ارض ہی ہو سکتا ہے، جب کہ وسیع معنی میں (بطور استغراق) اس سے پورا کرۂ ارض بھی مراد ہو سکتا ہے۔

۲۔ خود کو طاقتور بنانے کے لیے مادی آلات و وسائل سے بھی خود کو لیس کرنا ضروری ہے۔

۳۔ مادی آلات و وسائل میں ترقی ہی کے باعث ممالک فتح ہوتے ہیں اور سائنسی نقطۂ نظر سے خزائن ارض ہاتھ آتے ہیں۔

اس رعب و دبدبے کے اُٹھ جانے کے باعث آج ملّت اسلامیہ کی جو ذلت و خواری دنیا بھر میں ہو رہی ہے اُس پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حالات آج ہر شخص اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں صراحتاً اس کی بھی پیش خبری حیرت انگیز طور پر ان الفاظ میں ملتی ہے:

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ (دنیا کی) تمام قومیں تم پر (متحدہ طور پر) ٹوٹ پڑیں، جس طرح کہ کھانا کھانے والے برتن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ کیا اُس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم اُس وقت بہت زیادہ تعداد میں ہو گے لیکن تم جھاگ (غُثَاء) کی طرح ہو گے، جس طرح کہ سیلاب کی وجہ سے (پانی پر جھاگ آجاتا ہے۔) اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری (وَھَن) ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ کمزوری کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔"[1]

اب یہاں پر دو چیزیں ہو گئیں: ایک تو دشمنوں کے دلوں سے ہمارے خوف یا رعب و دبدبے کا جاتا رہنا اور دوسرے خود ہمارے دلوں میں "وَھَن" (موت کی محبت یا لقائے الٰہی کے جذبہ و شوق[2] کے مقابلے میں دنیا کی محبت اور اُس سے پیار) پیدا ہو جانے کے باعث ان میں اغیار کا خوف داخل ہو جانا۔ گویا کہ ترتیب معکوس ہو گئی اور مقصد ہی الٹ گیا۔ لہٰذا اب جب تک کہ پھر دوبارہ موجودہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، ۴/۴۸۴-۴۸۵، مطبوعہ حمص (سوریہ) ۱۹۷۳ء۔

[2] اس سے مراد دین اور اُس کے تمام تقاضوں پر عمل پیرائی کا جذبہ ہے۔

جب تک وہن دور نہ ہوگا ہمارے حالات کبھی معمول پر نہیں آسکتے۔ بالفاظ دیگر جب تک کہ موجودہ مسلمانوں کے دلوں سے "وہن" دور نہیں ہوگا اغیار کے دلوں میں اُن کا "رعب" بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک چیز نکلے گی تو دوسری چیز داخل ہوگی۔ یہ ہمارے زوال وادبار کے اسباب ومحرکات کی بالکل صحیح صحیح نشان دہی ہے جو اس حدیث شریف میں ایک اعجازی انداز میں اور محض ایک لفظ کے ذریعہ نقاب کشائی کر دی گئی ہے۔ گویا کہ وہ ہم کو موجودہ طوفانی بھنور سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بتارہی ہے۔

لہٰذا ہمیں دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام ذاتی اغراض ومقاصد اور تمام دنیوی خواہشات کو ترک کر کے نیز نسلی، قومی، لسانی اور جغرافیائی ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر محض دین الٰہی کی سربلندی اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنی چاہیے۔ تب کامیابی ہمارے قدم چومے گی، نصرت الٰہی شامل حال ہوگی اور اغیار کے دلوں میں اللہ ہمارا رعب ودبدبہ بھی ڈال دے گا اور صلے کے طور پر ہم کو دنیا بھی عطا کرے گا۔ مگر دنیا اصل مقصود نہ رہے۔

احادیث ہی کی پیش گوئی کے مطابق اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے ذریعہ ایک ایسا وقت بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان ایسا موجود نہ رہے گا جس میں اسلام فاتحانہ طریقے سے داخل نہ ہو چکا ہو، اور ہر کوئی اسلام کے غلبے کو محسوس طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنا سر نیاز جھکا نہ دے۔

لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ کلمۃ الاسلام بعزّ عزیز وذل ذلیل، امّا یعزّہم فیجعلہم من اہلہا، أو یُذلّہم فیدینون لہا۔ قلت فیکون الدین کلہ اللہ[1]

روئے زمین پر کچا یا پکّا ایسا کوئی مکان باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمے کو

---

[1] مسند احمد، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ص ۱۶، مطبع مجیدی کانپور۔

فرمایا: خواہ کسی آبرومند کے لیے آبرومندانہ طور پر ہو یا کسی بے آبرو کے لیے ذلت کے طور پر۔ (حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ) اس طرح پورا دین اللہ کا ہو جائے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو عزت و آبرو اس طور پر عطا کرے گا کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ یا ذلیل اس طرح بنائے گا کہ وہ اس کا اطاعت گزار یا باج گزار بن جائے۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح ملا علی قاری فرماتے ہیں: "بعز عزیز" سے مراد وہ لوگ ہیں جو برضا و رغبت بغیر جنگ و جدال اسلام قبول کر لیں گے۔ اور "ذل ذلیل" سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو اسلام تو قبول نہیں کریں گے طوعاً و کرہاً ذمی بن کر جزیہ ادا کریں گے یا جنگ کر کے قید و بند کی تکالیف جھیلیں گے۔ اور یہ حدیث اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے: هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ مشرک ناپسند کریں) اور کہا گیا ہے کہ یہ بات آخر زمانے میں پوری ہو گی۔[1]

حاصل یہ ہے کہ ہماری اصل منزل روحانی و مادی دونوں حیثیتوں سے اسلام کی کامل سربلندی ہے، اس طور پر کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام گھرانے اسے تسلیم کر لیں اور اس کے سامنے پوری طرح ہتھیار ڈال دیں۔ اب یہ اسلامی رہنماؤں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس مقصد عظیم کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اور مسلم معاشروں کو کن خطوط پر چلائیں۔ مگر اتنی بات تو طے ہے کہ جب تک درمیان بنیادی خرابی (وھن) موجود رہے گا، مسلم معاشرہ صحیح اور مثبت رخ پر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اور جب تک یہ "وھن" دور نہ ہو گا اسلام کا رعب و دبدبہ قائم نہ ہو سکے گا۔ اور جب تک یہ رعب و دبدبہ قائم نہ ہو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی حیثیت ایک

---

[1] مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۹۸-۹۹، مطبوعہ بمبئی۔

خواب پریشاں کی سی رہ جے گی۔

دین اسلام کے اس عالمگیر اور ہمہ گیر غلبے اور استیلاء کے لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلم ممالک مل کر متفقہ و متحدہ طور پر کوئی لائحۂ عمل بنائیں اور جتنی جلد ہو سکے اپنے سارے قومی اور جغرافیائی اختلافات کو مٹا کر ایک عظیم تر مقصد کی خاطر ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ یا کم از کم اور ابتدائی اقدام کے طور پر باہمی ایک مشترکہ یونین قائم کر لیں۔ اگر مسلم ممالک کے موجودہ اختلافات اسی طرح باقی رہے تو سب کے سب آپس ہی میں دست بگریباں ہو کر اپنی توانائی ختم کر لیں گے اور ایک ایک کر کے سب مٹ جائیں گے۔ لہٰذا اسلام کی دوبارہ سربلندی کا یہ مقصد عظیم کسی بھی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ یہ اسلام کے لیے بہت نازک اور کٹھن وقت ہے جو باہم دست و گریباں ہونے کا نہیں بلکہ باہم شیر و شکر ہونے کا ہے۔

دین اسلام کو صحیح معنی میں غالب اور پوری دنیائے اسلام کو صحیح اور حقیقی معنی میں متحد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "خلافتِ اسلامیہ" کے فراموش شدہ تصور کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ جس کے باعث بے شمار فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا آئندہ سطور میں اس کے متعلق چند گزارشات پیش کی جاتی ہیں۔ (باقی آئندہ)

خدا پرستی اور مادیت کی جنگ

جناب سید کاظم صاحب نقوی، ریڈر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱)

نظامِ کائنات اور وجودِ خدا:

وجودِ خدا کی طرف انسانی فطرت بھی راہنمائی کرتی ہے اور عقل بھی۔ یقیناً اگر فطرت کو طرح طرح کے مخصوص اسباب اس کے راستے سے روگردان نہ بنادیں تو وہ وجودِ خدا کے متعلق انسان کے دل کو مطمئن بنا دیتی ہے۔ فطرت اس عقیدے کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے عقل کو دل سے نہیں دماغ سے سروکار ہے۔ وہ انسان کے دماغ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس سلسلے میں عقل اور فطرت کے درمیان اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فطرت کی راہنمائی کا دائرہ ہر شخص کی ذات تک محدود ہے۔ مصائب و آلام کے بادل جب انسان کے سر پر گرجتے ہیں، ظاہری اسباب اور ذرائع کے بندھن جب ٹوٹ جاتے ہیں، انسان جب اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے، ہر طرف سے اس کے سامنے مایوسی ہی مایوسی آتی ہے، نجات کی کوئی راہ اور امید کی کوئی کرن دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ یکایک اس کی فطرت اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے کہ اے انسان! نا امید نہ ہو، اس عالمِ بے سر و سامانی میں کوئی با اقتدار ذات ہے جو تجھے نجات دے سکتی ہے۔ ذاتِ الٰہی کی جانب اس فطری کشش کو صرف اس شخص کا دل محسوس کرتا ہے جسے نا امیدیاں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں۔ وہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنی واردات قلبی کو دوسرے کے دل میں ڈال دے قلبی کیفیات سے دوسرے کو آگاہ کیا جاسکتا ہے لیکن انھیں دوسرے کے دلوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

وہ کیفیتیں وجود میں نہیں لائی جا سکتیں، خود بخود مخصوص حالات میں وجود میں آتی ہیں۔

عقلی راہنمائی کی نوعیت اس فطری راہنمائی سے مختلف ہے جس شخص کا دماغ کسی دلیل سے وجودِ خدا کا قائل ہوا ہے اس کا عقیدہ اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ وہ اسی دلیل کے ذریعہ اس بارے میں دوسرے کے ذہن کو بھی مطمئن بنا سکتا ہے۔ وہ جس طرح خود وجود خدا کا معتقد ہے اسی طرح دوسروں کو بھی قائل کر سکتا ہے۔ مختلف قسم کے ادلہ وجودِ خدا تک عقل انسانی کو پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا سرچشمہ ایسے علوم ہیں جن کا احساس اور تجربہ سے تعلق ہے اور کچھ وہ ہیں جن کی بنیاد فلسفہ ہے۔

انسانی زندگی کی تاریخ بہت پرانی اور لمبی ہے۔ ہر شخص ایک مخصوص دماغی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہر ایک کے پاس معلومات کا ایک مخصوص ذخیرہ ہے۔ وہ اپنے علم و فہم کے مطابق خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ علمی اور فلسفی ادلہ کی مدد سے اس کے متعلق طرح طرح کے فیصلے کرتا ہے، یہ تصور غلط ہے کہ خدا کے... ہونے یا نہ ہونے کے متعلق فیصلہ کرنا دشوار ہے، اتفاق سے وہ آسان اور بہت آسان ہے۔ یہ عالم کائنات درہم برہم اور غیر منظم نہیں ہے، اس کا نظامِ وجود خدا کی انتہائی مضبوط دلیل ہے جو مجموعی طور پر ہر ایک کے مطمئن بنانے کے لیے کافی ہے۔ درحقیقت موجوداتِ عالم ایک ایسی کتاب کے مانند ہیں جس کا ہر ہر صفحہ بلکہ ہر ہر سطر اس کے مرتب اور منتظم ہونے کو بتاتی ہے۔ قرآن مجید اور عظیم المرتبت راہنمایانِ دین نے صاحبانِ عقل کو بڑے پرزور انداز سے اس کتاب کے غور سے پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ انھوں نے موجوداتِ عالم کے حیرت انگیز نظم و ترتیب کے کچھ نمونے بھی پیش کر دیے ہیں تاکہ نکتہ رس اشخاص کتاب خلقت کو پڑھتے اور اس کے دل میں چھپے ہوئے اسرار و رموز کی چھان بین کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

ارشاد قرآنی ہے:

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ "اے رسول! تم ہمارا یہ حکم لوگوں کو سنا دو کہ

اس کا حق ہے کہ وہ غور کریں کہ ان آسمانی کُروں اور خود کرۂ زمین میں کیسی کیسی چیزیں اعمال کے وجود میں کیسے کیسے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔" (یونس - ۱۰۱)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

"یقیناً زمین اور دوسرے آسمانی کُروں کی پیدائش میں، دن و رات کے پیچھے بعد دیگرے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو سمندروں کی سطح پر لوگوں کے لیے مفید اشیاء لے کر چلتی ہیں۔ ان بارشوں میں جو بلندیوں سے زمین پر ہوتی ہیں۔ جن سے خدا مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے جن کے آغوش میں ہر قسم کے چوپائے اس نے پھیلا دیے ہیں، ان بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان حکم خدا کے فرماں بردار ہیں، اس کی قدرت، حکمت اور عظمت کی نشانیاں ہیں صاحبان عقل کے واسطے۔"

عربی زبان میں "رویت" اور "نظر" کے معنی میں فرق ہے۔ رویت کے معنی ہیں آنکھ سے دیکھنا لیکن "نظر" علمی نگاہ کو کہتے ہیں۔ نظر، یعنی غور و خوض کرنا۔

قرآن اور قرآنی تعلیمات کے علمبرداروں نے کائناتِ عالم کے متعلق لوگوں کو غور و خوض کرنے کی دعوت کیوں دی۔؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی ذہانت کے مطابق ان موجودات میں جو نظم و ضبط کے چمکتے ہوئے نمونے موجود ہیں انھیں دیکھ سکے۔ وہ اس حیرت انگیز نظم کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ بغیر کسی صاحب عقل و شعور طاقت کے پیدا کیے وجود میں نہیں آسکتا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ اندھا۔ بہرا۔ گونگا۔ بے حس۔ بے زبان۔ بے شعور مادہ خود اپنے کو اس طرح منظم اور مرتب کرے۔

نیچرل سائنس کے گوناگوں شعبے ہیں۔ اس کی ہر شاخ درحقیقت اس عالم خلقت کے کسی

ایک گوشے کے نظم و ترتیب کو نمایاں کرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان نے ان موجودات کے بہت سے سربستہ رازوں کا پتہ چلا لیا ہے۔ اس کے مجہولات کو ہمالیہ کے مانند ہیں۔ اس نے اس کی بہت سی اونچی اونچی چوٹیاں فتح کرلی ہیں۔ اس کی حیرت انگیز علمی کامیابیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ اس نے اس عالم کے تعجب انگیز اور بال سے زیادہ باریک نظم و ترتیب معلوم کرنے کے لیے غیر معمولی انتھک کوششیں کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان کا علم اس کی جہالت کے بہ نسبت کم اور بہت کم ہے۔

یہ علوم طبیعیہ صاف صاف ہمیں دو باتیں بتاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ یہاں تک کہ وہ جسے سائنسداں اپنی زبان میں ایٹم کہتے ہیں انتہائی مرتب اور منظم ہے۔ ہر چیز ایسے اصول اور قوانین کی پابند ہے جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ عالم وجود کا یہ عجیب و غریب نظم و ضبط پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ کسی صاحب عقل و شعور طاقت کی کرشمہ سازی ہے، وہ خود بخود وجود میں نہیں آگیا ہے۔

اس دلیل کی عمارت مندرجہ ذیل ستون پر قائم ہوئی ہے:

الف۔ کوئی چیز از خود پیدا نہیں ہو سکتی:

ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئے۔ پہلے معدوم اور پھر موجود ہو اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ علت و معلول کا اصول عمومی اور ہمہ گیر ہے۔ غالباً یہ اصول بدیہی ہے۔ ہر شخص بغیر غور و خوض کیے اس کی تصدیق کے لیے تیار ہے۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ جو چیز کسی وقت میں نہ ہو وہ بعد میں خود بخود بغیر کسی علت و سبب کے وجود میں آجائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تین چار برس کے بچے گویا سوال اور پوچھ گچھ کا پتلا ہوتے ہیں۔ وہ کسی آواز کو سن کر فوراً اپنے بزرگوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ کس کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے؟ جب کوئی درخت ان کی آنکھوں کے سامنے گر جاتا ہے۔ کوئی مکان ڈھے جاتا ہے تو وہ فوراً دریافت کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دماغ میں یہ بات پیوست ہے کہ کوئی چیز پہلے نہ ہو وہ بعد میں بغیر کسی علت اور سبب کے موجود نہیں ہوتی ہے۔

ب- کسی شے پر سرسری نظر نہ کیجیے:

انسانی عقل نے ناقص اور کمزور ہونے کے باوجود اس عالم کائنات کی اکثر و بیشتر چیزوں کو انتہائی منظم و مرتب پایا ہے۔ تجربہ گاہوں، رصد خانوں اور علمی مرکزوں میں جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس نظام کا پتہ چلائے جس کے تمام موجودات پابند ہیں، ان اسرار و رموز کو معلوم کرے جو ان کے دل میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عالم خلقت کے راز ایک ناپیدا کنار دریا کے مانند ہیں۔ انسان اپنی حیرت انگیز ریسرچ کے ذریعہ اس میں پیر کر صرف چند گز طے کر سکا ہے۔ اسے ابھی علوم طبیعیہ کی صرف الف۔ ب آئی ہے۔ علم و دانش کے میدان میں انسان جتنا جتنا آگے بڑھ رہا ہے اس عالم خلقت کے متعلق اس کی حیرانی میں برابر زیادتی ہو رہی ہے۔ اسے اپنی جہالت اور ناواقفیت کا زیادہ سے زیادہ اندازہ ہو رہا ہے۔ بلا شبہ اس کے مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ آج ایک چھوٹے سے ذرّے سے لے کر کہکشاں تک، ایک حقیر جرثومہ سے لے کر انسان تک اس کی نظر میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے اقرار ہے کہ وہ بہت سی باتیں نہیں جانتا۔ سائنسداں کبھی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنے مفروضات کو واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہنائیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ حقائق سے نزدیک ہوتے ہیں حقیقتیں ان سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سائنسدانوں کے ایسے اقوال کثرت سے موجود ہیں جن میں اپنے معلومات کے انتہائی محدود ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے۔ گویا کہ علم ایک سیڑھی کے مثل ہے جس کی صرف چند سیڑھیاں انسان نے طے کی ہیں۔ اسی لیے جب ریاضیات کے مشہور و معروف ماہر آئن اسٹائن (Einsteton) سے اس عالم میں جب کہ وہ اپنے کتب خانہ کی سیڑھی کے پاس کھڑے ہوئے تھے پوچھا گیا کہ آپ کے معلومات کو آپ کے مجہولات سے کیا نسبت ہے تو انھوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ ان دونوں کے درمیان وہی تناسب ہے جو اس چھوٹی سی سیڑھی اور آسمانوں کی اس غیر محدود فضا کے درمیان ہے۔ میں نے ابھی علم کی چند سیڑھیاں طے کی ہیں۔ انسانی معلومات انتہائی کم اور ناقص ہونے کے باوجود ان کا بہت مختصر حصہ

یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ موجودہ عالم کا یہ پیچیدہ نظم و ضبط خود بخود بغیر کسی صاحب عقل و علم طاقت کے پیدا کیے وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دلیل اسی وقت مکمل ہوگی جب اس عالم کائنات کے حیرت انگیز نظم و ترتیب کے کچھ نمونے بھی پیش کر دیے جائیں۔

درحقیقت معرفتِ خدا کی کنجی یہ ہے کہ کوئی چیز ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی معمولی ہو اسے ہم سرسری طور سے نہ دیکھیں۔ کیونکہ یہی حقیر موجودات اور معمولی واقعات ہیں جو بڑے سے بڑے عظیم علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پائے ہیں۔ عام طور سے بلند پایہ مفکرین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو سرسری طور سے نہیں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی حقیر اور معمولی واقعات سے بڑے بڑے اہم نتائج نکالے ہیں۔

نیوٹن (Newton) نے درخت سے ایک عدد سیب گرنے سے ہمہ گیر قانون جذب و کشش کا انکشاف کیا۔ یونانی مفکر ارشمیدس نے محسوس کیا کہ ان کا جسم پانی میں پہنچ کر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ "تعادل مایعات" کا اصول انھوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ گیلیلیو (Galileo) نے ایک مذہبی تقریب میں دیکھا کہ ایک جھاڑ ان کے سر پر ہل رہا ہے۔ اسی کو دیکھ کر انھوں نے سقوط اجسام کا اصول ایجاد کیا۔ بہت سے لوگوں کے سامنے درختوں سے پھل گرتے ہیں۔ انھیں پانی میں اپنا جسم ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ چھت میں لٹکے ہوئے جھاڑوں کو وہ ہوا چلنے کی وجہ سے حرکت میں دیکھتے ہیں۔ لیکن ان واقعات سے وہ ان نتائج تک نہیں پہنچتے جن نتائج تک نیوٹن، ارشمیدس اور گیلیلیو پہنچے۔ اسی لیے قرآن مجید ان لوگوں کو خدا کا حقیقی بندہ سمجھتا اور کہتا ہے کہ جو اس عالم خلقت کے متعلق غور و خوض کریں اور اسے سرسری طور سے نہ دیکھیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا

عذاب النار ○ (آل عمران - ۱۹۰-۱۹۱)

۲- نظم و ترتیب - یعنی چہ ؟

اس عالم کا منظم اور مرتب ہونا اگرچہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ڈھکی چھپی ہو۔ لیکن مندرجہ ذیل امور کی طرف متوجہ ہونے کے بعد کائنات کا منظم اور مرتب ہونا بہت نمایاں طور سے سامنے آجاتا ہے۔

۱- ہر جاندار کے وجود میں آنے کے لیے اور باقی رہنے کے واسطے کچھ خاص شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ایک سبز و شاداب درخت کے اگنے اور اس کے پھلدار ہونے کے لیے لازم ہے کہ بیج کسی ایسے مقام پر بویا جائے جہاں کی زمین، ہوا اور گرمی کا درجہ اس کے مناسب ہو۔ بغیر اس کے نہ وہ بروقت غذا حاصل کر سکتا اور نہ سانس لے سکتا ہے۔ اگر مخصوص حالات اور شرائط نہ موجود ہوں تو وہ دانہ ہرگز روئیدہ نہیں ہوگا، بیج نیست و نابود ہو جائے گا، اس میں اکھوا نہیں پھوٹے گا۔ کسی درخت کی زندگی کچھ ایسے تکوینی اصول کے ماتحت ہوا کرتی ہے جن کے دائرے میں اس کی جڑ سے لے کر تنے تک، شاخوں سے لے کر پتیوں تک سب چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ ہر طرح کے حالات و شرائط میں کسی بیج کا درخت کی صورت میں آنا ممکن نہیں ہے۔

۲- کہیں یہ نظر آتا ہے کہ ہر چیز کا ایک اثر اور اس کی ایک خاصیت ہے جسے اگر اس سے الگ کر دیا جائے تو وہ نیست و نابود ہو جائے گی۔ نمونے کے طور پر انسان کے بدن کو لے لیجیے جعفر بن ابی طالب کے بقول وہ خود ایک عظیم الشان عالم ہے۔ یہ انسان جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضا دانستہ یا نادانستہ طور سے اس کے ساتھ ہم آہنگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر اس جسم پر معمولی سی خراش لگ جاتی ہے تو فوراً خون کے سفید جزوے ایک منظم و وفادار جنگی فوج کی طرح دشمن کے مقابلے کی غرض سے اسی جگہ اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

۳- اس عالم کائنات پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک جاندار کے اجزا کے درمیان تعاون اور باہمی امداد کارفرما ہو بلکہ یہ ہم آہنگی پورے کرۂ زمین کے موجودات

بلکہ اس سے بڑھ کر مختلف آسمانی کروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ سورج چمکتا ہے، پانی بخارات کی شکل اختیار کرتا ہے، ہوا بادلوں کو ادھر ادھر حرکت دیتی ہے، کہیں موسلا دھار یا ہلکی بارشیں ہوتی ہیں، کہیں روئی کے گالوں کی طرح برف گرتی ہے۔ تب جا کے درختوں اور پودوں میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔

مذکورۂ بالا باتوں کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد یقیناً یہ سمجھ میں آجانا چاہیے کہ کسی چیز کے منظم اور مرتب ہونے سے کیا مراد ہے۔؟

د۔ ارادی اور غیر ارادی :

ہمیں دو طرح کے افعال اپنی آنکھوں سے نظر آتے ہیں، جنھیں دیکھتے ہی بغیر غور کیے فوراً ہم فیصلہ کر دیتے ہیں کہ ان میں سے کون ارادہ و اختیار اور عقل و شعور کا نتیجہ ہے ؟ کون غیر ارادی، غیر اختیاری اور عقل و شعور کی پیداوار نہیں ہے ؟ اس فیصلے میں کسی سلیم الطبع اور عقلمند آدمی کو دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

دونوں قسم کے کاموں کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

آپ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ دو آدمی دو کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے دو میزیں اور ان پر ٹائپ کی دو مشینیں رکھی ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ اردو زبان کے شاعر غالب کی اس شہرۂ آفاق غزل کو ٹائپ کریں جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ان دونوں میں سے ایک پڑھا لکھا اور آنکھوں والا، اس کے برخلاف دوسرا اَن پڑھ اور اندھا ہے۔ پہلا تعلیم یافتہ شخص جس کی آنکھیں صحیح و سالم ہیں کام شروع کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "یہ" پھر "نہ" پھر "تھی" ٹائپ کرتا ہے جس سے مجموعاً "یہ نہ تھی" کا جملہ بنتا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ پوری غزل بالکل صحیح طور پر ٹائپ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔

اس کے بعد جاہل اور نابینا شخص اپنی مشین چالو کرتا ہے۔ چونکہ وہ حرف نہیں پہچانتا اور نہیں سکتا لہٰذا بہت سے صفحے یا بہت سی سطریں خراب کرنے کے بعد کاغذ پر کچھ مہمل، بے ربط فقرے آپ کو دکھائی دیں گے۔ یہ دونوں طرح کے صفحے جس عقلمند آدمی کے سامنے پیش کیجیے وہ فوراً فیصلہ کر دے گا کہ پہلا کاغذ ایک پڑھے لکھے، سمجھدار آدمی کا ٹائپ کیا ہوا ہے اور دوسرے کاغذ کا ٹائپ کرنے والا ان پڑھ بیوقوف ہے۔ اگر ہزار نابینا جاہل لاکھوں کاغذ سیاہ کر کے چاہیں کہ غالب کی غزل کا صرف ایک نسخہ بالکل صحیح صحیح ٹائپ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان کے پاس علم و بصارت نہیں ہے۔ جہاں کہیں وہ پہلا کاغذ آئے جس پر غالب کی غزل صحیح طور سے ٹائپ ہے وہ یہی کہے گا کہ اسے کسی پڑھے لکھے آدمی نے پورے عقل و شعور اور ٹائپ کیا ہے۔ وہ ہرگز اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کرے گا کہ کسی جاہل ٹائپ کی مشین کے تکموں پر انگلیاں مارتے رہنے سے یہ کبھی وہ تصور نہیں کر سکتا کہ کسی ناسمجھ کمسن بچہ کو یہ مشین کمرے سے کھیلنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں یہ غزل اس کاغذ پر ہمارے

ہری اور کھوج کا زمانہ ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا مستقل مشغلہ ہے اونچے ٹیلوں کے دلوں میں اتر کر ان کی تہوں کا جائزہ لینا۔ ان کے سینہ میں جہاں انھیں کا واک پتھر ملتے ہیں وہاں زنگ خوردہ گھسے طرح طرح کے برتن بھی دکھائی دیتے ہیں، ٹوٹی ہوئی دیواریں، ان پر مٹے بڑے موٹے ستون، مخصوص طرز کی محرابیں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں دکھائی دیتی وہ بڑے شوق اور انتہائی باریک بینی سے ان کے معائنے میں لگ جاتے ہیں۔ ان آثار کی رفتہ قوموں کا تمدن چمکتا ہوا نظر آتا ہے

جب ماہر افلاک عظیم الشان دوربینوں کے ذریعہ کرۂ مریخ کے مناظر اور اس کی سطح پر سفید سفید ابھرتی ہوئی لکیریں دیکھتے تو کہتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ اس کرے میں کوئی انتہائی مہذب اور متمدن قوم رہتی ہے جو ہماری طرح کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اس نے اپنی کھیتیاں سینچنے کے لیے باقاعدہ نہریں بنائی ہیں۔

ان مثالوں کی روشنی میں ایک عمومی اور ہمہ گیر اصول بنانا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی چیز کی شکل و صورت اور ساخت سے پتہ چلے کہ اس کے وجود کا کوئی مقصد ہے، اس کے مطابق اس میں نظم و ترتیب ہے تو اسے بلاشبہ کسی ایسے شخص کی کارگزاری ماننا پڑے گا جو سوچ سمجھ کر ارادے اور اختیار کے ساتھ اسے وجود میں لایا ہے۔ اس کے برخلاف ہر وہ چیز جس کے وجود کا کوئی مقصد نظر نہ آئے، اس کے مطابق اس میں نظم و ترتیب دکھائی نہ دے، اس کے بجائے اس میں بدنظمی اور بے ربطی ہو تو وہ اتفاقات کا نتیجہ یعنی اس کا کوئی ایسا سبب قرار دیا جائے گا جو عقل و شعور کی صفت سے محروم ہو۔

۲۔ عقل اور نظم کا رابطہ:

نظم و ترتیب کسی مقصد اور غرض کے ماتحت کسی شے کا ہونا یہ کیوں بتاتا ہے کہ اسے کسی عقل و شعور اور ارادے کی مالک طاقت نے بنایا ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ بے شک ایسا ہی ہے کہ جہاں بھی کسی چیز کے وجود میں نظم و ترتیب، مقصد و غرض دکھائی دیتا انسان فوراً بلا غور کیے فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس کا موجد علم و شعور، ارادے اور اختیار والا ہے۔ یہ اس کا ایسا عقلی فیصلہ ہے جس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ دلیل سے بے نیازی کے باوجود اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اسے بے استدلال چھوڑ دیا جائے۔ براہ مہربانی مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ فرمائیے۔

۱۔ صاف سی سیدھی بات ہے کہ جس طرح کسی چیز کا نہ ہونے کے بعد ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔ اسی طرح اس کے صفات اور خصوصیات جو اس کے اوصاف اور

خصوصیات کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا کہ انسان کی بے آلائش فطرت کا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی چیز خود بخود بغیر کسی علت کے عدم سے وجود میں نہیں آتی ہے۔ جب ہمیں کوئی موٹر کسی چوڑی چکلی سڑک پر دوڑتی نظر آتی تو وہ خود بخود بزبان حال کہتی ہے کہ مجھے کسی نے بنایا ہے۔ میں خود بخود وجود میں نہیں آگئی ہوں۔ یونہی اس موٹر کے خصوصیات بھی اس بات کی پرزور گواہی دیتے ہیں کہ اس کا موجد ان تمام فنون سے واقف ہے جس کا تعلق موٹر بنانے کی صنعت سے ہے۔

میر انیس کا مرثیہ سامنے آنے کے بعد جس طرح کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ادبی شاہکار اتفاقی خود بخود وجود میں آگیا ہے، بلکہ ہر آدمی اقرار کرتا ہے کہ وہ کسی شاعر کا کلام ہے اسی طرح اس کے خصوصیات مثلاً گھوڑے اور تلوار کی تعریف یہ بتاتی ہے کہ میر انیس شہ سواری اور سپہ گری کے فن سے واقف تھے۔ ان کے مرثیوں کے بیشتر حصے گواہی دیتے ہیں کہ وہ انسانی نفسیات سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ ہرگز کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ادبی شاہکار ایسے آدمی کے افکار کا نتیجہ ہے جسے اردو زبان کے خصوصیات کا بالکل پتہ نہ تھا۔ جسے واقعہ نگاری کے اصول رتی بھر معلوم نہ تھے۔ یہ مرثیے اتفاقاً اس کے زبان و قلم سے نکل گئے ہیں۔

یقیناً ہر انشاء پرداز کا مضمون، ہر خطیب کی تقریر بلکہ ہر انسان کا فعل اس کے معلومات کا درجہ اس کے اوصاف۔ اس کے نفسیات۔ اس کی صلاحیتیں بتاتا ہے۔ کسی چیز کا حکیمانہ نظم و ترتیب انتہائی صریح اور واضح گواہی دیتا ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا عقل و شعور، ارادے اور اختیار، طاقت و اقتدار، فنی مہارت اور استادی کا مالک ہے۔

۲۔ یہ بات ہر سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ انتخاب کرنا عقل و تدبر کی نشانی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی باقاعدہ عمارت بنانے کے لیے ہر قسم کے مصالحہ سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے واسطے خاص طرح کا ساز و سامان درکار ہے۔ مثلاً ایک شاندار کوٹھی کی تعمیر کے لیے لوہے، گٹے، سیمنٹ، سنگ، بالو اور لکڑی کی ضرورت ہے۔ کھال، اون، کاغذ، دفتی، کھانے پینے کی چیزوں سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ بھی یقینی ہے کہ عمارتی سامان کی ہر مقدار مفید مطلب نہیں ہے۔ ہر چیز کا مخصوص

اور معین مقدار ہونی چاہیے۔ اگر پانچ حصہ سیمنٹ اور ایک حصہ بالو ملا کر یا خالص سیمنٹ کا مصالحہ تیار کیا جائے تو غالباً وہ کارآمد نہ ہوگا۔ یونہی لوہے کو سریوں کی صورت میں اور لکڑی کو دروازوں، کھڑکیوں کی صورت میں ہونا چاہیے۔ گٹے بھی خاص طرح سے رکھے جائیں گے تب جا کے عمارت تیار ہوگی۔ اگر ہزاروں ٹن لوہا کیلوں کی شکل میں اور لکڑی لٹھوں کی صورت میں، گٹوں کو ہر جگہ کھمبوں کی شکل میں جوڑ دیا جائے تو نہ سلیپ لگ سکیں گے۔ نہ دیواریں کھڑی ہو سکیں گی۔ نہ کہیں ڈاٹیں بن سکیں گی۔ نہ دروازے اور کھڑکیاں وجود میں آئیں گی۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ لگ جانے کے بعد بھی عالیشان کوٹھی کا کیا ذکر، معمولی سا جھونپڑا بھی نہ بن سکے گا جس میں انسان اپنا سر چھپائے۔

کسی عمارت کے دیکھنے کے بعد یہی خاص طرح کا سامان۔ اس کی مخصوص مقدار۔ اس کی معینہ کیفیت اور شکل و صورت وہ ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کے بنانے میں کسی صاحب عقل و شعور کاریگر اور انجینئر کا ہاتھ ہے۔ دنیا میں ہر طرح کا ساز و سامان موجود ہے۔ وہ سب کو چھوڑ کر عمارتی سامان مہیا کرتا ہے پورا گودام نہیں ڈھولاتا۔ بقدر ضرورت رفتہ رفتہ لاتا ہے۔ پھر اسے ایسی صورت میں تبدیل اور مرتب کرتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک ایسی عمارت وجود میں آسکے جو ہر موسم میں رہنے کے قابل ہو۔ جس سے ہمارے تمام ضروریات پورے ہوں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان چاروں مرحلوں میں سے کسی ایک مقام پر بھی عقل و شعور، فنی واقفیت اور کارگزاری کا دخل نہ ہو بلکہ ہم ایسے اتفاقات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں جو ہمارے مقصد سے سازگار ہوں یا اپنا کام اناڑی لوگوں سے لینا چاہیں تو کبھی ہماری آرزو پوری نہیں ہوگی۔ تمام سامانوں کو چھوڑ کر عمارتی سامان کا انتخاب۔ اس کی مخصوص مقدار مخصوص کیفیت۔ خاص طرح سے اسے مرتب اور منظم کرنا ان میں سے ہر قدم عقل و تدبر، ارادہ و اختیار، علم و حکمت اور فنی مہارت کے سایہ میں اٹھنا چاہیے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جنھیں دیکھ کر بغیر کسی غور و خوض کے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہر منظم و مرتب چیز جس کی شکل و صورت بتائے کہ اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد ہے ایسے سبب کی کارگزاری کا نتیجہ

قرار پائے گی جس کے پاس عقل و شعور، علم و ارادہ سب کچھ ہو۔

۳۔ فرانس کے مشہور و معروف دانشور "بلیز پاسکال (Blais Pscal) نے ۱۶۵۴ء میں حساب احتمالات (Probability) ایجاد کیا جس سے بہت سے علوم و فنون میں خصوصیت سے فزکس کے مسائل میں بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اس حساب احتمالات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کوئی منظم اور مرتب چیز خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اسے کسی صاحب عقل و شعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے۔

حساب احتمالات کی وضاحت اور تفصیل یہ ہے۔

فرض کیجیے ایک بلند پایہ علمی کتاب ہمارے سامنے ہے۔ اس کی ضخامت سو صفحے کی ہے ہم نے اس کی جلد کو پھاڑ کر اس کے مرتب اوراق کو تتر بتر کر دیا۔ پھر انھیں اسی غیر مرتب صورت میں کسی اندھے، ان پڑھ شخص کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ دوبارہ انھیں ترتیب وار کتابی شکل میں قرار دے دے۔ چونکہ وہ جاہل اور اندھا ہے اس لیے وہ ان میں سے ایک ورق اٹھائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ورق اول ہونا سو احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔ وہ جاہل اندھا یہ ورق جس نمبر کا بھی ہو اُسے اٹھا کر الگ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ ایک ورق اس امید سے اٹھاتا ہے کہ وہ کتاب کا دوسرا ورق ہو۔ اس کے دوسرے ورق ہونے کا احتمال ۹۹ احتمالوں میں سے ایک ہے۔ بنابریں ایک اور دو کے نمبر ترتیب وار یہ جاہل اندھا قرار دینے میں کامیاب ہو جائے یہ دس ہزار احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے یعنی $\frac{1}{100} \times \frac{1}{100} = \frac{1}{10000}$ ان دس ہزار احتمالوں میں سے ایک مطابق واقع ہے۔ یہ وہ صورت ہے کہ اس اندھے جاہل شخص نے پہلی مرتبہ ورق اول۔ دوسری مرتبہ ورق دوم اٹھایا ہو۔ اسی طرح اگر پھر وہ کوئی ورق، ورق سوم اٹھانے کی غرض سے اٹھائے تو اس کی کامیابی کا احتمال ۹۸ احتمالوں میں سے ایک ہے۔ یعنی پہلے، دوسرے اور تیسرے ورق کا مرتب طور پر نکل آنا دس لاکھ احتمالوں میں سے ایک احتمال ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس بات کا احتمال کہ یہ بیچارہ جاہل نابینا شخص اتفاقی طور پر اس سو صفحے کی

کتاب کو دوبارہ پہلے کی طرح ترتیب دے دے، غیر محدود احتمالوں میں سے ایک کمزور احتمال ہے۔
اگر کوئی شخص کسی مرتب اور منظم چیز کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ اس کا نظم و ضبط اتفاقی طور پر ہے تو اس احتمال کو مذکورہ بالا حساب احتمالات کے ذریعہ انتہائی کمزور کیا جا سکتا ہے۔

کہیں یہ خوش نظمی بد نظمیوں کا نتیجہ نہ ہو!

مادہ پرست وجود خدا کے منکرین کا طبقہ کہہ سکتا ہے:

"سب سے مضبوط اور بنیادی دلیل وجود خدا کو ثابت کرنے کے لیے یہی پیش کی جاتی ہے کہ ہمیں پوری کائنات میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے خاص توازن اور نظم و ضبط دکھائی دیتا ہے۔ ایسا اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل اس دعوے کو اس صورت میں ثابت کرتی ہے کہ جبکہ ہر چیز شروع سے ہی ایسی متوازن اور منظم وجود میں آئی ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ پیدائش عالم کی ابتدا میں ہزاروں ناموزوں، غیر منظم، ناقص، معیوب موجودات ہوں۔ کروڑوں برس کی مدت میں رفتہ رفتہ عیوب اور نقائص دور ہوئے اور بے شمار تغیرات کے بعد تدریجاً وہ اس ارتقاء و کمال کی منزل تک پہنچے۔؟

بنا بریں موجودہ ارتقاء، توازن، تناسب، نظم و ضبط تدریجی ترقیوں کی ایک لمبی زنجیر کی آخری کڑی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ عقل و شعور کے بجائے اتفاقات کی پیداوار ہو۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ خدا پرستوں کا کہنا ہے کہ یہ عالم خود بخود اتفاقاً موجود نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہمیں نظم و ضبط دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہم مادہ پرست اس کے مقابلے میں کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ابتداءً خود بخود ہزاروں غیر منظم، بے فائدہ موجودات، ہزاروں معیوب، ناقص جانور اور درخت پیدا ہوتے ہوں۔ چونکہ وہ مکمل طور سے باقی رہنے کے شرائط کے مالک نہیں تھے لہذا رفتہ رفتہ فنا ہو گئے۔ ان کے صرف موزوں حصے باقی رہ گئے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ یہ صورتیں خود بخود حاصل کر لیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔"

اٹھارھویں صدی کے فلاسفروں سے "ڈینس ڈائیڈرو" (Denis diderot) کا فنا لِیاتی نظریہ تھا۔ وہ کہتے ہیں :

"ہم اس دور میں موجودات کو دیکھتے اور انھیں کامل پاتے ہیں۔ ہمیں اس کی خبر نہیں کہ نیچر کے آغوش میں کتنے ناقص موجودات نے آنکھیں کھولیں؟ رفتہ رفتہ وجود زندگی کے اس درجہ تک پہنچا ہے"

(قصۃ الفلسفۃ الحدیثۃ)

بہرکیف مادہ پرستوں کی ایک جماعت بڑے شدومد سے یہ اعتراض کرتی ہے۔ درحقیقت یہ اعتراض ڈاروِن (Darwin) کے "انتخاب طبیعی" کے نظریہ میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار صرف جانداروں کے متعلق کیا ہے لیکن مادیین نے اس خیال کی چہار دیواری میں تمام موجودات کو داخل کر لیا ہے۔ بعید نہیں کہ ڈاروِن کے نظریے کی بنیاد اسی ہمہ گیر اصول کے اوپر ہو۔

مذکورۂ بالا نقطۂ نظر گوناگوں وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔

۱) حساب احتمالات اس کے منافی ہے۔

آپ کی نظر میں ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ اس عالم میں جب کوئی چیز ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہو تو اس کے مختلف طریقوں سے وجود میں آنے کے احتمالات کا ہمیں حساب لگانا چاہیے۔ اس کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے صحیح اور منظم وجود کے احتمال کی نسبت دوسرے احتمالات سے کیا ہے؟ مثلاً: جس وقت ہم آنکھیں بند کر کے قلم کو صفحۂ کاغذ پر رکھ کر حرکت دیں تو چند احتمال ہیں۔ محتمل ہے کہ اس جنبش کے نتیجہ میں ایک خط مستقیم بصورت الف صفحۂ کاغذ پر ابھر آئے۔ ممکن ہے کہ ایک خط منحنی کھنچ جائے۔ اس کی بھی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ ایک حرف کی پیدائش کے سلسلے میں بہت سے احتمالات ہیں جن میں سے ایک صحیح اور بقیہ غلط ہیں۔ جب ایک حرف کے صحیح طور سے ابھرنے کے لیے بیسوں احتمال ہیں تو ایک مکمل جملے، ایک منظم قصیدے، ایک علمی مضمون، ایک بلند پایہ کتاب کے اتفاقی طور سے۔ قلم کی غیر شعوری حرکت کے نتیجہ میں موجود

ہونے کے لیے احتمالات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔

اس بنا پر ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ نظم کائنات جس طرح بھی پیدا ہوا ہو دفعتاً یا تدریجاً اس دلیل احتمالات کی روشنی میں خود بخود نہیں ہو سکتا، یعنی یہ احتمال اتنا کمزور ہے جو صفر کے برابر ہے۔

بالفرض اگر ہم میں سے کوئی شخص کولمبس (Columbus) کے ساتھ پہلے پہل امریکہ گیا ہوتا۔ وہاں کے باشندوں میں سے کوئی اسے اتفاق سے دکھائی نہ دیتا۔ صرف ایک عظیم الشان شہر کے آثار آنکھوں کے سامنے آتے جہاں رہنے والا کوئی نظر نہ آتا۔ نقط منظم، وسیع سڑکیں، گوناگوں خوبصورت عمارتیں، سبز و شاداب پارک، شہر کے مختلف حصوں میں بلندیوں پر حسین مجسّے سلیقہ سے نصب دکھائی دیتے تو اگر تمام دنیا کے لوگ مل کر اسے یقین دلاتے کہ یہ سب مناظر نیچرل اسباب کا اتفاقی نتیجہ ہیں۔ کروڑوں سال کی طویل مدت میں دھیمی اور تیز ہواؤں ہلکی اور موسلا دھار بارشوں، سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی نے مختلف ناقص اور غیر ناقص نقوش وجود ابھارے۔ ان میں سے صرف یہ آثار اپنے کو باقی رکھ سکے ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ خود بخود نیست ونابود ہو گئے۔ ان موجودات کو کوئی باشعور طاقت منصّہ ظہور پر نہیں لائی ہے تو کیا وہ شخص ان یقین دہانیوں سے رتی بھر متاثر ہوتا؟ کیا اس کے برعکس ہر صاحب عقل اس قسم کی چیزوں کو دیکھ کر یقینی طور سے یہ فیصلہ نہ کر دیتا کہ انھیں کوئی باشعور طاقت اپنے ارادے سے وجود میں لائی ہے؟

یونہی اگر بوعلی سینا کا قانون، ملا صدرا کی اسفار، غفراں مآب کی عماد الاسلام یا کوئی کتاب ہمارے ہاتھ میں دے دی جائے تو کیا ہمیں اس کے متعلق یہ شبہ ہو گا کہ یہ کتاب بے سواد، ان پڑھ لوگوں کے قلم کی لاکھوں جنبشوں کے نتیجہ میں اتفاق سے مرتب ہو گئی ہے؟ یہ بے شمار نسخوں میں سے ایک نسخہ ہے۔ ناقص کتابیں تدریجاً فنا ہو گئیں اور یہ کامل نسخہ باقی رہ گیا۔

شرائط بقا اور شرائط ارتقاء | اگر مادہ پرستوں کا یہ خیال صحیح ہو کہ شروع میں کروڑوں غیر منظم، ناقص

موجودات تھے۔ رفتہ رفتہ وہ باقی رہنے کی صلاحیت سے محروم ہونے کی بنا پر فنا ہو گئے۔ صرف ایسے موجودات باقی رہے جو استعداد بقاء کے مالک تھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تدریجی ارتقا صرف ایسے نظم و توازن کو پیدا کر سکتا ہے جو بقاء موجودات کی پہلی شرط ہو لیکن وہ اُن کے ایسے دوسرے کمالات کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا جو ان کی زندگی میں دخیل اور مؤثر نہیں ہے۔

اس مختصر سی بات کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت موجودات عالم میں ہمیں دو طرح کا نظام اور تناسب دکھائی دے رہا ہے۔ ایک وہ نظم جو ان کی بقا کی شرط ہے۔ یہ نظم اگر قائم نہ رہے تو وہ موجودات نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوسرا انتظام و توازن وہ ہے جو ان موجودات کی زندگی اور بقا میں دخیل نہیں ہے۔ اس کے سایہ میں یہ صرف ترقی کے منازل طے کرتے، پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اس نظم کے نہ ہونے کی وجہ سے موجودات فنا نہیں ہو جائیں گے۔ اس کا نہ ہونا صرف ان کی راحت میں خلل انداز ہوگا۔ انھیں زحمتوں اور دشواریوں سے دوچار کردے گا۔ ظاہر ہے کہ تدریجی ارتقار کو صرف نظم و توازن کی پہلی قسم کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس نظریے کے مطابق ناقص موجودات صلاحیت بقار سے محروم ہونے کی بنا پر فنا ہو گئے اور بقیہ استعداد بقار کے مالک ہونے کی وجہ سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن مادّہ پرست طبقے کے خیال کی روشنی میں نظم موجودات کی دوسری قسم کا کیا سبب قرار دیا جائے گا جس کا ان کی بقار اور زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔؟

اس مطلب کی مزید وضاحت کی خاطر ہزاروں مثالوں میں سے چند مثالیں بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ انسان کے جسم میں بیسیوں ایسی خصوصیتیں دکھائی دے رہی ہیں جن کے نہ ہونے سے اس کی زندگی ہرگز خطرے میں نہیں پڑے گی۔ مثلاً اگر بالوں کی جڑوں کے اردگرد چربی کے غدود نرم کرنے کی غرض سے نہ ہوں۔ اگر آواز کی لہروں کو اکٹھا کرنے کے لیے کانوں کی لویں اور ان کے زاویے نہ ہوں۔ اگر آنکھوں کو گرد و غبار سے بچانے کی خاطر پلکوں کی چلمنیں نہ ہوں۔ اگر امواج

نور کے جمع کرنے کے واسطے آنکھوں کی پتلیوں میں اندھیرا نہ ہو۔ اگر دانتوں کی تین قسمیں نہ ہوتیں سامنے کے دانت کاٹنے کی غرض سے۔ وسطی دانت پھاڑنے کی غرض سے۔ ڈاڑھیں چبانے اور پیسنے کی غرض سے۔ اگر ہمارے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں یہ لکیریں نہ ہوتیں جو چیزوں کو پھسل کر نکل جانے سے روکتی ہیں۔ اگر ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیوں کے یہ موجودہ جوڑ نہ ہوتے جو انتہائی سہولت کا باعث ہیں تو ہرگز انسان مر نہ جاتا۔ صرف زحمت میں گرفتار ہو جاتا۔ اس کی زندگی میں تلخی پیدا ہو جاتی۔ وہ راحت و آرام کے ساتھ زندہ نہ رہ سکتا۔ آیا تدریجی ارتقاء کا اصول انسانی جسم کے اس طرح کے نظم و توازن کی وجہ بتا سکتا ہے۔؟

ب۔ اگر ہماری زمین کے سینے میں طرح طرح کے معدن نہ ہوتے۔ اگر بجلی کی طاقت نہ ہوتی۔ اگر موجودات عالم کے دل میں ایٹمی توانائی نہ ہوتی۔ اگر تمام خشکیاں زمین کے نصف کرۂ جنوبی میں ہوتیں اور تمام سمندر اس کے دوسرے نصف کرۂ شمالی میں واقع ہوتے۔ اگر زمین میں غیر معمولی نشیب و فراز ہوتا۔ اگر تمام دریا اور سمندر ایسے کھاری پانی سے بھرے ہوتے جس کا پینا کسی جاندار کے لیے خوشگوار نہ ہوتا۔ اگر پرندوں کا جسم پروں سے ڈھکا ہوا نہ ہوتا اگر ان کی موجودہ ساخت نہ ہوتی۔ اگر ان کا وزن دوسرے زمین کے جانوروں سے کم نہ ہوتا۔ اگر وہ سب بڑے بڑے چمگادڑوں کی طرح وزنی ہوتے، اگر وہ انڈوں کے بجائے بچے دیتے اور ایسے ہی دوسرے صفات سے متصف ہوتے تو کیا ہم اور وہ فنا ہو جاتے۔؟ ہرگز نہیں۔ فقط آرام کی زندگی نہ بسر کر سکتے۔ اپنی زندگی سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکتے۔

خلاصہ یہ کہ عالم ہستی کا دائرۂ نظم و تناسب ارتقاء تدریجی کے محور بحث سے بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ اس بحث کا محور "انتخاب طبیعی" "بقاء اصلح" ماحول کے غیر مطابق، ناقص موجودات کی فنا کے مسائل کے گرد چکر لگاتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ رخ نظم کے صرف ایک حصہ یعنی کم از کم شرائط حیات کے دائرے میں اپنا مصداق پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی تطبیق ان کمالات، ان دقیق و عمیق باریکیوں پر نہیں ہو سکتی جن کا دخل موجودات کی اصل

زندگی میں بالکل نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا مطلب ایک دوسری مثال سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے:

فرض کیجیے کہ کسی پہاڑ میں متعدد غاروں کے نشانات ہمیں نظر آئے۔ ان میں سے صرف ایک بہت بڑا غار باقی رہ گیا اور بقیہ فنا ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر آپ یہی کہیں گے کہ وہ کچھ نیچرل اسباب و علل کی وجہ سے رفتہ رفتہ مٹ گئے۔ یہ ایک بڑا غار انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کے اصول کے ماتحت باقی رہ گیا کیونکہ اس کا دہانہ بہت وسیع، اس کی گہرائی بہت زیادہ، اس کے پتھر زیادہ مضبوط تھے، لیکن اگر اس غار کی دیواروں پر ابھرے ہوئے خوبصورت تاریخی نقش و نگار دکھائی دیں تو انھیں ہرگز کوئی صاحب عقل انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کے اصول کا نتیجہ نہیں قرار دے گا۔ کیونکہ جو چیز ان اصول کا نتیجہ ہو سکتی ہے وہ فقط اس غار کی بقا ہے۔ یہ مزید خصوصیات جن کے ہونے اور نہ ہونے کی نسبت اس غار کی بقا کے لحاظ سے یکساں ہے، انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کا اصول ان کا سبب نہیں ہے۔ کیونکہ جس چیز کا تعلق اس اصول سے ہے وہ فقط اس غار کا پائیدار اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس سے ان مزید خصوصیات کا کوئی ربط نہیں ہے جن کے وجود اور عدم دونوں کی حیثیت ان کے باقی رہنے کے لحاظ سے یکساں ہے۔ اس بنا پر موجودات عالم کی یہ نزاکت و لطافت، ان کے بارے میں جس باریک بینی سے کام لیا گیا ہے وہ غیر مبہم طور پر بتا رہی ہے کہ زندگی کے ابتدائی شرائط سے بہت بلند سطح پر نقطۂ کمال قرار دیا گیا ہے۔ ان موجودات کو دیکھ کر بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے وجود کا ایک مقصد ہے۔ انھیں گویا کسی سابقہ منصوبہ اور پروگرام کے پیش نظر وجود میں لایا گیا ہے۔

<u>تدریجی ارتقاء کا قائل دکھلائیے!</u> گزشتہ دو اعتراضوں سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی... مادہ پرستوں کے مذکورہ ارشاد میں یہ کمزوری نظر آتی ہے کہ اگر وہ صحیح ہے تو اس زمین کی جو کھدائیاں بنا بر ہوا کرتی ہیں ان کے اندر سے ان ناقص اور ناموزوں موجودات کے ڈھانچے نکلنا چاہئیں جو ان کے نقطۂ نظر کی پرزور تائید کریں۔ جو ہمیں صاف لفظوں میں یہ بتائیں کہ جو مرتب و موزوں

اور منظم چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں انھیں ہزاروں ناموزوں اور غیر منظم موجودات کے درمیان سے چھانٹا گیا ہے۔ لاکھوں برس کی تبدیلیوں کے بعد انھوں نے یہ دیدہ زیب، خوشنما، تمام ضروریات زندگی کے مطابق شکل وصورت پائی ہے۔ لیکن اسے کس کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سمجھا جائے کہ آثار قدیمہ کا زندہ اور جیتا جاگتا علم اس کے خلاف فیصلہ کررہا ہے؟ ہم جتنا جتنا الٹے پیروں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور گزشتہ موجودات کے باقی ماندہ گھسے ہوئے ڈھانچوں کا معائنہ کرۂ زمین کے مختلف طبقات کے سینہ میں کرتے ہیں اتنا اتنا ہمارا یہ عقیدہ مستحکم اور پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب اپنی جگہ انتہائی مرتب اور منظم ہیں۔ ان میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ہو بہو اس زمانے کے موجودات کے مانند نہیں ہیں۔ لیکن ان سے ملتے جلتے ضرور ہیں۔ زندگی کے باقی رہنے کے لیے اس دور کے موجودات کے پاس جو کچھ ہے وہی سب ان کے پاس بھی ہے۔

کیوں جناب اگر ایک اندھے، آرٹ سے ناواقف شخص کے ہاتھ میں پنسل یا قلم دے دیں اور اس سے فرمائش کی جائے کہ اس کاغذ پر طوطے کی تصویر بنادو تو شاید سیکڑوں کاغذ خراب کرنے کے بعد بھی وہ آپ کی فرمائش پوری نہ کرسکے گا۔ یہ ہزاروں کاغذ ردّی کی ٹوکری میں جھونک دینے یا دیا سلائی دکھادینے کے قابل ہوں گے۔ اگر یہ موجوداتِ عالم انسان اور جاندار گونگے، بہرے، اندھے، بے بس، بے عقل نیچرل اسباب کی غیر اختیاری کارفرمائی کا نتیجہ ہیں تو ان کو وجود میں لانے کی خاطر جو لاکھوں یا کروڑوں صاف ستھرے کاغذوں پر کاداک، بے تکی، ناموزوں، غیر منظم لکیروں کو بنا کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا وہ کہاں ہیں؟ زمین کی کس تہ میں دبے ہوئے ہیں۔؟ ہمارے معزز مادہ پرست مفکرین کیوں چپ ہیں۔؟ کس لیے وہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتے۔؟[۵]

---

[۵] یہ سلسلۂ مضامین مندرجۂ ذیل کتابوں سے ماخوذ ہے۔
آفریدگار جہاں: خداشناسی۔ حوارییّن آلالٰہیّین والمادیین۔ جہاں آفرین۔

جنگ آزادی کا مجاہد

مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی

(از جناب ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی۔)

۱۸۵۷ء کی سپاہیوں کی بغاوت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کی جو تاریخ باقاعدہ طور پر تحریر میں آسکی ہے وہ زیادہ تر برطانوی سول اور فوجی افسران کی تحریرات اور تصنیفات پر مبنی ہے۔ ان کے قومی نصب العین اور سیاسی مفاد کی رنگ آمیزی سے قطع نظر کر کے مجموعی طور پر تمام تاریخی مواد میں ایک تاثر مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی بغاوت کے شعلے بہت جلد ایک ہمہ گیر جنگِ آزادی کی آگ میں تبدیل ہو گئے تھے اور اس نے سارے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس جہادِ حریت میں سرفروشانہ طور پر شرکت کرنے والے مسلمان رہنماؤں کے ناموں میں مولوی سرفراز علی اور مولوی احمد شاہ فیض آبادی سرفہرست ہیں۔ اول الذکر نے اپنے خطبات کے ذریعہ عوام میں آزادی کی روح پھونکی اور جنگی حوصلوں کو بڑھاوا دیا۔ جبکہ مولوی احمد اللہ شاہ نے انتہائی حوصلہ شکن حالات میں باغیوں کی جنگی سرگرمیوں کی کمان اپنے ہاتھ میں سنبھال کران کو شکست آشنا جنگی مورچوں سے علیحدہ کر کے گوریلا جنگ کا عملی سبق سکھایا پھر ہر آزمائش اور ہر معرکہ میں انھوں نے نہ صرف صفِ اول میں رہ کران کی رہنمائی کی بلکہ ان کے دلوں میں یہ بات بٹھادی کہ شکست و فتح کے ادنیٰ مقاصد سے بلند تر بھی ایک مقصد ہے اور وہ ہے اپنے دلیش کے سلسلہ میں احساس فرض اور اس کی ادائیگی۔

احمد اللہ شاہ نے اپنی معرکۃ الآراء جنگ کا اس وقت آغاز کیا جب ستمبر ۱۸۵۷ء کی برطانوی افواج کی فتح دہلی سے باغیوں کے حواس پراگندہ تھے۔ ان کی جنگی خدمات اس لیے بھی اعلیٰ قدر

منزلت کی حامل ہیں کہ یہ انہی کا طریقہ کار تھا جس نے ۱۸۵۸ء کے موسم گرما میں انگریزوں کی فاتحانہ جارحیت پر ضربِ کاری لگائی۔ اور ہندوستان کی سرزمین سے ان کے قدم ایک بار پھر اکھڑنے لگے۔ مسٹر مالیسن (Mallison, G. B.) کے حوالہ سے ڈاکٹر ششی بھوشن چودھری اپنی تصنیف "Civil Rebellion in Indian Mutiny" میں لکھتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۸ء تک جنگِ آزادی کا جذبہ ہمہ گیر ہو چکا تھا اور اس کے بعد ایک وقت ایسا آگیا تھا کہ برطانیہ کی طاقت چور چور ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول اور فوجی افسروں کا اثر اودھ کے فساد زدہ علاقہ میں صرف ایک پتلی سی پٹی پر رہ گیا تھا جبکہ اس کے شمالی اور جنوبی علاقے در وبست حریت پسند باغیوں کے ہاتھ میں آ چکے تھے۔ بیگم حضرت محل کے زیر اثر ان قابو یافتہ باغیوں میں ہردت سنگھ، فیروز شاہ، بینی مادھو، مولوی احمد اللہ شاہ، اور ہنومنت سنگھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ششی بھوشن چودھری آگے چل کر احمد اللہ شاہ کے بارہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس وقت فیض آباد کے مولوی کی جنگی خدمات بہت زیادہ بلند مرتبت ہو کر سامنے آئیں۔ ان کے مخصوص طریقہ کار (گریلا جنگ) نے ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی شکست کو فتوحات سے از سر نو آشنا کرایا اس تحریک و عمل کو روبکار لانے میں ان کے معاونین میں محمدی کا راجہ اور لکھنؤ کے عمائد میں سے میاں صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی فیض آبادی کی غیر معمولی جنگی کارکردگی سے عاجز ہو کر انگریز حکام نے ان کے سر کے عوض پچاس ہزار روپیہ کا انعام کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ جب ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو برطانوی فوج شاہجہاں پور پہنچی تو جوابی کارروائی کے طور پر مولوی احمد اللہ نے کرنل ہیل کے فوجی دستہ متعینہ مقامی جیل کو کڑے محاصرہ میں لے لیا۔ ۳ مئی سے ۱۱ مئی تک اس کو ایسا بے دست و پا کیے رکھا کہ مجبور ہو کر سر کولن کیمبل نے جنرل جونس کو کرنل ہیل کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ اس دباؤ سے مولوی احمد اللہ شاہ کو اپنی گرفت ڈھیلی کرنی پڑی اور آخراً وہاں سے بالکل ہٹ جانا پڑا اور صورت حال بے حد نازک ہو گئی۔ اس موقع کے لیے مسٹر مالیسن نے

لکھا ہے۔

"اب باغیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، شہر کا ہر مکان ہماری شکست میں آچکا تھا۔"

اختتامی معرکے کے بے متعلق ڈاکٹر بھوشن نے تحریر کیا ہے،

"مگر اس دوران مولوی کی مدد کے لیے حضرت بیگم اور فیروز شاہ کی کمکیں آ پہنچی تھیں، اور ۱۵ رمئی کو ان کی معیت میں مولوی احمد اللہ شاہ آندھی کی طرح برطانوی مورچوں کی بیخ کنی کر رہا تھا۔ اب سرکولن کیمبل۔ کمانڈر انچیف کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ وہ خود بھاگ کر مولوی کے محاصرہ کی شکار، برطانوی افواج کو رہا کرائے۔ چنانچہ ۱۸ ر مئی کو وہ یہاں پہنچا تو مولوی کے زیر کمان مجاہدوں کی طاقت کمزور پڑ گئی۔ ان کو آس پاس کے رؤساء اور امراء، کی اعانت کا سہارا لینا پڑا ـــــ اس سلسلہ میں گماشتے اور تحریری اپیلیں چاروں طرف بھیجے گئے۔ اس تحریک کے اثرات نمایاں نہ ہو پائے تھے کہ ایک دن پووین کے ایک راج پوت تعلقہ دار نے شاہجہاں پور سے چند میل کے فاصلہ پر مولوی کو گولی کا نشانہ بنا کر پچاس ہزار کی انعامی رقم جیت لی اور اس طرح جنگ حریت کی ہار پر تاریخ نے مہر ثبت کر دی۔"

مولوی احمد اللہ شاہ کی جانبازی اور جنگی اقدامات کی تفصیلات کے لیے جو مواد ہم کو ویرساورکر کی مشہور عالم اور برطانوی دور کی ممنوعۂ اشاعت تصنیف "ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں ملتا ہے وہ اور کہیں یکجا میسر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی حُر کے جذبۂ ایثار و شہادت کی داد ایک سر بکف غازی ہی دے سکتا ہے۔ اس لیے ہم درولبست اس کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس میں سے جستہ جستہ اُن اقتباسات کا ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو مولوی موصوف سے متعلق ہیں۔ تحریک آزادی میں ان کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تصنیف کے باب ۹ میں ویرساورکر رقم طراز ہیں:-

میرٹھ میں بغاوت شروع ہو جانے کی اطلاع آتے ہی فیض آباد میں متعینہ انگریز افسران

میں خوف وہراس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ان کو ڈر یہ تھا کہ مقامی آبادی اور خصوصاً تعلقہ داروں پر جو ظلم کیے گئے تھے ان کا بدلہ بے رحمی سے لیا جائے گا۔ اس لیے ان کے لیے حفاظتی تدابیر پر غور کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اپنے اہل وعیال کو وہ لکھنؤ اس لیے نہ بھیج سکتے تھے کہ تمام راستے پوری طرح انقلابیوں کے ہاتھ میں آچکے تھے، فیض آباد میں رہ کر وہ جنگی تیاری بھی جاری نہ رکھ سکتے تھے کیونکہ وہاں ان کی اپنی فوج تمام تر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔ اس طرح ساری انتقامی اور حفاظتی کارروائیوں کے لیے راستے بند تھے چنانچہ مجبور ہوکر ان انگریز افسران کو اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کے لیے راجہ مان سنگھ سے رجوع کرنا پڑا۔

بڑی مشکل سے راجہ اس کے لیے تیار ہوا کہ انگریز عورتوں اور بچوں کو اس کے قلعہ میں بھیج دیا جائے۔ تاہم اُس نے یہ بات صاف کردی کہ یہ ممکن ہوسکتا ہے عوام اس اقدام پر ناراض ہوجائیں اور خود قلعہ بھی معرضِ خطر میں آجائے۔ پھر بھی انگریزوں کے اہل وعیال مان سنگھ کے پاس پہنچا دیے گئے، اور شاہ گنج کے قلعہ میں محفوظ کردیے گئے۔

جب انگریز یہ حفاظتی تدابیر اختیار کررہے تھے انقلاب کے شعلے بڑی توانائی کے ساتھ فیض آباد کے علاقہ کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے مولوی احمد شاہ جن کا نام جنگ آزادی کی تاریخ ہندوستان میں سرِفہرست آنا چاہیے اُن تعلقہ داروں میں سے ایک تھے جن کی املاک انگریز نے ضبط کرلی تھی اور انھوں نے عہد کیا تھا کہ موقع آنے پر وہ اپنی جائداد کا ایک ایک انچ واپس لیں گے۔ ان لوگوں نے یہ بھی قسم کھائی تھی کہ اپنی مادرِ وطن کی سرزمین کو بھی بیرونی غاصب سے آزاد کرانے میں اپنے سر کی بازی لگادیں گے۔ اودھ کی پوری سلطنت کو انگریز غصب کر بیٹھا تھا۔ اس لیے بغاوت سے پیدا شدہ حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا احمد شاہ کے بلند معیار کے مطابق ملک کی اور مذہب کی اولین خدمت تھی۔ چنانچہ وہ اس فرض کی ادائیگی میں اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے۔ ابتداً انھوں نے ایک عالم دین اور خطیب کا منصب اختیار کیا اور سارے ملک میں خفیہ طور پر دورے کرتے اور عوام تک انقلاب اور آزادی کا پیغام پہونچاتے رہے۔ جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے وہاں وہاں لوگوں کے ذہنوں پر ہدایت

اور آگاہی کی روشنی پھیلتی چلی گئی انھوں نے دور اور قریب کے مجاہدین ملّت سے حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ سب ہی ان کے جذبۂ خلوص و ایثار سے متاثر ہوئے، اودھ کے شاہی خاندان کے لیے تو ان کا ادنیٰ سا اشارہ حکم نامہ کا درجہ رکھتا تھا۔ آگرہ میں انھوں نے ایک خفیہ جماعت کی تنظیم کی جس کا کام مجاہدین کی اعانت کرنا، ان کو ضروری معلومات بہم پہنچانا تھا۔ لکھنؤ میں مولوی احمد اللہ شاہ نے برطانیہ کی طاقت کی بیخ کنی کے لیے کھلم کھلا اعلانات جاری کیے تھے، وہ سارے اودھ کے محبوب ترین رہنما تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے تن من اور فکر و عمل اور آتش بیانی کے جملہ وسائل آزادئ وطن کی راہ میں نچھاور کر دیے تھے۔ جگہ جگہ خفیہ انجمنوں کا قیام عمل میں لاکر، انقلاب کی ضرورت سے متعلق رسالے شائع کرا کر انھوں نے جنگ آزادی کے مقام کو قومی فرض کا رتبہ دیا تھا اور عوامی فہم کے قریب کر دیا تھا۔ نتیجتاً انگریزوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں بڑھتی اور عوام کا اعتماد حاصل کرتی چلی گئیں۔ گویا ان کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قلم ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔

مولوی احمد اللہ شاہ کو اس بے دھڑک طور پر سرگرم عمل دیکھ کر انگریزوں نے ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے مگر اودھ کی پولیس نے اس مقبول عام رہنما کی گرفتاری کی تعمیل میں ضروری اقدام سے گریز کیا۔ مجبوراً فوجی طاقت نے یہ کام انجام دیا۔ ان پر بغاوت انگیز پروپیگنڈہ کرنے کا مقدمہ چلایا گیا اور فوراً سزائے موت کا حکم بھی صادر کر دیا گیا۔ لیکن وقتی طور پر ان کو فیض آباد کی جیل میں قید کر دیا گیا۔"

یہاں تک حالات قلم بند کرنے کے بعد ساورکر حاشیہ کتاب پر مالیسن کی کتاب "انڈین میوٹنی"، کا مندرجہ ذیل اقتباس درج کرتے ہیں:-

"بغاوت کے آغاز سے پہلے مولوی نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ کا سفر اختیار کیا اور اہلِ ملک کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء میں جو بغاوت انگیز لٹریچر اودھ میں گاؤں گاؤں تقسیم ہوا تھا وہ اسی مولوی کے قلم سے نکلا تھا۔ پولیس

اس کو گرفتار کرنے سے دریغ کیا اور یہ کام فوج سے لینا پڑا۔ اس پر مقدمہ چلا اور موت کی سزا صادر ہوئی۔ مگر قبل اس کے کہ اس فیصلہ پر عمل در آمد ہو، اودھ میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے اور جیسا کہ یورپ کی تاریخ میں بھی اکثر ہوا ہے، یہ باغی مولوی قید خانہ سے نکل کر طاقت اور ناموری کے تخت پر جلوہ افروز ہوگیا۔"

ساتھ ساتھ گبن (Gibbon) کا یہ بیان بھی حاشیہ کتاب پر نقل کیا ہے۔

"بلوائیوں نے فیض آباد کے مولوی کو جیل سے رہا کرا دیا۔ وہ مدراسی نژاد، باعزت مسلم خاندان کا ایک فرد تھا۔ شمالی ہندوستان میں دور دراز کے دورے کرکے اس نے عوام الناس کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ انھیں بغاوت انگیز حرکات کی بنا پر اس کا آگرہ سے اخراج عمل میں آیا تھا۔"

کتاب کے باب ۹ میں وریسا ورکر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہاں سے مولوی فیض آبادی اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل دوڑ شروع ہوتی ہے۔ ایک طرف مولوی انگریزوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے اور دوسری طرف مؤخر الذکر بھی برابر اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ جلد سے جلد کب مولوی کو دار پر چڑھایا جائے۔ مگر اس عجلت کے باوصف انگریزوں کا یہ فیصلہ کہ مولوی کو فیض آباد کی جیل میں رکھا جائے۔ ایک ایسا عمل تھا جس کے ذریعہ انھوں نے خود اپنے واسطے دار کا انتظام کر لیا تھا۔ مولوی کی گرفتاری نے بارود کے لیے چنگاری کا کام کیا اور فیض آباد کے بغاوتی میگزین میں آگ لگا دی۔ دفعتاً شہر کی آبادی نے اور خود فوج نے جو زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی علی الاعلان بغاوت کا بگل بجا دیا۔ جب انگریز افسر پریڈ گراؤنڈ میں فوجی انسپکشن کے لیے پہنچے تو سپاہیوں نے دلیرانہ ہم آہنگی سے ان کو بتلا دیا کہ سپاہی اپنے ہم ملکی افسران کے علاوہ کسی کا حکم نہ سنیں گے اور یہ کہ اب ان کا فوجی سربراہ صوبہ دار دلیپ سنگھ ہوگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی صوبہ دار دلیپ سنگھ نے سب انگریز افسروں کو گرفتار کر لیا اور پھر آگاہ کیا کہ ان میں سے کوئی بھی بارہ قدم کے حصار سے باہر

ہو جانے کی خبر ملی۔ اس خبر پر فوراً ہی شہریوں کا ایک انبوہِ کثیر اور سپاہیوں کی ٹکڑیاں جیل کی طرف دوڑنے لگے۔ وہاں کی پاک زمین قوم کے لیڈر اور ہیرو مولوی احمد شاہ کے قدموں سے مقدس و مبارک بن چکی تھی۔ جیل کے دروازہ کے کھلنے کا دھماکا ہوا اور عوام کے پُرجوش نعروں کے درمیان مولوی احمد اللہ شاہ کی قید و بند کی سب زنجیریں توڑ ڈالی گئیں اور آناً فاناً لوگوں کا محبوب لیڈر مجمع کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

یہ مولوی صاحب کی حیاتِ ثانی کا آغاز تھا۔ انگریز استبدادیت جو ان کو پھانسی دینا چاہتی تھی اب خود ان کی پھانسی کا شکار معلوم ہوتی تھی۔ رہائی کے فوراً بعد مولوی احمد شاہ نے فیض آباد کی انقلابی مہم کی کمان اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

بجائے سزائے موت کے فیصلے کے انتقام کے طور پر انھوں نے کرنل لین ناکس (Lane Knox) کو جو اس وقت حراست میں تھا ایک پیغام بھجوایا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ وہ شکر گزار ہیں کہ ان کو قید خانہ میں لانے کی اجازت حاصل تھی۔ اس اخلاقی ذمہ داری کی ادائیگی کے بعد انگریزوں کو آگاہ کیا گیا کہ وہ فیض آباد چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ ان کو لوٹ مار سے بچانے کے لیے (ایسے حادثات دوسرے مقامات پر پیش آ رہے تھے) سپاہیوں کا ایک دستہ تعینات کیا گیا۔ سرکاری عمارتوں کو آتش زدگی سے بچانے کے انتظامات کیے گئے۔ پندرھویں رجمنٹ نے اشتعال میں سب انگریزوں کو تہ تیغ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر افسرانِ اعلیٰ نے مولوی احمد اللہ شاہ کے وعدہ کا احترام کرتے ہوئے اس راہِ عمل سے دریغ کیا اور انگریز افسران کو مع اہل و عیال کے گذر جانے دیا بلکہ ان کو آزادی دی گئی کہ اپنے اسباب میں سے جو کچھ لے جانا چاہیں لے جائیں۔ بشرطیکہ سرکاری املاک کو جو اب بادشاہ اودھ کی ملکیت میں آ گئی تھیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ مزید برآں ان لوگوں کے لیے کشتیوں کا انتظام بھی کیا گیا اور زادِ راہ کے طور پر رقوم تقسیم کی گئیں۔ اسٹیمر پر قافلہ کشتیوں میں بٹھا کر دریائے گھاگھرا کے راستہ روانہ کیا گیا۔

۹ر جون کو ایک سرکاری اعلان جاری ہوا۔ جس میں بتلایا گیا تھا کہ فیض آباد انگریزی تسلط سے

آزاد تھا اور کمپنی بہادر کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ فیض آباد کی مثال لے کر آس پاس کے شہروں اور قصبوں میں بھی آزادی کا جھنڈا لہرا گیا اور ۱۰ جون تک اودھ کا سارا صوبہ پوری طرح آزاد ہو گیا۔ باغی سپاہیوں کی ٹکڑیوں اور جنگ آزادی کے والنٹیروں نے لکھنؤ کی جانب کوچ کرنا شروع کر دیا۔ سرہنری لارنس وہاں ابھی تک جوں توں کر کے پاؤں جمائے تھا۔ ۳۰ مئی کو جب سپاہیوں نے علم بغاوت بلند کیا تو اس کے پاس صرف ایک انگریز رجمنٹ اور دو ایسی ہندوستانی رجمنٹیں تھیں جن کی وفاداری کا امتحان کیا جا چکا تھا۔ کانپور کے محاذ پر انگریزوں کی فاش شکست نے اس کے اقتدار پر ضرب کاری لگائی تھی۔ اب یہ مقابلہ کے لیے تیار تھا اور لکھنؤ کے محاذ پر اس کھوئے ہوئے بھرم کی تلافی کا خواہشمند تھا جس کی قبر کان پور میں بن چکی تھی۔

۱۹ جون تک انگریزوں کے فوجی دستے آہنی پل کے قریب جمع ہو چکے تھے۔ اب سر ہنری لارنس چار سو انگریز فوجیوں چار سو دیسی سپاہیوں اور چار توپوں کے ساتھ لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ بہت دور تک اس کو غنیم کا کوئی نشان نہ ملا۔ لیکن اس کے بعد اس کو باغی فوج کے پیشرو دستے دکھائی دیے۔ فوراً ہی سرہنری نے قریب کے ایک گاؤں پر قبضہ کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ جہاں سے انگریز افسران اور ان کی ہندوستانی فوج نے تڑاتڑ گولوں کی بوچھار کر دی۔ یہاں تک کہ مجاہدین آزادی کی بندوقیں سرد پڑ گئیں۔ انگریزوں کا چنہٹ (Chinhut) پر قبضہ ہو گیا۔ مگر اس کے کچھ ہی بعد زبر دست شور ہوا کہ مجاہدین اچانک بائیں سمت سے ٹوٹ پڑے ہیں۔ انھوں نے جم کر انگریزوں کے وسطی اور عقبی دستوں پر ضرب کاری لگائی۔ انگریز جان بچا کر بھاگ پڑے۔ مگر آزادی کے سپاہی برابر ان کے تعاقب میں رہے اور انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے اور وہ واپس لکھنؤ کی جانب دوڑ گئے۔

جب سرہنری لکھنؤ پہنچ کر ریزیڈنسی میں پناہ کے لیے داخل ہو رہا تھا تب بھی انقلابی فوج کے دستے ان کے تعاقب میں تھے۔ فوجی محاسبہ کی رو سے اس وقت انگریزوں کی فوجی طاقت بے دست و پا تھی اور ایک طرح انقلابیوں کے اسیر تھے۔ چنہٹ پر مجاہدین کی فتح سے اودھ میں انگریزوں

کی طاقت کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ اودھ میں انگریزوں کی شکست کے اس ڈراپ سین کے بعد آزادی کی کشمکش کے دوسرے موڑ پر انگریزوں نے عسکری قوت کو مضبوط کر لیا اور وہ سکھ فوج کی مدد سے دہلی پر قابض ہو گئے۔ ساورکر کی زبان سے انگریزی افواج کے کمانڈر انچیف سر کالن کے فتح گڈھ میں فاتحانہ داخلہ کی روداد سنیے :

۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو انگریزی افواج کا کمانڈر انچیف فاتحانہ طور پر فتح گڈھ میں داخل ہوتا ہے۔ دوآبہ کا مکمل علاقہ بنارس سے میرٹھ تک وسطی ملک برطانوی افواج کے زیر نگیں آچکا ہے۔ جنگ کے ماہرین اندازہ لگا رہے ہیں کہ دوآبہ کے بعد دہلی کا مغلوب ہو جانا یقینی ترین قیاس ہے۔ پھر بغاوت کا خاتمہ ہو جانے میں مشکل سے ایک ہفتہ لگے گا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد انقلابیوں کی طاقت اس طرح سر بلند ہوئی جیسے زمین پر پٹکنے سے ربر کی گیند اچھلتی ہے۔ جیسے سیلابی طوفان دور دراز سمتوں تک پھیل جاتا ہے۔ اُمید کے خلاف، دہلی کی شکست سے انقلابیوں کا جذبۂ انتقام شدید تر ہو گیا تھا۔ آخر لمحۂ حیات تک جنگِ آزادی جاری رکھنے کا اٹل فیصلہ کر کے وہ پھر سے اس آگ میں کود پڑے تھے۔ اگرچہ باغیوں کے سربراہوں کے آپسی اختلافات بھی سر اٹھا رہے تھے تاہم برطانیہ کی طاقت کے خلاف یہ اب بھی متحد تھے۔

اودھیا اور روہیلکھنڈ کے صوبے دروبست مجاہدین آزادی کے ہاتھ میں تھے۔ سر کالن کا پہلا نشانہ روہیلکھنڈ تھا۔ اس کی فتح کے بعد ہی لکھنؤ کا راستہ کھل سکتا تھا۔ لارڈ کیننگ کا خیال بھی یہی تھا کہ باغیوں کے گڈھ لکھنؤ کی فوجی اہمیت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ اس تجویز پر عمل شروع کرنے کے لیے سیٹن (Seaton) والپول (Walpole) اور کمانڈران چیف کے دس گیارہ ہزار متحدہ فوجی دستے فتح گڈھ میں آچکے تھے۔ پھر آگرہ سے بھی مزید کمک پہنچ گئی تو کالن نے فتح گڈھ سے کوچ کیا۔ ۳ فروری کو کانپور کے راستہ سے گنگا کو عبور کیا۔ اُدھر نیپال سے جنگ بہادر نیپالی فوج لے کر لکھنؤ کی بربادی کے لیے چلا آرہا تھا۔ بقول ویر ساورکر انگریز اس کے دوست اور ہندوستانی اس کے دشمن تھے۔ لیجیے یہ داستان ساورکر سے ہی سنیے :-

یہ جنگ بہادر۔ ہندوستانی تاریخ کا بدنما داغ۔ خود اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے بھی دائمی ذلت اور رسوائی حاصل کرنے کا باعث بنا۔

یہ جنگ بہادر اپنے حلوہ مانڈہ کی خاطر نیپالیوں کو انگریزوں کا آلہ کار بنا رہا تھا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں اس نے انگریزوں کی مدد کے لیے تین ہزار نیپالی عظیم گڑھ اور جونپور بھیجے تھے۔ اب بھی اس نے انگریزوں سے مدد کا معاہدہ کیا تھا۔ انگریز فوجوں کے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنی فوج کے ریلے میں انقلابیوں کے دستوں کو لکھنؤ کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

جنگ بہادر اپنی گورکھا فوج سے اور جنرل فرینکس اور رُوکرافٹ اپنی اپنی کثیر افواج سے مجاہدین کو بنارس کے شمال اور اودھ کے مشرقی علاقہ میں تہ تیغ کرا رہے تھے۔ اس خون خرابہ کے ساتھ یہ تینوں افواج اودھ کی سرحدوں میں داخل ہوئیں۔ تاکہ کالپی کی افواج سے جا ملیں۔

اور مارچ تک یہ سب لکھنؤ میں مجتمع ہو چکے تھے اور "خطاوار" لکھنؤ کی سرزنش پر تلے ہوئے تھے۔

لکھنؤ کے خاتمہ کا سین ساورکر یوں بیان کرتے ہیں:

وہ محبانِ وطن جن کا بیرونی تسلط کو دیکھ کر خون کھولنے لگتا تھا۔ وہ جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر میدانِ کارزار میں اتر آئے تھے تاکہ آزادی کا جھنڈا بلند ہو ـــــ راجے۔ مہاراجے زمیندار، تعلقہ دار ـــ اس وقت اپنی صف میں ایک ایسا شخص بھی رکھتے تھے جو لکھنؤ کے تحت کی حفاظت کے لیے سب سے آگے تھا اور جس کو جنگی کونسل کا قابل ترین رکن سمجھا جاتا تھا۔ یہ

غیر معمولی انسان پچھلے چار ماہ سے برابر حرکت میں تھا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سرگرم عمل۔ اس کی موجودگی میدانِ جنگ اور جنگی کونسل دونوں کے لیے جہاد و عمل کا پیغام تھی۔ یہ کون تھا؟ ایسا بیرو' فدائے وطن مولوی احمد شاہ فیض آبادی کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔

اپنے ہاتھوں میں جنگِ آزادی کی شمع اٹھائے یہ ملک بھر میں حبّ وطن کے چراغوں کو روشن کرتا ہوا پھرا تھا۔ لکھنؤ کی انگریز حکومت نے ایک بار اس کو گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم بھی سنایا تھا۔ سرزنش سے پہلے اس کو فیض آباد کی جیل میں رکھا گیا تھا مگر ۱۸۵۷ء کے بغاوتی طوفان نے اس کو حراست سے نکال کر اس کو انقلابی جماعت کی سرداری پر فائز کر دیا تھا' یہ قوم کا ہیرو مولوی احمد شاہ ملک کی آزادی اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی خاطر آج پھر میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ اپنی زبان کے جادو سے اس نے ہزاروں اہلِ ملک کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ حبّ وطن کا درس دیا اور زلزلہ خیز آزمائشوں کے درمیان لاکر کھڑا کر دیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے نہ صرف ساتھیوں سے بلکہ دشمنوں سے بھی اپنی دلیری اور شجاعت کی داد حاصل کی تھی۔

جب کالپی تانتیا ٹوپا کا مقابلہ کرنے لکھنؤ سے باہر گیا تو اس نے آؤٹرم (Outram) کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ عالم باغ کا چارج دے دیا تھا۔ اُسی دن سے مولوی اس دھن میں تھا کہ اس فوج کی کمزوری سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے۔

یوں تو اودھ کی آزادی کی مہمات کی سربراہ نواب حضرت محل ہی تھیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ ان کی کوششیں انقلابیوں اور راجاؤں کو متحد کرنے میں زیادہ آگے نہیں بڑھ رہی تھیں۔ اندرونی بدنظمی اور بروقت اقدام کرنے میں فوج کی کوتاہی سے پہلے کئی ایسے مواقع رائیگاں جا چکے تھے جب دشمن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ ایسے زریں موقع پر تو مٹھی بھر انگریزوں کا قلع قمع کرنا دشوار نہ ہونا چاہیے تھا۔ (باقی آئندہ)

حضرت مفتی صاحب مدظلہ دہلی تشریف لے آئے

دہلی،

آج صبح (۵ مارچ) کو حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب لکھنؤ سے دہلی تشریف لے آئے، خدا کا شکر ہے کہ ان کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہے۔ علاج برابر جاری ہے۔ آج جب مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دہلی پہنچے تو لکھنؤ سے ہی ہمارے بہنوئی جناب اطہر صدیقی صاحب برادر عزیز نجیب الرحمٰن اور شاداب سلمہٗ حضرت مفتی صاحب کے ہمراہ آئے تھے۔ اور دہلی اسٹیشن پر باوجود موسم کی خرابی کے بہت بڑی تعداد میں اکابر کرام، مسلم زعماء اور سرکردہ حضرات موجود تھے، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر حضرات کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

مولانا قاضی سجاد صاحب نائب متولی ہمدرد دواخانہ، مولانا مفتی ضیاء الحق صاحب دہلوی، مولینا اخلاق حسین صاحب دہلوی، الحاج مولینا سید آفتاب احمد صاحب، صاحبزادہ مولینا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، حضرت مولینا محمد سالم صاحب قاسمی، مولینا حامد الانصاری غازی صاحب جناب مفتی شوکت علی صاحب فہمی، قاضی ارشاد احمد صاحب (ہمدرد دواخانہ) جناب نرنجن سنگھ لانبہ، جناب انور علی صاحب دہلوی، مسٹر محمد آصف فہمی صاحب، مولوی محمد عدنان قاسمی صاحب۔

مکان پر پہنچنے کے بعد، حضرت حکیم الاسلام مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولینا محمد فاروق میرواعظ کشمیر، میر مشتاق احمد صاحب، ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب مولینا غلام محمد نورگت، مولینا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا محمد مسلم صاحب مدیر دعوت، مسٹر اطہر صدیقی (وائس پریزیڈنٹ یو ایس) مسٹر سید راحت میاں (آل انڈیا ریڈیو)

جناب محترم حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد، اور حضرت شاہی امام صاحب جامع مسجد دہلی نے حضرت مفتی صاحب کی عیادت فرمائی۔

لکھنؤ اور دہلی میں ملک کے مختلف حصوں سے حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کی صحت وعافیت معلوم کرنے کے لیے خطوط اور ٹیلیگرام بہت سے حضرات نے بھیجے ہیں اور بہت سے لوگوں نے دعاء صحت کا اہتمام فرمایا۔ یہاں دہلی کی مساجد میں کل بھی حضرت موصوف کے لیے دعائے صحت کی گئی اور شاہی مسجد شاہجہانی میں امام صاحب نے بعد نماز جمعہ اور حضرت حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے جلسۂ عام میں دعا کرائی۔ دوسری مساجد میں بھی بعد نماز جمعہ دعائے صحت کی گئی۔

ہم خدام تمام حضرات کے شکر گذار ہیں اور دعائے صحت وعافیت کے لیے درخواست کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کو صحت کاملہ، عاجلہ، مستمرہ، عطا فرمائیں اور ہم سب کے سروں پر ان کا سایہ تادیر قائم رہے۔ آمین۔

عمید الرحمٰن عثمانی، مینجر "برہان"

بیانِ ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان، دہلی ۶

فارم چہارم، قاعدہ نمبر ۸

(۱)	مقامِ اشاعت	اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
(۲)	وقفۂ اشاعت	ماہانہ
(۳)	طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
(۴)	ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	سکونت	۳۱۳۶ اردو بازار دہلی
(۵)	ایڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے۔
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	نزد بال برادری سول لائنز علی گڑھ (یوپی)
(۶)	ملکیت	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر

عمید الرحمٰن

برہان

جلد نمبر ۸۸، جمادی الآخر ۱۴۰۲ھ، مطابق اپریل ۱۹۸۲ء، شمارہ نمبر ۴

مقالات

نظرات

ہمارے حبیبِ لبیب اور قرآن کے حبیبِ نجیب مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کو گزشتہ دو تین برسوں میں جو حوادث پیش آئے، ایک ضعیف قلبِ انسانی کی قوت برداشت کا امتحان لینے کے لیے کچھ کم نہ تھے کہ اب گزشتہ فروری میں حقیقی بھانجہ مولانا محمد ثانی کی بمرض سنگ گردہ ۵۶ برس کی عمر میں دردناک موت کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ سچ کہا کسی نے : جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے، لیکن چونکہ مولانا کا گھرانہ " ایں خانہ ہمہ آفتاب است " کا مصداق ہے اس بنا پر اس طرح کا حادثہ تنہا مولانا کا نہیں بلکہ علم و ادب اور دین و شریعت کے عالم کا حادثہ ہوتا ہے، چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، مرحوم ندوۃ العلماء اور مظاہر العلوم سہارنپور دونوں درسگاہوں کے تعلیم یافتہ تھے، حدیث کا درس شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی سے لیا تھا، اور ان کے خلیفہ مجاز بھی تھے، تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا، سوانح نگاری کا خاص سلیقہ رکھتے تھے، چنانچہ مولانا سہارنپوری اور مولانا محمد یوسف کی ضخیم سوانح عمریاں لکھیں اور مقبول خاص و عام ہوئیں، مترجم بھی بہت اچھے اور شاعر شیوا بیان بھی تھے، رضوان کے نام سے خواتین کا ایک ماہنامہ بھی ایڈٹ کرتے تھے۔ علماً و اخلاقاً نہایت زاہد و عابد، بے غرض و بے لوث، خاموش مگر متواضع و خندہ جبین تھے، اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور مولانا علی میاں اور دوسرے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین!

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری دونوں اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کی آبرو اور اس کی متاع گرانمایہ تھے، حالی اور آزاد کے بعد ۱۹۱۴ء سے اردو شاعری کا جو ایک نیا دور شروع ہوا یہ وہ بڑا زرخیز، مردم آفریں اور انقلاب انگیز دور تھا، یہ وہ عہد تھا جب کہ مغربی افکار و نظریات

اور مشرقی روایات و احساسات کے امتزاج و تصادم نے شاعر کے طائر فکر و تخیل کی پرواز اور اظہار و ابلاغ کے اسالیب کے لیے نئی نئی بلندیاں اور وسعتیں پیدا کر دی تھیں، اس بنا پر اس دور میں اردو زبان اور اس کے شعر و ادب نے جو غیر معمولی ترقی کی اس کی وجہ سے اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی ہمسر اور اس کی شاعری ان زبانوں کی شاعری کی حلیف بن گئی، جوش اور فراق دونوں اس عہد کے ایوانِ ادب و شعر کے دو اہم ستون تھے جو افسوس ہے اب باقی نہیں رہے، لیکن جو شمع وہ روشن کر گئے ہیں اس سے اور شمعیں روشن ہوتی رہیں گی اور یہ کاروانِ شعر و ادب اسی طرح ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں رہے گا۔

جوش اور فراق میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، لیکن ساتھ ہی ان میں چند انفرادی خصوصیات تھیں جو ان کے درمیان مابہ الامتیاز تھیں، عجیب بات ہے جوش کی شاعری کا آغاز صوفیانہ شاعری سے ہوا، ان کے اس زمانہ کا ایک شعر بندہ سولہ برس کی عمر سے اب تک یاد ہے: ؎

فنا ہو جا جھلک اٹھے گا سینہ شمعِ عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینہ پہ غافل داغِ ہستی ہے

یہ صرف ایک نمونہ ہے ورنہ ان کے ابتدائی مجموعۂ کلام میں اس قسم کے اشعار کثرت سے تھے اور یہ چلتا پھرتا انھیں گنگناتا رہتا تھا، لیکن یہ اس عہد سے قریب کی بات ہے جب کہ انھوں نے خود کہا تھا:

مجھ کو تعلیم سے فرصت ہی کہاں اے شبیر!
کہہ لیا شعر کوئی جب کبھی فرصت دیکھی

لیکن جب تعلیم سے انھیں فرصت ہو گئی اور وہ شعر گوئی کے بحرِ ذخار میں ڈوب گئے تو اب زندگی کی رنگا رنگ دلچسپیوں نے ان کے مرغِ تخیل کی پرواز کے لیے نئی نئی فضائیں پیدا کر دیں، سیاست کی طرف رجحان ہوا تو حریت و انقلاب ہو گئے، انسانیت کی طرف گئے تو حسن و شباب کی محفل نشاط و انبساط کے ترجمان کہلانے لگے، لیکن اپنی عبقریت کی وجہ سے جس بزم میں پہنچے اپنی عظمتِ فکر و بیان کا سکہ بٹھا کے رہے، لیکن دراصل وہ نظم کے شاعر تھے، غزارتِ الفاظ، حسنِ ترکیب، جدتِ

تشبیہات واستعارات اور وسعتِ فکر وخیال کے بادشاہ تھے، ان کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کے باعث وہ ہم عصروں میں ایک قد آور شخصیت کے مالک تھے۔

جوش کے برعکس فراق اصلاً وطبعاً غزل کے شاعر تھے، انھوں نے غزل کی نازک خوش بدنوں کی مشاطگی وحنا بندی اس چابکدستی اور ہنر مندی سے کی کہ عالم جذب وشوق میں دھوم مچ گئی۔

اف ترے حسن جہاں تاب کی پُرزور کشش
نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا

فراق کا مشرقی ادبیات کے ساتھ مغربی فلسفہ وادب کا مطالعہ براہِ راست اور نہایت دقیق اور وسیع تھا، طبیعت بھی رسا پائی تھی، ذہن دقیقہ سنج تھا ان سب چیزوں کے امتزاج باہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فراق نے زندگی کو ہر رنگ میں اور ہر پہلو سے دیکھا اور پھر جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے غزل کے آئینہ خانہ میں اس طرح محفوظ کر دیا کہ غزل غزل نہ رہی نقش مانی وبہزاد اور نگارخانہ چین بن گئی، اور ایک شاعر کی عظمت کے لیے اور کیا چاہیے،

جوش کو اردو زبان کا قاآنی کہا جاسکتا ہے اور فراق کو عربی کے مشہور فلسفی شاعر ابو العلاء معری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک اخبار میں اچانک اپنے عزیز اور دیرینہ دوست احسان دانش کے انتقال کی خبر نظر سے گذری تو صدمہ ہوا، مرحوم ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے، لاہور پہنچ کر مزدوری کی۔ اسی سے مزدوروں کے شاعر بنے، بڑی شہرت اور مقبولیت پائی، تقسیم کے بعد وہیں رہ گئے۔ تاہم اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے، طبعاً مرنج ومرنجاں، متواضع ومنکسر المزاج اور عقیدہ وعمل کے اعتبار سے پکے مسلمان تھے، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ۲۲ مارچ کو پنت ہاسپٹل سے، جہاں وہ لکھنؤ سے آکر زیر علاج تھے منتقل ہو کر گھر آگئے ہیں اور صحت قابل اطمینان طریقہ پر بحال ہو رہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ایک بنیادی اقدام

از جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈیمی ۔ بنگلور نمبر ۵۰

(۲)

خلافتِ اسلامیہ اور عالمِ اسلام کا اتحاد:

علامہ ابن خلدون (۷۳۲ - ۸۰۸ھ، ۱۳۳۱ - ۱۴۰۶ء) نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں عربوں کے مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی گہری حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے اور اس کا علاج بھی بتا دیا ہے جو ان کے کمال بصیرت اور دوربینی کا آئینہ دار ہے۔

" عربوں کو حکومت و سلطنت یا تو دینی چھاپ کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے یا نبوت و ولایت یا دین کے کسی بہت بڑے اثر کی بدولت۔ کیونکہ ان کی فطرت ایسی سخت، غیور اور خوددار قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی اطاعت سے دیگر قوموں کی بہ نسبت سخت متوحش ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہشات کا (کسی ایک پلیٹ فارم پر) جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دین جب نبوت یا ولایت (دینی سیادت) کے ذریعہ اُن کے لیے سدِ راہ بن جائے تو اُن میں (اپنی ذاتی) بڑائی اور برتری کے جذبات سرد پڑ جائیں گے، اطاعت شعاری اور باہمی ملاپ اُن کے لیے آسان ہو جائے گا۔"[1]

---

[1] ملخص از مقدمہ ابن خلدون، ص ۸۳، المطبعۃ الخیریۃ، مصر، ۱۳۲۲ھ (فصل فی ان العرب لا یحصل لھم الملک الا بصبغۃ دینیۃ من نبوۃ أو ولایۃ أو أثر عظیم من الدین علی الجملۃ)۔

اسلام کے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (شہادت : ۲۳ھ مطابق ۶۴۴ء) نے بڑی سچی بات بیان فرمائی ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو اپنی گرہ میں باندھ لینا چاہیے:

نحن قوم اعزنا اللّٰہ بالاسلام، وان ابتغینا العزۃ بغیرہ اذلنا اللّٰہ۔[1]

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے۔ (لہٰذا) اگر ہم نے عزت و بڑائی کو اسلام کے علاوہ کسی اور چیز میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

اس حقیقتِ واقعہ کی صداقت موجودہ دور میں خصوصیت کے ساتھ عرب اسرائیل جنگوں کی شکل میں ہمارے سامنے آچکی ہے، جب کہ بعض عرب ممالک نے مصر کے سابق صدر جمال عبد الناصر (۱۹۱۸ - ۱۹۷۰ء) کی سرکردگی میں عرب قومیت کا صور پھونکتے ہوئے عالم عرب کو عالم اسلام سے کاٹ کر بالکل الگ کر دینا چاہا تو نہ صرف خود ذلیل و رسوا ہوئے بلکہ پورے عالم اسلام کو بھی ذلیل و رسوا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے اور انھیں ایک لڑی میں پرو کر ہر قسم کے ذہنی و فکری اور قومی و علاقائی انتشار اور عصبیتوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسلام ہی میں وہ حیرت انگیز کشش اور جاذبیت موجود ہے جو دنیا بھر کی تمام قوموں اور فرقوں کو حقیقی اور پائیدار بنیادوں پر ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتی ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نعرہ انھیں قطعاً متاثر نہیں کر سکتا اور ہرگز انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں کر سکتا۔ یا اگر کسی وقتی جذبے کے تحت کچھ عارضی اتحاد ہو بھی جائے تو وہ پائیدار نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے لکھا ہے: اس وقت پورے عالم اسلام کی قیادت ــــ اپنے چند ذاتی خصائص کی بنا پر ــــ عالم عربی ہی کر سکتا ہے جس طرح کہ اس

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر۔

اب سے چودہ سو سال پہلے کی تھی۔ بشرطیکہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لے۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ اس وقت دو ہی راستے تھے :۔ یا عرب کے لوگ اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہو کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے، جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی۔ یا پھر وہ اپنی خواہشات اور مرغوبات کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لیے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لیے پیش کر دیا۔

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطے پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی یہ عالم پھر اسی دوراہے پر نظر آ رہا ہے جس دوراہے پر رسول اللہ صلعم کی بعثت کے وقت تھا۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلعم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لیے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت اور سامان راحت کو خطرے میں ڈال دے، تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی کی فکر میں رہیں اور سامان عیش کی فراہمی میں مشغول رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے۔" [1]

---

[1] ماخوذ از انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۳۴۵-۳۴۷، چھٹا ایڈیشن۔

اس طرح آج عالم اسلام پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور ان کا کوئی بھی غلط قدم عظیم اور تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت نہ صرف عالم اسلام بلکہ پورا عالم انسانی سخت جانکنی اور نزع کے عالم میں ہے۔ لہٰذا ہماری ملت کے ناخداؤں کا فرض عین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کو صحیح طور پر سمجھیں اور ان کو صحیح طور پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس قیادت کو عملاً بروئے کار لانے کی کیا شکل ہو اور عالم اسلام کس طرح اور کن خطوط پر متحد ہو سکے گا؟ یہ بڑے اہم اور نازک سوالات ہیں جو ہمارے قائدین اور ارباب دانش کے لیے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی مسائل کے حل کے بعد ہی کوئی مناسب قدم اٹھایا جا سکے گا۔

اس سلسلے میں اگر عرب اور غیر عرب ممالک کے موجودہ باہمی اختلافات کا جائزہ لیا جائے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے اور یقین نہیں آتا کہ یہ کبھی کسی بات پر متفق بھی ہو سکیں گے مگر اسلام میں چونکہ مایوسی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات سے یقین ہے کہ وہ ایسے حالات ضرور پیدا کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں ایک عالمی مسلم اتحاد کے لیے فضا سازگار ہو جائے۔

بہرحال اس وقت سب سے زیادہ اہم اور اہم ترین مسئلہ جو دنیائے اسلام کو درپیش ہے وہ ہے دنیائے اسلام کا اتحاد۔ اگر یہ مشکل اور نازک مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ہمارے تمام مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں اور اسلام کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ لہٰذا ہمارے مفکرین کو اس راہ میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دینے کی ضرورت ہے۔ اگر خلوص اور عزم راسخ کے ساتھ جدوجہد کی جائے تو یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

راقم سطور کے ناقص خیال میں اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ "خلافت اسلامیہ" کے فراموش کردہ تصور کو دوبارہ زندہ کیا جائے، جس کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی نظر میں دینی اعتبار سے ایک تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ پوری دنیائے اسلام کا ایک "خلیفۃ المسلمین" ہو جس کے جھنڈے تلے تمام مسلم ممالک وفاقی (FEDRAL) حیثیت سے جمع ہو جائیں۔

اس مقصد عظیم کا حصول بادی النظر میں بہت مشکل بلکہ ناممکن دکھائی دیتا ہے مگر اس مقصد کے حصول کے لیے بتدریج اور مسلسل کوشش کی جانی چاہیے۔ اول اول چند ہم خیال ممالک مل کر اس کا تجربہ کر کے دیکھیں۔ جب اس میں کامیابی نظر آئے ۔۔۔۔ اور اگر خلوص اور فکر مندی کے ساتھ ایک آئیڈیالوجی کے تحت کام کیا جائے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی نظر آئے گی ۔۔۔۔ تو پھر دیگر ممالک کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ بلکہ اگر یہ تجربہ شروع کر دیا جائے تو دیگر ممالک کے عوام خود اپنی حکومتوں سے اس وفاق میں شرکت کا تقاضہ شروع کر دیں گے اور اس طرح یہ ایک عوامی تحریک بن جائے گی۔

اگر اس قسم کے وفاق کو وجود میں لانا فی الحال ممکن نہ ہو تو پھر ایک ڈھیلی ڈھالی یونین اور ایک متحدہ سیکرٹیریٹ قائم کر کے عالم اسلام کو کسی نہ کسی حیثیت سے ایک مرکزیت عطا کی جائے کیونکہ وہ آج بے مرکز اور بے منبر و محراب ہے۔ اور آج روئے زمین پر چالیس سے زیادہ مسلم ممالک موجود ہونے کے باوجود ان میں کسی قسم کا تال میل نہیں ہے اور ہر ایک اپنی بولی الگ الگ بول رہا ہے۔

غرض یہ وہ صدا ہے جس کے لیے ساری اسلامی دنیا کا دل دھڑک رہا ہے اور سب کی نگاہیں قدرتی طور پر عالم عربی پر مرکوز ہیں۔ یہ عالم عربی کے لیے ایک بہت بڑا امتحان اور آزمائش ہے۔ اور خدا کرے کہ وہ اپنی اس آزمائش میں پورا اترے۔

" خلافتِ اسلامیہ" کا یہ اصطلاحی مفہوم اور اس کا تصور بھی دراصل وسیع تر "خلافت ارض" ہی کا ایک جزو اور اس کا ایک حصہ ہے۔ اگر ہم " خلافت اسلامیہ" قائم نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم وسیع تر خلافت ارض کے لیے بھی نا اہل ہیں، جو خدا کے نزدیک مطلوب و مقصود ہے۔ خلافت ارض کے قیام کے لیے سب سے پہلے خلافت اسلامیہ کا قیام ضروری ہے اور یہ خداوند کریم کی جانب سے ہمارا بہت بڑا ابتلاء ہے۔ لہذا ہمیں اس راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ ملت اسلامیہ کی بدقسمتی اور انتہائی بدبختی تھی کہ ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا (۱۸۸۱ء ـ ۱۹۳۸ء) نے یورپ کے اتحادیوں اور خاص کر انگریزوں کے اشارے پر[1] خلافت اسلامیہ کو (۳ مارچ ۱۹۲۴ء میں)[2] ختم کر کے وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور اپنی سادہ لوحی کے باعث استعماریت (COLONIALISM) کی خدمت کی اور اسلام کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا کہ ملت اسلامیہ اب تک اپنے زخموں کو چاٹ رہی ہے۔ حکیم مشرق علامہ اقبال نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ؎

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرکزی خلافت کے قیام کے باعث دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے ایک جذباتی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ۱۹۲۴ء سے پہلے کے واقعات شاہد ہیں کہ جب انگریزوں نے ترکی خلافت کو ختم کر کے اس کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندوستانی مسلمانوں پر اس کا شدید ردّ عمل ہوا۔ اور ترکی کی خلافت کو (جو اس وقت پورے عالم اسلام کی مرکزی خلافت سمجھی جاتی تھی اور اس کو ایک طرح سے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا) بچانے کے لیے مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ ـ ۱۹۳۱ء) کی قیادت میں جو زبردست تحریک چلائی گئی وہ تاریخ میں "تحریک خلافت" کے نام سے مشہور ہے۔ اُس وقت ہندوستانی مسلمانوں نے ـــــ اپنے غلام ہونے کے باوجود ـــــ جس اسلامی جذبے اور جوش کا مظاہرہ کیا وہ دنیا والوں کے لیے باعث حیرت و استعجاب اور ایک مثالی نمونہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے اُن کے سینوں میں آگ لگا دی ہے۔ اور ان کے جذبات و احساسات اور ان کے شدید عمل

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "جامعہ" کے مولانا محمد علی نمبر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مضمون، ص ۲۶، اپریل ۱۹۷۹ء نیز مولانا موصوف کی کتاب پرانے چراغ، حصہ دوم، ص ۱۷۔

[2] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، مترجمہ غلام رسول مہر، ۱/ ۲۷۱، لاہور ۱۹۶۸ء۔

ہے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انگریز ترکی سے نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس موقع پر ہندوستانی مسلمانوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ اور یادگار رہیں گی۔ یہ کیا چیز تھی۔ اور کس چیز نے انھیں اس حیرت انگیز جذبہ اور شدید رد عمل پر ابھارا ہو گیا یہاں پر دینی و مذہبی جذبے کے علاوہ کوئی دوسری چیز بھی نظر آتی ہے؟ حالانکہ ترکی اور ہندوستان کی سرحدیں ملی ہوئی نہیں ہیں۔ اور ان دونوں میں قومیت، زبان، تہذیب و معاشرت وغیرہ ہر چیز میں بیّن تفاوت نظر آتا ہے۔ یہ تاریخ کی ناقابلِ انکار حقیقت و شہادت ہے۔ اور آج بھی برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں میں بلکہ سارے جہاں کے مسلمانوں میں یہی جذبات موجزن ہیں اور وقت پڑنے پر وہ ہر قسم کی قربانیاں دے سکتے ہیں۔

غرض خلافتِ اسلامیہ، مسلمانوں کے دل کی آواز اور ایک اربِ کلمہ گویان کے دلوں کی دھڑکن بن سکتی ہے، بشرطیکہ صحیح خطوط پر کام کیا جائے اور صحیح طریقے پر انھیں منظم کیا جائے۔ وہ اس وقت بے قاعدہ اور بے چرواہے کی بکریوں کی طرح اِدھر اُدھر منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں۔

"خلیفۃ المسلمین" جس کو بنایا جائے وہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی بہبودی کو مدِ نظر رکھنے والا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے اُس کے تمام احکام ——— اسلامی قانون کے حدود میں ——— سب کے لیے واجب الاطاعت ہوں گے۔

ابھی ماضی قریب میں عالمِ اسلام کو متفق و متحد کرنے کی ایک بہت بڑی کوشش شروع ہو چکی تھی، جس کے داعی و محرک ملیشیا کے سابق وزیرِ اعظم تنکو عبدالرحمان تھے۔ افسوس کہ یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی اور جذبات پھر سرد ہو گئے۔ یہ کوشش از سرِ نو شروع ہونی چاہیے اور اس کو ہر قیمت پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے۔ اگر اس راہ میں پچیس پچاس سال بھی صرف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ضرورت صرف مستقل مزاجی اور فولادی عزم کے ساتھ کام کرنے کی ہے اور اس راہ میں چند مخلص اور بے لوث آدمیوں کو اپنی زندگیاں وقف کر دینی چاہیے۔

کیونکہ اس قسم کے نتائج راتوں رات برآمد نہیں ہو سکتے۔ ذہن سازی اور قوموں کی تعمیر بہت مشکل، صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ہے مگر ناممکن اور محال نہیں ہے، جیسا کہ مختلف قوموں اور اُن کے عروج و زوال کے احوال و کوائف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے منظم منصوبہ اور مسلسل عمل یہ دو چیزیں کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا وسیع تر کارخلافت کے پیش نظر ابتداءً اگر صرف چند ہم خیال ممالک بھی متحد ہو کر محدود پیمانے پر ہی سہی خلافتِ اسلامیہ کا تجزیہ کریں تو اس عمل کے خاطر خواہ حیرت انگیز نتائج کے نکلنے کی توقع ہے ان کے ظہور کے بعد مزید ممالک کو بھی اس بلاک میں شامل ہونے

کی ترغیب مل سکتی ہے۔ پھر اس کے بعد دیگر ممالک بھی بتدریج برضا و رغبت اس میں شامل ہو سکیں گے۔ صحیح خطوط پر کام شروع کرنے کے لیے یہ ایک صحیح نقطۂ آغاز ہو گا۔

دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے چند جدید ترین واقعات اور خصوصاً مسلم افغانستان پر روس کی فوج کشی اور یلغار نے مسلم ممالک کی آنکھیں کھول دینے اور اپنے تمام باہمی اختلافات کو فراموش کر کے متحد ہو جانے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے۔ اگر اب بھی تمام مسلم ممالک ایک نہیں ہو جاتے تو پھر اغیار کی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھنے اور ان کا لقمۂ تر بننے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔

اگر تمام مسلم ممالک ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو پھر پوری دنیا اور اس کی تمام قوتیں مل کر ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گی، بلکہ اس سے درحقیقت عالمی سیاست میں ایک انقلاب آ جائے گا اور اُن کا ایک وزن قائم ہو جائے گا۔ ان کی حیثیت موجودہ متحدہ بلاکوں کے درمیان ایک بیلنسنگ پاور کی سی ہو جائے گی۔ یعنی وہ جس بلاک کی طرف ہو جائیں گے اُس کا پلڑا جھک جائے گا۔ یہ بھی گویا نمونہ ہو گا اُن کے "امت وسط" ہونے کا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ :

اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ (بقرہ: ۱۴۳)

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ اور یہ تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ (مؤمنون: ۵۲)

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی (کتابِ الٰہی یا دینِ الٰہی) کو مضبوط پکڑے رہو اور متفرق مت ہو جاؤ۔ اور تم پر اللہ کی نعمت (اُس کے احسان) کو یاد کرو جب تم (باہم ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ حالانکہ تم (اس وقت اپنی باہمی عداوت کی بنا پر) آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ پس اُس نے تمھیں اُس آگ سے بچالیا۔ اِسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم راہ یاب ہو سکو۔

اور چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ضرور (برپا) ہو جو (تمام) قوموں اور ملتوں کو خیر کی طرف بلائے اور (اُنھیں) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔

اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو تفرقِ باہمی اور اختلافِ باہمی کا شکار ہو گئے، باوجودیکہ اُن کے پاس واضح احکام پہنچ چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا۔

(آل عمران: ۱۰۳-۱۰۵)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ اور اللہ اور اس کے رسول کی (ہر حال میں) فرمانبرداری کرو۔ اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اور (اللہ کے دین و ایمان پر ہر حال میں) ثابت قدم رہو۔ بلا شبہ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ (انفال : ۴۶)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ ۔

اور اگر تم نے روگردانی کی تو ہم تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لائیں گے۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (محمد : ۳۸)

ان آیاتِ کریمہ میں ملّتِ اسلامیہ کو جو احکام و ہدایات دیے گئے ہیں وہ سب اجتماعی نوعیت کے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ہر حکم ملّی، اجتماعی اور تمدّنی نقطۂ نظر سے ایک زرّیں اصول وضابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختلاف و افتراق کی حیثیت سے اس وقت دنیائے اسلام کی جو حالت وکیفیت ہے وہ دورِ رسالت کے عالمِ عرب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، جس کا نقشہ سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیات میں کھینچا گیا ہے۔ مگر محض وحدتِ کلمہ اور وحدتِ دین وملت نے وہ حیرت انگیز کرشمہ انجام دیا۔ جو اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی تاریخ آج بھی دہرائی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم دینِ الٰہی کو اس کا صحیح مقام ومرتبہ دینے کی کوشش کریں۔ ورنہ خود غرضی اور خواہشاتِ نفس کے ذریعہ کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا اتحادِ ملت کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور ہر قسم کے قومی، وطنی اور لسانی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صدائے ربانی پر کان دھریں اور اللہ کے سچے بندے بننے کی کوشش کریں۔ اس میں نہ صرف اپنی بقا کا سامان ہے بلکہ اسلام، دنیائے اسلام اور ایک ارب پیروانِ اسلام کی بقا کا سامان بھی ہے۔ هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ۔

خلافتِ ارض اور جہاد فی سبیل اللہ:

اوپر کے مباحث سے واضح ہو گیا کہ جب تک دینی و اسلامی بنیادوں پر عالمِ اسلام کو متحد کر کے ایک مضبوط اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار قائم نہیں کی جائے گی ہمارے اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور مادی حیثیت سے قوت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی، اور ہمارے ملک و ملت کا دفاع مکمل نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کے علاوہ اسلام کی مؤثر انداز میں تبلیغ، عالمِ انسانی کے درمیان صحیح معنی میں محاکمہ، سیاسی و بین الاقوامی تنازعات کی روک تھام، روئے زمین پر ہر قسم کے ظلم و زیادتی کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام وغیرہ اغراض و مقاصد کی تکمیل بھی مادی قوت و شوکت کے حصول پر موقوف ہے۔ اور یہ تمام اغراض و مقاصد "خلافتِ ارض" ہی کی بنیادی غرض و غایت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

کارِ خلافت کیا ہے؟ اس پر حسبِ ذیل آیت کریمہ بخوبی روشنی ڈال رہی ہے، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ــــــ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی تھے اور اسی اعتبار سے مادی قوت و شوکت سے بھی آراستہ تھے ــــــ مخاطب کر کے خصوصیت کے ساتھ کہا گیا:

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ:

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو۔ (ص: ۲۶)

اس لحاظ سے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس دھرتی پر عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ظلم و زیادتی کو مٹایا جائے۔ اور یہ معلوم ہے کہ کوئی کمزور شخص یا کمزور قوم زمین پر عدل و انصاف قائم نہیں کر سکتی۔ عدل و انصاف کے قیام کے لیے بھی قوت و طاقت کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ کمزوروں کو ظالموں سے اُن کا حق چھین کر دلایا جا سکے اور دنیا میں امن و امان

معال کیا جاسکے۔ یہ اصول نہ صرف معاشرتی اور اجتماعی لحاظ سے صحیح ہے بلکہ بین المملکتی اور بین الاقوامی حیثیت سے بھی صحیح ہے۔ کیونکہ "ظالم" انسان اور ناحق کوش قوم صرف "طاقت" کے آگے ہی سر جھکا سکتی ہے۔ اخلاق و عظ و نصیحت اس کے لیے کارگر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ آج ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ محض ذرا ذرا سی بات پر "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۶ — ۱۱۷۶ھ) تحریر فرماتے ہیں: "انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد لوگوں کے درمیان مظالم کی روک تھام کرنا بھی ہے۔ کیونکہ ان کی باہمی ظلم و زیادتی ان کے حال کو بگاڑ دیتی ہے اور ان پر زندگی تنگ کر دیتی ہے۔"[۱]

ان تمام مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے امت مسلمہ کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جن میں سب سے زیادہ مقدم دین و ملت کی حفاظت اور ان کا دفاع ہے۔ جہاد کوئی وقتی و عارضی فریضہ نہیں بلکہ قیامت تک جاری رہنے والا ایک مستقل فریضہ ہے جو عمومی حالات میں فرض کفایہ اور خصوصی حالات میں فرض عین بن جاتا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے۔) اسی بنا پر خلافتِ ارض کا جہاد کے ساتھ بہت گہرا ربط و تعلق ہے۔ لہٰذا خلافتِ ارض اور جہاد کے صحیح تعلق اور اس کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے شریعت میں جہاد کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اس موقع پر خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

علامہ کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) "بدائع الصنائع" میں لفظ جہاد کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "جہاد کے لغوی معنی طاقت لگانے یا کسی کام میں انتہائی جد و جہد کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد (اسلام کی مدافعت کے لیے) اللہ کی راہ میں اپنی وسعت و طاقت کے مطابق نفس، مال اور زبان کے ذریعہ جنگ کرنا یا اس میں

---

۱ حجۃ اللہ البالغہ، مبحث فی المظالم، ۲/۱۵۱، رشیدیہ دہلی، ۱۳۵۵ھ۔

مبالغہ کرتا ہے۔[1]

قاضی ابن رشد مالکی اندلسیؒ (۵۲۰ – ۵۹۵ ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ حسب ذیل آیت کی رُو سے جمہور علماء کے نزدیک جہاد فرض ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ[2] قتال (جنگ) تم پر فرض کی گئی ہے، حالانکہ وہ (طبعًا) تمہارے لیے گراں ہے (بقرہ: ۲۱۶)

فرضیتِ جہاد کے بارے میں دیگر آیتیں یہ ہیں:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ اور تم اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر (اس معاملے میں) زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[3]

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۷/۹۷، مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۰ھ۔

[2] بدایۃ المجتہد، ابن رشد، ۱/۳۲۵، مصر ۱۳۳۹ھ

[3] علامہ جصاص رازیؒ اس آیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بقول ربیع بن انس یہ پہلی آیت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلعم کا یہ معمول رہا کہ آپ صرف ان مشرکین سے مقاتلہ فرماتے جو آپؐ سے برسرِپیکار ہوتے تھے اور اس سے تجاوز فرماتے جو آپؐ کے درپے نہ ہوتا، یہاں تک کہ (جزیرۃ العرب کے) تمام مشرکین سے (اُن کی مسلسل سرکشی اور ایذا رسانی کی وجہ سے) قتال کا حکم آگیا۔ (احکام القرآن: ۱/۲۵۷)

ایک قول یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہ ہے: "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا" (اُن لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ اُن پر ظلم کیا گیا۔) یہ اور دیگر آیاتِ جہاد اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور پر نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تمامتر دفاعی تھا، جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط اور تم اُن سے یہاں تک لڑو کہ فتنہ (فسادِ عقیدہ) باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ (البقرہ: ۱۹۳)

فرضیتِ جہاد کی دوامیت پر ایک حدیث میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

والجهاد ماض منذ بعثني الله الى أن يقاتل آخر امتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل: جہاد جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے میری بعثت فرمائی ہے اُس وقت سے لے کر جب تک کہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے قتال نہ کرے برابر (ہر دور میں) جاری رہے گا۔ جس کو نہ تو کسی زیادتی کرنے والے (امیر) کی زیادتی باطل کر سکے گی اور نہ کسی عادل کی عدل گستری[1] (یعنی وہ ہر حال میں فرض رہے گا اور کسی صورت میں اور کسی حیلے سے ساقط نہ ہو سکے گا۔)

ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے:

الخيل معقود في نواصيها الخير الى يوم القيمة الأجر والمغنم: خیر قیامت تک گھوڑوں کی پیشانیوں سے بندھا ہوا ہے، یعنی اجر اور مال غنیمت (کے اعتبار سے)[2]

حافظ ابن حجرؒ (۷۷۳ــ۸۵۲ھ) اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر "خیر" سے مراد جہاد کا اجر و ثواب اور مال غنیمت ہے جو گھوڑوں سے جہاد کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، خواہ امام عادل ہو یا ظالم۔ اس حدیث میں جہاد کی ترغیب ہے اور قیامت تک اسلام اور اہل اسلام کے لیے بشارت بھی موجود ہے۔ کیونکہ بقائے جہاد کے لزوم سے مجاہدین کی بقا کا سامان

---

[1] ابو داؤد، کتاب الجہاد، ۳/۴۰، مطبوعہ حمص (شوریہ) ۱۹۷۱ء۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/۲۱۶، مطبوعہ استانبول، ۱۹۷۹ء۔ اس موقع پر گھوڑوں کے لفظ کو استعمال کیے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد قیامت تک گھوڑے ہی رہیں گے، بلکہ جو بھی ذریعہ یا وسیلہ استعمال کیا جائے۔ اصل میں یہاں پر جہاد کی روح کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے:

لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق[1]: میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق کی مدافعت میں لڑتا رہے گا۔

جہاد کی تعریف اور اُس کے مقاصد کے مطالعے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد نام ہی اس بات کا ہے کہ دشمنانِ اسلام کو اپنے ملکوں میں در آنے سے رد کا جائے اور اپنے دین و ملت کا بحدّ استطاعت دفاع کیا جائے۔ مگر غیر مسلموں میں اس کا مفہوم محض "جنگ" سمجھا جاتا ہے جو ان کی اپنی غلط فہمی ہے۔ اور مخالفینِ اسلام خصوصاً مستشرقین نے اس نظریہ کو خوب اچھالا، گویا کہ اسلام بھی ایک "خونی" مذہب ہے اور اس کو "خون آشامی" کی چاٹ پڑ گئی ہے۔ مگر اوپر جو آیتیں نقل کی گئی ہیں وہ سب اس قسم کے مہمل نظریات کی تردید کرتی ہیں۔

مکی دور میں مسلمان کس مپرسی کے عالم میں تھے۔ اس لیے اُس وقت جہاد فرض نہیں تھا۔ مگر جب مدنی دور میں انھیں قوت و طاقت حاصل ہو گئی اور اسلام جغرافیائی اعتبار سے ایک قطعۂ ارض کا مالک بن گیا تو اُس وقت اسلامی سلطنت کو ہر قیمت پر بچانا اور دشمنوں کی حرص و آز سے اس کو محفوظ رکھنا ضروری ہو گیا، تاکہ اسلام اپنی باطنی خوبیوں اور اخلاقی محاسن کی بناء پر قدرتی طور پر نشو و نما پاتا رہے اور اس راہ میں سدّ راہ اور مزاحم بننے والی ہر طاغوتی قوت و طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے اور پوری قوت کے ساتھ ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنایا جا سکے لہٰذا ایسے نازک موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور انھیں اپنے دین و ملت کی مدافعت کرنے اور برابر کا بدلہ لینے کی تاکید کی گئی تاکہ بین الاقوامی اعتبار سے فتنوں کا سدّباب ہو جائے مگر یہ اخلاقی اصول بھی بیان کر دیا گیا کہ کسی قوم کے خلاف ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔

---

[1] فتح الباری، ۳۶/۶، مطبوعہ مصر۔

جیسا کہ حسب ذیل آیات سے اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ۝ اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ (شوریٰ: ۳۹)

فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور یقین مانو کہ اللہ ڈر نے والوں کے ساتھ ہے۔ (البقرہ: ۱۹۴)۔

یہ اسلام کا وہ بیش بہا اصول جنگ ہے جو دنیا کی دیگر قوموں اور ان کے ظالمانہ قوانین کے مقابلے میں ایک مثالی اہمیت و نوعیت کا مالک ہے۔ جیسا کہ تاریخ عالم شاہد ہے غیر اسلامی قوموں کے پاس جنگ کے موقع پر اخلاقیات کا کوئی خانہ ہی نہیں تھا۔ اور یہی حال موجودہ دور کا بھی ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی جنگوں میں اصل فرق بنیادی مقصد اور آئیڈیالوجی کا ہے۔ مسلم قوم جب جنگ کرتی ہے تو اس کے سامنے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ احکام الٰہی کا ہر حال میں پابند رہتا ہے۔ اور دیگر قوموں پر بے جا ظلم و زیادتی کو وہ نہ صرف ایک اخلاقی گناہ سمجھتا ہے بلکہ وہ اس کو خدا کی نافرمانی بھی تصور کرتا ہے۔ اس کے برعکس دیگر قوموں کے پاس اس قسم کا کوئی اعلیٰ و ارفع تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض اپنی شان و شوکت اور قومی و نسلی تفاخر کے اظہار کے طور پر تلوار اٹھاتی ہیں۔ اس بنیادی فرق کی وضاحت قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ۝ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور جو منکر خدا ہیں وہ طاغوت[1]

[1] طاغوت کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے ساحر، کاہن اور سرکش جن (باقی ص ۲۱ پر)

کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم شیطان کے (ایسے) ساتھیوں سے لڑو (اور جان رکھو کہ) شیطان کی تدبیر بلاشبہ کمزور ہوتی ہے۔[1] (النساء: ۷۶)

اس اصول کی وضاحت احادیث میں اس طرح کی گئی ہے:

• ایک شخص نے رسول اکرم صلعم سے دریافت کیا: بتائیے ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، دوسرا شخص نام و نمود کے لیے لڑتا ہے، اور کوئی شخص اپنے مرتبے کو بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ صرف وہ شخص اللہ کی راہ میں ہوگا جس نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جنگ کی ہو۔"[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے۔" اس سے مراد ہے حد سے آگے بڑھ جانے والا اور ہر وہ معبود جو خدا کے سوا ہو۔" (المفردات، ص ۳۰۵) معبود بنا لینے کا مفہوم موجودہ اصطلاح کے مطابق کوئی ایسا نظریۂ حیات ہو سکتا ہے جو خدا کا باغی یا خدا بیزار قسم کا ہو۔ جیسے کمیونزم اور نیشنلزم وغیرہ۔

[1] دشمن کے مقابلے کے لیے نفسیاتی اعتبار سے سپاہیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے جدید فلسفۂ جنگ کے مطابق مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور اس بات کی سر توڑ کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی فوج دشمن کے مقابلے میں حوصلہ نہ ہارے۔ کیونکہ یاس اور نا امیدی ہمیشہ شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جو لشکر یا جماعت حوصلہ ہار دے وہ میدان میں ٹھہر ہی نہیں سکتی، اس کا کامیاب و کامران ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس نکتے کو قرآن نے چودہ سو سال پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر اس حقیقت پر بھی روشنی ڈال دی کہ جہاد کی صورت میں دو ہی نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں: یا تو فتح و کامرانی حاصل ہوگی یا پھر جام شہادت نوش کرنے کے باعث حیات جاودانی۔ ان دونوں ہی صورتوں میں گویا کہ گوہر مقصود حاصل رہے گا:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے کسی ایک ہی کے منتظر رہتے ہو۔ (توبہ: ۵۲)

[2] صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/۲۰۶، مطبوعہ استانبول۔

" اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنا" (اعلائے کلمۃ اللہ) ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں پوری شریعت اسلامیہ کا نفاذ داخل ہے۔ اس اعتبار سے اس میں تمام اخلاقی مفاسد کی روک تھام اور ہر قسم کے ظلم و عدوان کا استیصال بھی شامل ہے۔ تاکہ یہ دھرتی صحیح معنی میں امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے اور پوری مخلوق الٰہی (الخلق عیال اللہ کے مطابق) ایک وسیع کنبے کی شکل میں چین و سکون کا سانس لے اور کسی کو بھی مراسم عبودیت کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو۔ یہ جہاد کا صحیح فلسفہ اور اس کی اصل روح ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ط اور اُن سے یہاں تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو جائے۔ (انفال: ۳۹)

لفظ فتنہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں امام راغب اصفہانیؒ (متوفی ۵۰۲ھ) نے بہت بہترین تحقیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:

" فتنہ کی اصل سونے کو آگ میں تپانا ہے تاکہ اس کا کھوٹ زائل ہو اور اس کی چمک دمک ظاہر ہو جائے۔ اور اس طرح یہ انسان کو آگ میں داخل کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: (يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ)[1] اس اعتبار سے اس کے دو محل ہیں: کبھی تو اس سے عذاب مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: (اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا)[2] اور کبھی اس سے آزمائش مراد ہوتی ہے۔ جیسے: (وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا)[3]

اور لفظ فتنہ "بلاء" کی طرح شدت اور آسائش دونوں حالتوں کے لیے استعمال

---

[1] ترجمہ: جس دن کہ وہ آگ پر رکھے جائیں گے۔ (ذاریات: ۱۳)
[2] خوب سمجھ لو کہ یہ (منافقین) خرابی میں پڑ چکے ہیں۔ یعنی نتیجے کے اعتبار سے) (توبہ: ۴۹)
[3] (اے موسیٰ) ہم نے تجھ خوب آزمایا۔ (طٰہٰ: ۴۰)

کہا جاتا ہے۔ مگر یہ شدت کے معنی میں زیادہ ظاہر اور بکثرت مستعمل ہے۔ ان دونوں حالتوں کے بارے میں ارشاد ہے: (وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً)[1] چنانچہ شدت و سختی کے بارے میں ارشاد ہے: (إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ)[2] نیز: (وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[3] نیز: (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ)[4]

لفظ فتنہ ان افعال میں سے ہے جن کا صدور اللہ کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور بندے کی طرف سے بھی۔ جیسے بَلاء، مصیبت، قتل اور عذاب وغیرہ ناپسندیدہ افعال مگر یہ افعال جب اللہ کی جانب سے ہوں تو وہ بتقاضائے حکمت ہوں گے لیکن اگر ان کا صدور انسان کی جانب سے اور بغیر حکم الٰہی ہو تو پھر وہ اس کے خلاف ہوں گے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ طرح طرح کے فتنوں کی وجہ سے انسان کی مذمت کی ہے: (وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[5] نیز: (إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ)[6]۔

---

[1] اور ہم تم کو اچھی اور بری دونوں حالتوں میں بطور امتحان آزماتے ہیں۔ (انبیاء: ۳۵)

[2] ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں۔ (البقرہ: ۱۰۲)

[3] اور فتنہ جوئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (البقرہ: ۱۹۰)

[4] ان کفار و مشرکین سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے۔ (البقرہ: ۱۹۳)

[5] اور فتنہ جوئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (البقرہ: ۱۹۰)

[6] جن لوگوں نے اہل ایمان کو فتنے میں مبتلا کیا۔ (بروج: ۱۰)

(ملخص از المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۷۱-۳۷۲، بیروت)

عام تفسیروں میں زیر بحث آیت کریمہ میں فتنے سے مراد خاص کر شرک و کفر بتایا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، تفسیر کشاف اور احکام القرآن از جصاص وغیرہ) یہ اصل میں دور نزول کے حالات و واقعات کے انطباق کی وجہ سے تھا۔ جب اس کے الفاظ عام ہیں تو پھر اس کو عام ہی رکھنا چاہیے تاکہ وہ ہر دور کی آزمائشوں کا مصداق بن سکیں۔

بہرحال اسی بنیادی غرض و غایت کی بنا پر جہاد فرض کیا گیا ہے۔ اور تمام علمائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ جہاد اُمت مسلمہ پر فرض ہے۔ مگر بقول حافظ ابن حجر مذہب شافعی میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ یعنی آیا یہ فریضہ ہر ہر شخص کے ذمے ہر حال میں ضروری ہے یا بعض افراد اگر اس فریضے کو ادا کر دیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے ساقط ہو جاتا۔ نیز آگے فرماتے ہیں:

"تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلعم کے دور میں اُن لوگوں پر فرض عین تھا جن کو رسول اللہ صلعم نے اس کام پر مامور فرما دیا تھا مگر آپ کی وفات کے بعد یہ مشہور قول کے مطابق فرض کفایہ ہے، الا یہ کہ کوئی (ہنگامی) ضرورت پیش آجائے اور دشمن اچانک آپڑے۔ تو اس وقت امام وقت جس کو (اس کام کے لیے) متعین کر دے اُس کے ذمّے یہ (فرض) عین بن جائے گا۔" [1]

احناف کے نزدیک جہاد اُس وقت تک فرض کفایہ ہے جب تک کہ "نفیر عام" (یا ہنگامی حالات کا اعلان) نہ ہو جائے۔ جب نفیر عام ہو جائے تو پھر یہ (اُن تمام افراد پر جو اس کے اہل ہوں) فرض عین بن جائے گا۔ جیسا کہ حسب ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ [2] نکل پڑو ہلکے یا بھاری ہو کر (کم سامان یا زیادہ سامانِ اسلحہ کے ساتھ۔) اور جہاد کرو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ سکو۔ (توبہ: ۴۱)

اور جہاد کے عمومی حالات میں فرض کفایہ ہونے کی دلیل یہ دی جاتی ہے:

---

[1] فتح الباری، ۶/۲۴، مطبوعہ مصر۔

[2] ہدایہ اولین، ص ۵۳۸ - ۵۳۹، مجتبائی دہلی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام اہل ایمان (جہاد کے لیے) نکل کھڑے ہوجائیں اس لیے اُن کے ہر ہر فرقے میں سے ایک (خاص) جماعت کیوں نہیں نکلی تاکہ وہ دین کی سمجھ (علم کے ذریعہ دین میں رسوخ) حاصل کرے۔ اور جب وہ (رسوخ فی الدین حاصل کرکے) لوٹیں تو اپنی قوم کو متنبہ کرسکیں۔ تاکہ وہ (پورے دین پر عامل ہوکر عذاب الٰہی سے) بچ سکیں۔

(توبہ: ۱۲۲)

اس آیت کریمہ کے مطابق اہل ایمان کی دو جماعتیں ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت جہاد میں مصروف رہ کر ملک و ملت کا دفاع کرتی رہے اور دوسری علم دین حاصل کرکے اپنی قوم و ملت کی دینی اعتبار سے قیادت کرے اور اس کو خصوصیت کے ساتھ "ایام اللہ" سے آگاہ اور متنبہ کرتی رہے۔[۲]

علامہ ابن قیمؒ (۶۹۱ - ۷۵۱ھ) نے اس سلسلے میں بڑی فکر انگیز بات تحریر فرمائی ہے:

"اور تحقیق یہ ہے کہ جنس جہاد فرض عین ہے خواہ وہ قلب کے ذریعہ ہو یا لسان کے ذریعہ یا مال کے ذریعہ یا ہاتھ کے ذریعہ۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اقسام میں سے کسی ایک کے ساتھ جہاد کرے۔ اب رہا معاملہ جہاد بالنفس کا تو یہ فرض کفایہ ہے"[۳]

---

[۱] بدایۃ المجتہد، قاضی ابن رشد، ۱/ ۳۲۵، مطبوعہ مصر۔

[۲] ایام اللہ سے مراد گزشتہ قوموں کے وہ سبق آموز حالات و واقعات ہیں جو مخاطبین کی تذکیر و تنبیہ کی خاطر قرآن میں مذکور ہیں۔ اسی کو حضرت شاہ ولی اللہ نے "التذکیر بایام اللہ" کا نام دیا ہے، جو قرآن کے علوم خمسہ میں سے ایک مستقل علم ہے۔ (الفوز الکبیر) اور اس موضوع پر سیکڑوں ہزاروں آیتیں بکھری ہوئی ہیں۔

[۳] زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ۲/ ۵۸، دار الافتاء ریاض۔

ایک دوسرے موقع پر علامہ موصوف نے مراتب جہاد کی چار قسمیں بیان کی ہیں جو یہ ہیں: (۱) نفس کے ساتھ جہاد (۲) شیطان کے ساتھ جہاد (۳) کفار کے ساتھ جہاد (۴) اور منافقین کے ساتھ جہاد۔[1] پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد شکلیں بیان کی ہیں، جن کی تفصیل یہاں پر غیر ضروری ہے۔ مگر جہاد کے فلسفے پر آغاز بحث میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ اس موقع پر درج کرنے کے قابل ہے۔

○ چونکہ جہاد اسلام کی اونچی چوٹی ہے اور جنت میں مجاہدین کی منزلیں سب سے اعلیٰ ہوں گی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے، اور آپؐ نے جہاد کی تمام قسموں ــــ قلبی جہاد، دعوتی جہاد اور تلوار کے ذریعہ جہاد ــــ کو ادا فرمایا۔ آپؐ کے تمام اوقات (پوری زندگی) اس کام کے لیے وقف تھے۔ اور اسی بنا پر آپؐ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک سب سے اونچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی بعثت کے ساتھ ہی آپؐ کو جہاد کا حکم دے دیا تھا:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک تنبیہ کرنے والا بھیج دیتے۔ (مگر ہم نے ایسا کرنے کی بجائے ایک جامع کتاب اتار دی جو سب کے لیے کافی ہو جاتی۔) لہٰذا تم منکرین کے کہے میں مت آؤ اور اس (قرآن) کے ذریعہ زور وشور سے ان کا مقابلہ کرو۔ (فرقان: ۵۱-۵۲)

یہ مکی سورت ہے جس میں حجت و بیان اور تبلیغ قرآن کے ذریعہ کفار سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چونکہ افضل ترین جہاد شدید رکاوٹوں کے باوجود حق بات کہنا ہے، جو انبیاء علیہم السلام ہی کا کام اور ان کا دل گردہ تھا، مثلاً ایسے آدمی کے سامنے بات کرنا جس کی ہیبت چھائی ہوئی ہو یا جس سے ایذارسانی کا خوف ہو، اس لیے ہمارے نبی کریم صلعم کا اس باب میں کامل

---

[1] ایضاً۔ ۳۹/۲

اور کامل جہاد کا نمونہ موجود ہے۔[1]

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں شدید خواہش رکھتا ہوں اس بات کی کہ میں راہ الٰہی میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں۔[2]

اس سے جہاں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف جہاد کی فضیلت اور اُس کی اہمیت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاد ملت اسلامیہ کے لیے سراپا زندگی اور سراپا حیات ہے۔ جب کہ ترک جہاد اس کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ آج عالم اسلام میں جتنے بھی مفاسد اور رخنے پیدا ہو گئے ہیں وہ سب ترک جہاد اور روح جہاد سے اعراض اور روگردانی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔ جہاد سے منہ موڑنے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی اور دوسروں کی غلامی و ذلت کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اگر تم (جہاد کے لیے) نہ نکلو گے تو اللہ تم کو دردناک (دنیوی) عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ (وہ اس طرح کہ) وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا (جو یا تو تم پر مسلط ہو جائے گی یا تم کو کاٹ کر پھینک دے گی) اور تم اُس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ (توبہ : ۳۹)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا کہ اسلام دشمن قوتیں ہمیشہ اہل اسلام سے برسرپیکار رہتی ہیں۔

---

[1] ایضاً ۲/ ۳۸۔
[2] صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/ ۲۰۳، استانبول، ۱۹۷۹ء۔

اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ موقع ملتے ہی تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں، لہٰذا ایسے چالاک دشمنوں سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے جو مسلسل گھات میں رہتے ہیں۔ (جیسا کہ آج دنیا کے بہت سے اسلامی ملکوں کو اغیار نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے) یہ بھی ایک صداقت ہے کلام ربانی کی کہ اس کی پیش خبریاں ہر دور میں برابر پوری ہوتی رہی ہیں۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا اور یہ (منکرین حق) تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمھیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اگر وہ (تم پر) قابو پا جائیں۔ (بقرہ: ۲۱۷)

جغرافیائی اعتبار سے مختلف خطہ ہائے ارض میں بسنے والے دینی بھائی جب کسی اعتبار سے مشکل حالات سے دوچار ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کے طالب ہوں تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مدد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور ایسے مواقع پر اپنے کلمہ گو بھائیوں کی مدد نہ کرنے کو بہت بڑا فتنہ و فساد کہا گیا ہے:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہو جائے گا۔ (انفال: ۷۳)

ایک دوسرے موقع پر بطور ایک عمومی اصول بیان کیا گیا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ: اور اگر اللہ (اپنی سنت جاریہ کے مطابق) انسانی (گروہوں میں سے) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ (بقرہ: ۲۵۱)

یہی وجہ ہے کہ جہاد ہر حال میں فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کی اس قدر شدید تاکید کی گئی ہے۔ جہاد کی اہمیت و فضیلت اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں سے قرآن و حدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جہاد سے منہ موڑنا منافقین کی علامت اور جہاد کی خاطر اپنا مال و متاع اور اپنی جانیں وغیرہ سب کچھ لٹا دینا

والوں کی صفت ہے۔

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ۝ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝ لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝۔

اور جب (اس مضمون کی) کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ جہاد کرو تو (ایسے موقع پر) مالدار لوگ تجھ سے رخصت مانگنے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بیٹھنے والوں (جنگ میں کسی معذوری کی بنا پر شرکت نہ کرنے والوں) کے ساتھ رہنے دیجیے۔ وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے (اور اس طرح) ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔ اس لیے وہ (قانون خداوندی کو) نہیں سمجھے۔ لیکن رسول اور اس کے ساتھ جو ایمان والے لوگ ہیں انھوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا۔ انھیں کے لیے ہیں تمام بھلائیاں۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (توبہ: ۸۶-۸۸)

جہاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر ایمان باللہ کے فوراً بعد جہاد کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ ایمان باللہ کا تقاضہ ہے کہ جہاد کیا جائے۔ بالفاظ دیگر جب ایمان باللہ خطرے میں پڑ جائے یا اہل ایمان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے تو اس موقع پر جہاد ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے موقع پر جہاد کو ایمان ویقین کی نشانی قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ کسی بھی شخص یا کسی بھی قوم کے دعوائے صدق وسچائی کا معیار ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ پورے مومن وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر انھوں نے (کسی بھی معاملے میں) شک نہیں کیا۔

اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ (حجرات ۱۵:۴۹)

جہاد کی اس قدر اہمیت و منزلت کیوں ہے؟ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے بڑی حکیمانہ بات تحریر فرمائی ہے:

" جان لو کہ شریعتوں میں سب سے زیادہ مکمل شریعت وہی ہو سکتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف ٹھہرانا ایسے ہی ہے جیسے کسی صاحب کے نوکر چاکر بیمار ہو گئے ہوں اور وہ اپنے کسی خاص آدمی سے کہے کہ وہ ان بیماروں کو دوا پلا دے۔ لہٰذا اگر وہ شخص اُن کو زبردستی دوا پلائے تو اس کو اس کا حق حاصل رہے گا لیکن شفقت کا تقاضہ ہے کہ وہ ان کے سامنے دوا کے فوائد بیان کر دے تاکہ وہ اس کو برضا و رغبت پی سکیں اور یہ بھی بہتر ہے کہ وہ اس دوا میں تھوڑی سی شہد ملا دے تاکہ اس میں طبعی و عقلی دونوں رغبتیں باہم مل جائیں۔

نوعِ انسانی کے تعلق سے (اللہ تعالیٰ کی) رحمت کاملہ کا تقاضہ ہے کہ وہ اس کو حسنِ عمل کی طرف لے جائے، ظالم کو اس کے ظلم سے روکے اور انسان کے تمام عائلی و اجتماعی معاملات کو درست کرے۔ اس اعتبار سے وہ (تمام) شہر جو (تہذیبی و تمدنی اعتبار سے) فاسد ہو چکے ہوں اور جن پر درندہ صفت افراد غالب آ گئے ہوں اور نیز ان کو نہایت درجہ قوت حاصل ہو چکی ہو، وہ جسم انسانی کے ایک ناسور کی طرح ہیں جس کو کاٹ کر پھینکے بغیر انسانی جسم درست نہیں ہو سکتا۔ اور جب تھوڑی سی برائی سے بہت بڑا خیر حاصل ہو سکتا ہو تو یہ فعل واجب العمل ہوگا[1]"

پھر آگے فرماتے ہیں:

" جان لو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خلافت عامہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ دیگر ادیان پر آپ کے دین کا غلبہ صرف جہاد و عدِ آلات کی تیاری ہی کے ذریعہ برپا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اہل اسلام جہاد کو ترک کر کے بیلوں کی دُموں کے پیچھے پڑ جائیں تو ان کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور دیگر اہل مذاہب ان پر

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ملخص از مبحث فی الجہاد، ۱۷۰/۲، رشیدیہ دہلی۔ [2] ایضاً، ۱۷۲/۲۔

فلسفہ حدودِ اسلامی پر ایک نظر

از جناب شاہد علی صاحب عباسی، ایم، اے (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

حدودِ[1] اسلامی کے نفاذ سے متعلق متعدد نقاطِ نظر سامنے آئے ہیں جن میں رحم ودیعت کردہ قدرت عام ہے۔

گو اس کے کئی درجات ہیں، ان میں سے بعض اہم درجِ ذیل ہیں:

(ا) مادیت کی وبا سے متأثرہ افراد کا احتجاج

(ب) مفکرین کا انسانی بنیادوں پر احتجاج

(ج) مفکرین کا عقلی بنیادوں پر احتجاج

(د) مادیت سے متأثرہ تعلیم یافتہ ضعیف الایمان مسلمان کی نفی حدود یا تدریجی نفی حدود

(ہ) مادیت سے کم متأثرہ، کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ضعیف الایمان مسلمان کا تقلیدی اثباتِ حدود یا سکوت

(و) مادیت سے کم متأثرہ، کم تعلیم یافتہ اوسط الایمان مسلمان کا دفاعی یا سادہ اثباتِ حدود

(ز) مادیت سے برگشتہ، زمانے کے تقاضوں سے بخوبی واقف، تعلیم یافتہ قوی الایمان کا دیگر مطالبوں کے ساتھ اثباتِ حدود

ان میں صحت پر آخر الذکر یعنی مادیت سے برگشتہ، زمانے کے تقاضوں سے بخوبی واقف، تعلیم یافتہ، قوی الایمان مسلمان ہیں جن کی نظر دیگر علل کے ساتھ علتِ عقلی یعنی امرِ الٰہی پر بھی ہے، جہاں تک اول الذکر یعنی مادیت سے متأثرہ افراد کا احتجاج ہے اگر وہ قانونِ الٰہی کی حقیقت کو

کا حقہ غور کیے بغیر احتجاج کر رہے ہیں تو قانون الہٰی کے بے بنیاد انکار کے ساتھ قانون انسانی کا حوالہ بے معنی ہے، اور اگر قانون الہٰی پر کما حقہ غور کیا ہے تو ہمارے نزدیک ان کا احتجاج ایک اذیت ناک مذاق ہے۔ ۳۔ ثانی الذکر یعنی مفکرین کا انسانی بنیادوں پر احتجاج تو ہم اس کا استقبال کرتے اور ان کو مزید دعوت فکر دیتے ہیں کیونکہ انسانی بنیاد کی بات کرنے والے ماقبل جرم، دوران جرم اور مابعد جرم، مجرم اور معاشرہ کی داخلی وخارجی کیفیات سے استغنا نہیں کر سکتے، انہی کے ذیل میں ہم رابع الذکر اور سادس الذکر حضرات سے بھی بطور خاص غور وفکر کرنے کی درخواست کرتے ہیں کیونکہ اگر ایک طرف ایک متبع اسلام کا دفاعی اثبات حدود معذرتانہ احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف نفی حدود یا تدریجی نفی حدود کی طرف رجحان یا بالفاظ دیگر اصرار افتا سفہ ومتحیر کرتا ہے۔ ثالث الذکر حضرات سے ہم صرف اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ محض آپ ہی کی عقل معیار کیوں ہے؟ عقل یا تو مادہ یا نفس کی تابع ہوگی یا اللہ کی تابع اور ایک مسلمان اللہ کی تابع عقل کو عقل حقیقی اور مادہ یا نفس کی تابع عقل کو عقل مجازی سمجھتا ہے۔

سزا، عقاب، قصاص، تادیب ———— (PUNISHMENT) کے متعلق اثباتی وانکاری کئی نظریات[۱] سامنے آتے ہیں:

اثباتی: ۱۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت (LEX TALIONIS)

۲۔ دوسرے لوگوں کو عبرت ہوتی ہے اور وہ ارتکاب جرم سے رکتے ہیں۔

۳۔ نظام اجتماعی کی تجدید یا از سر نو قیام۔

۴۔ مجرم کی اصلاح۔

انکاری: ۵۔ فرد کو تنہا کر سکتی ہے۔

۶۔ اپنا رویہ بدلنے کے بجائے وہ زیادہ ماہر جرم کار [illegible] سے بچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

۷۔ فرد میں عادت، تناؤ اور غیر پسندیدہ رجحانات خلاف خوف یا خود اعتمادی کی کمی پیدا کر دیتی ہے۔

....

۹۔ ایسے ناسمجھ نہیں بلکہ عوام میں بھی نسبتاً بلند حیثیت و منصب حاصل کر لیتا ہے۔
۱۰۔ اصلاح کی کوشش تعمیری ہونی چاہیے جب کہ سزائے جسمانی اس کے خلاف ہے
حقیقتاً قوت کا استعمال مجرم کرا پا رد یہ رضا کارانہ بدلنے سے روک دیتا ہے۔

اثباتی نظریات میں رائج الذکر یعنی مجرم کی اصلاح بذریعہ سزا کوئی کلیہ نہیں، یہ انہی کے حق میں معتبر ہے جن پر جنون غالب نہ ہو، جو نفس کے عارضی دباؤ کو برداشت نہ کر پائے ہوں اور دانستہ یا نادانستہ جرم کے مرتکب ہو گئے ہوں۔ انکاری نظریات کی بنیاد مجرم اور معاشرہ کی مفروضہ بے تعلقی اور باہمی نفرت و تناؤ پر قائم ہے لیکن اسلام فرد کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، معاشرہ کو تاکید ہے کہ تائب سے نہ تحقیرانہ برتاؤ کرے نہ اس کو تائب منہ جرم پر عار دلائے بلکہ ایک بازیافتہ بھائی کی طرح اس کو سینہ سے لگا لے، تاریخ اسلام اس کے متعدد عملی ثبوت رکھتی ہے جو بتاتے ہیں کہ یہ بات نہ محال ہے نہ مستبعد۔ آخر الذکر نظریہ مغرب میں بکثرت شائع ہے اور مغرب ہی کے ایک فاضل کے بیان کے مطابق قانون کی مخالفت کسی نہ کسی شکل میں روز افزوں نظر آتی ہے اور اس کے اشارے موجود ہیں کہ یہ مطلع کردہ جرائم سے بدرجہا زیادہ پھیل گئی ہے۔

اب آئیے اختلافِ فکر و آراء کی طرف:

ہر شخص کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے جس کے پیچھے ذہنی سطح کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور جنبہ داری و طبقاتی اختلاف بھی، اختلافِ حالات و طبائع بھی ہو سکتا ہے اور اختلافِ تجربات بھی، چنانچہ جرم کی سزا ہی کے متعلق اگر ایک سوالنامہ مرتب کر کے مجرمین حضرات، پولیس عدالت، ماہرین قانون، ماہرین نفسیات، ماہرین سماجیات، ماہرین جرمیات وغیرہم سے جوابات لئے جائیں تو یہ چیز واضح ہو جائے گی۔ اب ایک عامی اس الجھن میں پڑ سکتا ہے کہ نا پختہ و پختہ ذہنوں کے کن متضاد و متصادم مطالبات کس متعدد دلیل کے تحت قبول کرے! اور اس کی ...

سرمایہ داری و اشتراکیت ... سرمایہ دار ممالک کو فرد کی تقدیس میں غلو ہے

سرمایہ دار ممالک میں جرائم سے متعلق قوانین نے متعدد کردیم ... کہ

آدمی کو ہر کام کی اجازت ہونی چاہیے جب تک کہ وہ ...

بالخصوص اخلاقی نظریات چونکہ فرد اجتماع سے متعلق ہیں ...

قانون کا دائرۂ عمل جتنا سکڑتا جارہا ہے ممنوعہ افعال کی شرح ...

ہمہ جہت انحطاط رفتہ رفتہ قوی ہوتا جارہا ہے۔ انسان کے جذبۂ آزادی کو ...

کرنے یا تیور لگانے کی کوشش نفسِ انسانی کی حقیقت سے ٹکراؤ اور مجرم کے اف...

صرف بگڑے ہوئے ماحول، نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض پر ڈال کر اسے برائے خود قابلِ

ہمدردی تصور کرنا فرد کی تقدیس و احترام میں غلو ہی کا ایک پہلو ہے۔

اشتراکی ممالک میں بھی رجحان، اخلاقی اقدار کے بے معنی ہونے کی طرف ہے، جب تک

فرد کے افعال و اقوال سیاست و اجتماع کی ہیئت ترکیبی اور ریاست کی کارکردگی پر خفیف ...

میں بھی اثرانداز نہیں ہوتے، اس سے بازپرس نہیں ہوتی۔ جرم کی بنیاد محض اقتصادی ...

تصور کرنے والے یہ لوگ اپنے ملک میں جرم کی موجودگی کی وجوہات پر غور نہیں کرتے۔

جرم کی جو قیمت معاشرہ کو پیسے کی شکل میں اور مجرمین کو ذاتی ناآسودگی کی شکل میں ادا ...

پڑرہی ہے غیر معمولی ہے گو اندازہ صرف اول الذکر ہی کا لگایا جاسکتا ہے یعنی بلحاظِ قدر برطانیہ

میں سالانہ دو ہزار ملین پاؤنڈ (2,000,000,000 ...) کا اندازہ لگایا گیا ہے اور

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس کا کم و بیش دس گنا ہے۔

مغربی تحقیق نفسیات پر ایک نظر	مغربی محققین نفسیات کی خدمات سے انکار نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے

کہ جذبۂ لاشعور کے پیچھے فرائڈ (المتوفی ۱۹۳۹ء) کا جبلتِ جنس کو،

ایڈلر (المتوفی ۱۹۳۷ء) کا حبِ تفوق کو اور یونگ (المتوفی ۱۹۶۱ء) کا آرکی ٹائپ

(ARCHETYPE) کو غیر معمولی قوت کے ساتھ

تحقیق کے محدود ... میدان کا مرکب ہے

... جذبیت کی ...

... فی مقام ...

... معارف ...

... کوشش کو وسیع کرنے میں چونکہ ان محققین نفسیات کا رجحان

... نفسی میں سرزد ہونی والی لغزشوں کی طرف توجہ مبذول کرلیتے ہیں:

... وغیر مشتعل نفس کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ جذبات واحساسات

... ارادی ہی سے قابو میں رکھے جاسکتے ہیں، اشتعال یا برانگیختگی

... پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ پراگندگی کی شکل میں سامنے آتا ہے، اگر

... اگرچہ ابتدائی درجہ میں سکون مل گیا لیکن اکثر نفس کو تقاضہ اور تسکین

... رفتہ رفتہ وقفہ کم سے کم ہونے لگتا ہے اور چونکہ ہر تقاضہ کی فوری تسکین

... شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ انسان دیوانگی کے اس مقام پر

... نتائج وعواقب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اب ان سوالات کے جوابات کون دے

... نفس کی حد کیسے متعین ہوگی ؟ کون متعین کرے گا ؟ اور آیا یہ حد اس کے لیے قابل

... ہو لی ہے۔

کما حقہ' غور کیے بغیر احتجاج کر رہے ہیں اور قانون الٰہی کے بے بنیاد انکار کے ساتھ قانون انسانی کا حوالہ بے معنی ہے' اور اگر قانون الٰہی پر کما حقہ' غور کیا ہے تو ہمارے نزدیک ان کا احتجاج ایک اذیت ناک مذاق ہے۔ سبز ثانی الذکر یعنی منکرین کا انسانی بنیادوں پر احتجاج تو ہم اس کا استقبال کرتے اور ان کو رہ یدہ عوت فکر دیتے ہیں کیونکہ انسانی بنیادوں بات کرنے والے ماقبل جرم' دوران جرم اور مابعد جرم مجرم اور معاشرہ کی داخلی وخارجی کیفیات سے استغنا نہیں کر سکتے۔ الٰہی کے ذیل میں ہم رابع الذکر اور سادس الذکر حضرات سے بھی بطور خاص غور وفکر کرنے کی درخواست کرتے ہیں کیونکہ اگر ایک طرف ایک متبع اسلام کا دفاعی اثبات حدود معذرتانہ احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف نفی حدود یا تدریجی نفی حدود کی طرف رجحان یا بالفاظ دیگر اصرار متاسف و متحیر کرتا ہے۔ ثالث الذکر حضرات سے ہم صرف اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ محض آپ ہی کی عقل معیار کیوں ہے؟ عقل یا تو مادہ یا نفس کی تابع ہو گی یا اللہ کی تابع اور ایک مسلمان اللہ کی تابع عقل کو عقل حقیقی اور مادہ یا نفس کی تابع عقل کو عقل مجازی سمجھتا ہے۔

سزا (عقاب' قصاص' تادیب ——— PUNISHMENT) کے متعلق اثباتی وانکاری کئی نظریات[2] سامنے آتے ہیں:

اثباتی | ۱۔ آنکھ کے بدلے آنکھ' دانت کے بدلے دانت (LEX TALIONIS)

۲۔ دوسرے لوگوں کو عبرت ہوتی ہے اور وہ ارتکاب جرم سے رکتے ہیں۔

۳۔ توازن اجتماعی کی تجدید یا از سر نو قیام۔

۴۔ مجرم کی اصلاح۔

انکاری | ۵۔ فرد کو تنہا کر سکتی ہے۔

۶۔ اپنا رد یہ بدلنے کے بجائے وہ زیادہ محتاط ہو سکتا اور گرفتاری سے بچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

۷۔ فرد میں عادتاً نئے اور غیر پسندیدہ رجحانات مثلاً خوف یا خود اعتمادی کی کمی پیدا کر دیتی ہے۔

۳۔ اپنے ہم عصروں بلکہ عوام میں بھی نسبتاً بلند حیثیت و منصب حاصل کر لیتا ہے۔

۴۔ اصلاح کی کوشش تعمیری ہونی چاہیے جب کہ سزائے جسمانی اس کے خلاف ہے

حیثیت قوت کا استعمال مجرم کو اپنا رویہ رضاکارانہ بدلنے سے روک دیتا ہے۔

انتقامی نظریات میں رائج الذکر یعنی مجرم کی اصلاح بذریعہ سزا کوئی کلیہ نہیں، یہ انھی کے حق میں معتبر ہے جن پر صرف غلبۂ خیر ہو، جو نفس کے عارضی دباؤ کو برداشت نہ کر پائے ہوں اور دانستہ یا نادانستہ جرم کے مرتکب ہو گئے ہوں۔ انکاری نظریات کی بنیاد مجرم اور معاشرہ کی منفردانہ بے تعلقی اور باہمی نفرت و تناؤ پر قائم ہے لیکن اسلام فرد کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، معاشرہ کو تاکید کرتا ہے نہ تحقیرانہ برتاؤ کرے نہ اس کو تا بہ عمر جرم پر طعنہ دلائے بلکہ ایک بازیافتہ بھائی کی طرح اس کو سینہ سے لگائے، تاریخ اسلام اس کے متعدد عملی ثبوت رکھتی ہے جو بتاتے ہیں کہ یہ بات نہ محال ہے نہ مستبعد۔ آخر الذکر نظریہ مغرب میں بکثرت شائع ہے اور مغرب ہی کے ایک فاضل کے بیان کے مطابق قانون کی مخالفت کسی نہ کسی شکل میں روز افزوں نظر آتی ہے اور اس کے اشارے موجود ہیں کہ یہ مطلع کردہ جرائم سے بہت زیادہ پھیل گئی ہے۔

اب آئیے اختلافِ فکر و آراء کی طرف:

ہر شخص کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے جس کے پیچھے ذہنی سطح کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور پیشہ وارانہ و طبقاتی اختلاف بھی، اختلافِ حالات و طبائع بھی ہو سکتا ہے اور اختلافِ تجربات بھی، چنانچہ جرم کی سزا ہی کے متعلق اگر ایک سوالنامہ مرتب کر کے مجرمین، حاضرین و غیر حاضرین، پولیس عدالت، ماہرین قانون، ماہرین نفسیات، ماہرین سماجیات، ماہرین جرمیات وغیرہم سے جوابات منگے جائیں تو یہ چیز واضح ہو جائے گی۔ اب ایک عامی اس الجھن میں پڑ سکتا ہے کہ ناپختہ و پختہ ذہنوں کے کثیر التعداد متضاد و متغیر مطالبات کس متحدہ دلیل کے تحت قبول کرے! اور اس کی یہ الجھن بجا ہے۔

سرمایہ دارانہ و اشتراکی ممالک کے رجحانات سرمایہ دار ممالک کو فرد کی تقدیس میں غلو ہے

تو اشتراکی ممالک کو ریاست و اجتماع کے احترام کا جنون، گروہ اولی تفوق محرک (Dynamic Energy) کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے تو گروہ ثانی اقتصادی و معاشی بدحالی کو۔

سرمایہ دار ممالک میں جرائم سے متعلق قوانین نے متعدد کروٹیں بدلی ہیں، رجحان یہ ہے کہ آدمی کو ہر کام کی اجازت ہونی چاہیے جب تک کہ وہ جبر و تشدد اور دھوکا دہی سے خالی ہو، بالخصوص اخلاقی نظریات چونکہ فرد و اجتماع سے متعلق ہیں قانون کی حدود سے خارج ہیں۔ قانون کا دائرۂ عمل جتنا سکڑتا جا رہا ہے ممنوعہ افعال کی شرح بڑھتی جا رہی ہے اور قوت کا ہمہ جہت انحطاط رفتہ رفتہ قوی ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کے جذبۂ آزادی کو بھڑکا کر حدود متعین کرنے یا قیود لگانے کی کوشش نفسِ انسانی کی حقیقت سے ٹکراؤ اور مجرم کے افعال کی ذمہ داری صرف بگڑے ہوئے ماحول، نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض پر ڈال کر اسے برائے خود قابلِ ہمدردی تصور کرنا فرد کی تقدیس و احترام میں غلو ہی کا ایک پہلو ہے۔

اشتراکی ممالک میں بھی رجحان، اخلاقی اقدار کے بے معنی ہونے کی طرف ہے، جب تک کہ فرد کے افعال و اقوال، سیاست و اجتماع کی ہیئت ترکیبی اور ریاست کی کارکردگی پر خفیف درجہ میں بھی اثر انداز نہیں ہوتے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی۔ جرم کی بنیاد محض اقتصادی بدحالی تصور کرنے والے یہ لوگ اپنے ملک میں جرم کی موجودگی کی وجوہات پر غور نہیں کرتے۔

جرم کی جو قیمت معاشرہ کو پیسے کی شکل میں اور مجرمین کو ذاتی ناآسودگی کی شکل میں ادا کرنی پڑ رہی ہے، غیر معمولی ہے گو اندازہ صرف اول الذکر ہی کا لگایا جا سکتا ہے یعنی بلحاظِ قدر برطانیہ میں سالانہ دو ہزار ملین پاؤنڈ (2 000 000 000 پونڈ) کا اندازہ لگایا گیا ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس کا کم و بیش دس گنا ہے۔

مغربی تحقیق نفسیات پر ایک نظر

مغربی محققین نفسیات کی خدمات سے انکار نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبۂ لاشعور کے پیچھے فرائڈ (المتوفی ۱۹۳۹ء) کا جبلتِ جنس کو، ایڈلر (المتوفی ۱۹۳۷ء) کا حبِ تفوق کو اور یونگ (المتوفی ۱۹۶۱ء) کا آرکی ٹائپ

(Arche type) کو غیر معمولی قوت کے ساتھ کارفرما سمجھنا ان کے اپنے ذہنی فکر کے خاص ڈھانچہ اور تجرباتی تحقیق کے محدود و مخصوص میدان کا مرکب ہے۔ دراصل لاشعور میں متعدد منفی و مثبت جذبات اُبلتے رہتے ہیں اور غلبہ و مغلوبیت کی جو شکلیں اندر ہی اندر بدلتی رہتی ہیں ان میں جبلتِ جنس اور حبِّ تفوق نفسِ غیر مہذب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ محققین اگر صفوۃ الصفوۃ، تذکرۃ الاولیاء، احیاء علوم الدین، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، کشف المحجوب، طبقات الکبریٰ، روض الریاحین وغیرہ کتب تصوف میں بکھرے ہوئے احوال و اقوال صوفیہ کی تحلیل و تجزیہ کرتے تو نفس امارہ (ID) سے چل کر نفس لوامہ (SUPER – EGO) ہی پر نہیں ٹھہر جاتے بلکہ نفوس ملہمہ و مطمئنہ و راضیہ و مرضیہ سے گزرتے ہوئے نفسِ کاملہ تک پہنچ جاتے۔ صوفیہ کے نظریاتِ منتہائے حسن و جمال و کمالِ عبودیت ان کی محدود تشنہ کاوش کو نئی وسعتیں اور نئی گہرائیاں دیتے لیکن ...... !

مغربی تہذیب کے تاریک گوشہ کو وسیع کرنے میں چونکہ ان محققین نفسیات کا (غالباً نادانستہ) ہاتھ رہا ہے ہم تحلیل نفسی میں سرزد ہوئی دو لغزشوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ مشتعل و غیر مشتعل نفس کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ جذبات و احساسات اشتعال سے پہلے معمولی قوت ارادی ہی سے قابو میں رکھے جا سکتے ہیں، اشتعال یا برانگیختگی کے بعد ان میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ پراگندگی کی شکل میں سامنے آتا ہے، اگر خواہش پوری ہو گئی تو اگرچہ ابتدائی درجہ میں سکون مل گیا لیکن اکثر نفس کو تقاضہ اور تسکین کا چسکا لگ جاتا ہے، رفتہ رفتہ وقفہ کم سے کم ہونے لگتا ہے اور چونکہ ہر تقاضہ کی فوری تسکین دشوار ہے، ذہنی تناؤ شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ انسان دیوانگی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں نتائج و عواقب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اب ان سوالات کے جوابات کون دے کہ بے لگام نفس کی حد کیسے متعین ہو گی ؟ کون متعین کرے گا ؟ اور آیا یہ حد اس کے لیے قابل قبول بھی ہو گی ؟۔

دریں ... پابندی کو جنسی معاشی الجھنوں کا ماخذ اور دماغی نشوونما میں حائل تصور کرنے میں ... نتیجتاً نہ صرف خود اعتمادی و قوت ارادی ہی متاثر ہوئے بلکہ مدارج ... سے دور ہو گئے۔

اس ... محدود (جسے ہم آگے پیش کرنے کی کوشش کریں گے) کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے مذکورالصدر تفصیل سے کافی مدد ملے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

خارجی و داخلی دباؤ سوال یہ ہے کہ مجرم جرائم کی طرف متوجہ کیوں ہوا؟ آیا کسی خارجی دباؤ (معاشی، سماجی، شخصی، اجتماعی وغیرہ) کے ردعمل کے طور پر یا داخلی انتشار و تقاضے سے مجبور ہو کر؟

خارجی دباؤ پر غور کیجیے، معاشرہ نے جہاں کہیں قرآنی تعلیمات بالخصوص رعایت حقوق، عدل و انصاف، اتحاد و اتفاق اور اخوتِ باہمی پر عمل، معاملات میں سچائی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ سے عملاً اختلاف و انحراف کیا، فرد و اجتماع دونوں پر زد پڑی اور ردّ عمل جرم کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ اسلام کا احسان ہے کہ اس بگاڑ کو جو معاشرہ نے اپنی نادانی سے پیدا کر دیا تھا، مزید پھیلنے سے روکنے یا سدھارنے کا طریقہ بتا دیا، فساد پر بند لگانا ظلم و بربریت نہیں بلکہ عین انسانیت ہے۔

داخلی انتشار و تقاضے پر غور کیجیے، ذہن میں کوئی خیال آیا یا جذبات منتشر ہوئے، شعور ادھر متوجہ ہوا، ارادہ بنا، اعصاب کو حرکت ہوئی اور اگر کوئی رکاوٹ سامنے نہ ہوئی تو فعل عمل میں آیا، پھر فعل کا نتیجہ دو صورتوں میں برآمد ہوا: داخلی[1] اور خارجی[2]۔ داخلی[1] یوں کہ اگر ردعمل قوی تھا تو شعور پھر متوجہ ہوا ورنہ تحت الشعور کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا۔ شعور کی توجہ کے ساتھ ساتھ طبیعت میں یا تو انشراح پیدا ہوا یا قبض و وحشت، انشراح کے ساتھ شعور کا رخ تعمیری سمت ہوا اور قبض و وحشت کے ساتھ تخریبی سمت۔ تعمیری ہونے کی صورت میں شعور نے ارتقاء کی جانب قدم بڑھائے اور تخریبی ہونے کی صورت میں شعور ایک ہی جگہ الجھ کر رہ گیا

احساسِ گناہ پیدا ہوا، اگر احساسِ گناہ میں ندامت پنہاں ہے تو قبض و وحشت کی چبھن کا سلسلہ ہوا، اس نے اس اذیت سے بچنے کی راہیں تلاش کرنی شروع کیں؛[2] اب اس کی دو صورتیں ہیں یا تو شعور دوسری طرف متوجہ رہے (مگر وقفہ وقفہ سے قبض و وحشت کی چبھن جاری رہے گی) یا کوئی راستہ سکون وانشراح کا نکل آئے ——— توبہ یا سزا۔

اگر احساسِ گناہ میں بجائے ندامت کے خوف و ڈر رہا تو قبض و وحشت پیدا تو ہوئی لیکن اس کا تعلق اب خارجی اشیاء سے زیادہ قوی ہو گیا (ذہنی ارتقاء میں خوف ایک خطرناک اور موثر کاوٹ ہے اور اس کی موجودگی بعض صورتوں میں منفی اثرات کی وجہ بھی بن جاتی ہے۔) اب یا تو اس میں ضد اور ڈھٹائی پیدا ہو گی یا ایک ایسی اذیت کا سامنا ہو گا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ ضد اور ڈھٹائی اگر ہو تو شعوری اور ارادی طور پر وہ بار بار فعل کی طرف توجہ دے گا، آہستہ آہستہ خوف و ڈر ختم ہو گا، احساسِ گناہ ختم ہو گا اور احساسِ لذت کی پیدائش عمل میں آئے گی اور فعل میں پختگی پیدا ہو گی، کوئی غیر معمولی واقعہ یا جذبہ ہی اس صورت میں موثر ہو گا کیونکہ بعض وقت سزا تک ناکام ثابت ہو گی۔ رفتہ رفتہ کم ہونے والی اذیت اگر سزا مل جائے تو بڑی حد تک ختم ہو جائے گی ورنہ جب تک کوئی خارجی شے فعل کو متصور کراتی رہے گی، اذیت جاری رہے گی۔

فعل کا نتیجہ اگر خارجی[2] اور منفی ہوا تو یا تو متعدی ہو گا یا نہیں، اگر متعدی ہو تو سزا ضروری ہو گی تاکہ منفی متعدی خارجی نہ شروع ہو، اگر متعدی نہ ہوا تو صلح و معافی کافی ہو گی یا سزا ضروری ہو گی کیونکہ بعض وقت خارجی منفی غیر متعدی خارجی منفی متعدی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مقاصد میں مقام | اصولِ فقہ[6] کے ماہرین نے شریعتِ اسلامی کے مقاصد و مصالح کو تین[3] حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) مقاصدِ ضروریہ یا ضروریات۔

(۲) مقاصدِ حاجیہ یا جلبِ مصالح۔

(۳) مقاصدِ کمالیہ یا تحسینیات

یہ مقاصد قرآن ہی سے ماخوذ ہیں، ان کے علاوہ قرآن میں تین مشکلات کے حل کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے :

(۱) کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ضعف ۔
(۲) مسلمانوں پر کفار کا تسلط مع قتل و جراح و انواع ایذاء ۔
(۳) اختلافِ قلوب جو سببِ اعظم ہے امت مسلمہ کے زوال کا ۔

فی الحال موضوعِ بحث چونکہ مقاصد و مصالح سے متعلق ہے ہم انہی پر قدرے روشنی ڈالتے ہیں ۔

(۱) مقاصدِ ضروریہ | وہ اعمال و تصرفات ہیں جن پر مندرجہ ذیل چھ امور کی حفاظت و صیانت موقوف ہے :

(ا) دین (ب) نفس (ج) عقل (د) نسل و نسب (ہ) مال (و) احترام نفس ۔

یہ سب امور ایک منظم، پر امن اور صالح حیات کے لیے ناگزیر و لابدی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا فقدان بھی انفرادی و اجتماعی ہر دو شعبہ ہائے حیات میں فساد کا موجب بنے گا۔ چنانچہ حفظِ دین کے لیے عبادات مشروع ہوئیں اور ارتداد جرم ٹھہرا، حفظِ نفس کے لیے قصاص، دیات وغیرہ مقرر ہوئے، حفظِ نسب و نسل کے لیے عصمت لازمی قرار پائی اور زنا حرام، حفظِ عقل کے لیے شراب خمر و مسکرات ممنوع ہوئے، حفظ مال کے لیے غصب و سرقہ اور قمار و ربوا سے روکا گیا اور حفظِ احترام نفس کے لیے غیبت و عیب جوئی حرام ہوئے اور حدِ قذف واجب .....

چونکہ مقاصد ضروریہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ جرائم کا سدباب نہ ہو، عقوبات کا باب کھولا گیا اور حدود، قصاص و دیات اور تعزیر کی سزائیں مقرر ہوئیں کہ مقاصد ضروریہ کی تحصیل کے راستہ کی یہ رکاوٹیں دور ہوں ۔

(۲) مقاصد حاجیہ | وہ اعمال و تصرفات ہیں جن کے بغیر مقاصد ضروریہ کی حفاظت ممکن تو ہے لیکن جن کی حاجت ان مقاصد ضروریہ کے حصول میں سہولت اور ضیق و تنگی اور نقصان و حرج کے دفعیہ کے لیے پیش آتی ہے، چنانچہ مصالح متبادلہ مباح ہوتے کہ ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائے، جیسے کہ بیوع و اجارات، مساقات و مضاربت وغیرہا۔

(۳) مقاصد کمالیہ | وہ امور ہیں جن کے ترک کر دینے سے نظام زندگی میں کوئی فتور تو واقع نہیں ہوتا مگر مکارم اخلاق اور محاسن عادات کی کارفرمائیاں ان سے وابستہ ہیں، مثلاً ترغیب عفو، معاشرتی و معاشی امور میں اعتدال، آدابِ گفتگو و طعام وغیرہ، قرآن وسنت ان کی تعلیمات سے مملو ہیں۔

یہاں ۲ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کے اچھے ہونے کا فیصلہ محض فوائد کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا ورنہ ایک زانی دعویٰ کرے گا کہ اس کو شہوت کے بارے نجات ملی اور اضطراب کو تسکین اس لیے زنا اچھی چیز ہے، سارق بھی سرقہ کے مالی فوائد گنائے گا، شرابی بھی سرور و صحت کی کیفیت سامنے لائے گا، قاذف بھی تسکین نفس اور لذت یابی کو فائدہ شمار کرے گا، قاطع طریق بھی کہے گا کہ اس کی شجاعت سے مال کثیر ہاتھ لگا اور حیاتی زندگی کا لطف آیا سو الگ، رہا مقتول سو وہ بھی تو زندگی کی کشاکش اور شب و روز کے رنج و الم سے آزاد ہوا، وقس علی ہذا۔ غرض یہ کہ اگر فائدہ ہی کو بنیاد قرار دے کر مضرات سے قطع صرف نظر کی جائے تو پھر کوئی جرم جرم نہیں، کوئی گناہ گناہ نہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ شارع نے جس چیز سے روکا وہ اس بنا پر کہ اس میں مفسدہ و ضرر غالب ہے ورنہ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ نفع و ضرر اضافی امور ہیں۔

حدود قصاص کے متخالف مسائل کا خلاصہ برائے تمیز درج کرتے ہیں:

قاضی قصاص میں اپنے علم پر فیصلہ کر سکتا ہے جب کہ حدود میں نہیں کر سکتا۔

۲۔ حدود میں تداخل جاری نہیں، قصاص میں ہے۔

۳۔ قصاص کے برخلاف حدود میں عفو و درگذر صحیح نہیں اگرچہ حد قذف ہی ہو۔

۴۔ تمادیٔ ایام قتل کی شہادت کے مانع نہیں اور حدود میں سوائے حدِ قذف کے مانع ہے۔

۵۔ گونگے کے اشارے اور تحریر سے بخلاف حدود کے قتل ثابت ہوتا ہے۔

۶۔ سفارش حدود میں جائز نہیں اور قصاص میں جائز ہے۔

۷۔ حدود سوائے حدِ قذف کے دعویٰ پر موقوف نہیں اور قصاص میں دعویٰ لابدی ہے۔

مذکورۂ بالا تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ شریعتِ اسلامی میں عقوبات کا باب عموماً اور حدود کا باب خصوصاً ایک طرح سرجیکل وارڈ (SURGICAL WARD) کی حیثیت رکھتا ہے جس سے کوئی انسانی آبادی مستغنی نہیں ہو سکتی۔

چند اشکالات | بعض حلقوں کی جانب سے چند اشکال سامنے آئے ہیں:

۱۔ اسلامی نظام منہاجِ نبوت پر بہت قلیل مدت تک قائم رہا!

۲۔ صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے برائے خود جرائم سرزد ہوئے یعنی خیر القرون بھی جرائم سے مستثنیٰ نہیں!

۳۔ قاضی اگر سلطانِ جائر نے مقرر کیا تو اس کے فیصلے قبول کرنا آیا صحیح بھی ہے؟

۴۔ نفاذِ حدود، معاشرہ کی اصلاح کامل سے پہلے ظلم ہے۔

۵۔ سزائے قطع ید اور قتل العفناء... [illegible] ... حالات کے تحت جاری کی گئی تھی، آج اس پر عمل ... [illegible] ... درست نہیں۔

... [illegible] ... ایک علیحدہ مقالہ کی شکل میں سامنے آئے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ دیگر اشکالات کی تفصیل طلب ہیں لیکن فی الحال ہم سرسری جائزہ ہی لینے پر اکتفاء کرتے ہیں:

نفس کا خاصہ ہے کہ کسی بھی قسم کی پابندی و مشقت سے الا یہ کہ لذت آور ہو، دور بھاگتا ہے

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قوانین صحت کی پابندی کے دلآویز نتائج سے واقف ہوتے ہوئے بھی بعض پابندی نہیں کرتا۔ کیا اس عدم پابندی کے باعث قوانین صحت کی سچائی کسی بھی درجہ میں متاثر ہو سکتی ہے؟ قرن اول کا صالح معاشرہ اگرچہ بہت ہی قلیل مدت تک قائم رہا لیکن ایک تو یہ معلوم ہو گیا کہ اسلامی اصول نظری اعتبار ہی سے نہیں بلکہ عملی اعتبار سے بھی قابل عمل ہیں، دوسرے یہ کہ اسلامی اصول کی پابندی جتنی زیادہ کی جائے گی فرد اور اجتماع دونوں بدرجہا اتنی ہی ترقی کریں گے۔

صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے بے شک چھوٹے بڑے جرائم سرزد ہوئے لیکن ارتکاب جرم نے اس عہد منفرد کی کئی خصوصیات سامنے کر دیں۔ ایک تو ارتکاب گناہ کے فوری بعد مثبت احساس ندامت، دوسرے انابت الی اللہ تعالیٰ کی شدت جس سے نہ صرف جرم کے جراثیم قوی اور متعدی نہ ہو سکے بلکہ مدارج اخروی بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔ ایسا معاشرہ جس میں جرم و گناہ کا امکان ہی باقی نہ رہے جنت ہی میں ہوگا، یہاں تو دیکھنا یہ چاہیے کہ نفس امارہ تا نفس مرضیہ نفوس کی شرح فی صد کیا ہے۔ مزید برآں صحابہ کا ایک بڑا طبقہ نفس کی چھیڑ چھاڑ سے اگرچہ محفوظ نہ تھا مگر چھیڑ چھاڑ اور غلبہ میں ایک فاصلۂ عظیم ہے۔

نصب قضا، چونکہ فرض ہے، جب تک قاضی کو دائرۂ شریعت میں انصاف پر مبنی فیصلہ کرنے کا اختیار رہے سلطان عادل و جائر بلکہ اہل بغاوت کی طرف سے بھی عہدۂ قضا قبول کرنا جائز ہے اور اس کے قضایا تاوقتیکہ حدود شرع سے متجاوز نہ ہوں نافذ ہوں گے۔ سلطان جائر یا اہل بغاوت کا اقتدار پاتا ہی ایک قیامت ہے، اگر کار قضا بھی معطل ہو جائے تو سرکشوں اور بدمعاشوں کی بن آئے اور ایک طرح کی انارکی اور فتنہ پھیل جائے۔

جو معاشرہ کی اصلاح سے پہلے نفاذ حدود کے ظلم ہونے کی بات سوچے تو محررۂ بالا تحریر پیش نظر رکھ کر اس پر غور کرنا چاہیے کہ آج اگر نفاذ حدود کے لیے اصلاح معاشرہ کی شرط رکھی جائے اور اصلاح معاشرہ کے لیے افہام و تفہیم کی شرط رکھی جائے (افہام اور تفہیم کے لیے عدم جبر کی

شرط رکھی جائے اور آخر کا بات آکر قطعاً خود پر ٹھہرے تو اصلاح معاشرہ کے حقیقی امکانات بوجوہ کے کہنہ ہونے کے چند ہی فیصد ہوں گے۔ سید قطب شہید اور سید ابوالاعلیٰ مودودی (رحمہا اللہ تعالیٰ) کا زمانہ قحط میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل سے اس پر استدلال کرنا تعجب خیز ہے۔ بہرحال آج صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقدامات نہ صرف مختلف گوشوں میں بیک وقت شروع ہوں بلکہ تمام ممکنہ ذرائع بھی بھرپور طور پر استعمال ہوں، اس کے لیے ایک تو اخلاص اور حوصلہ کی ضرورت ہے دوسرے دیانت دار آہنی اشخاص کا حصول یہاں

حضرات علماء سے ہم چند اہم سوالات کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ شریعت کے نفاذ میں کن کن چیزوں کی رعایت ضروری ہے؟ حالات؟ وقت؟ عوام کا مجموعی رجحان؟

۲۔ اگر یہ خطرہ ہو کہ احکام شریعت کل کے کل ایک دم نافذ کر دیے جائیں تو ممکن ہے کہ رد عمل منفی ہو اور آگے چل کر نفاذِ شریعت متاثر ہو تو کیا رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ راہ ہموار کی جا سکتی ہے؟ یعنی بعض چیزیں بمقتضائے وقت معطل رکھی جائیں گو ارادہ ان کو نافذ کرنے کا ہو؟

حدِ زنا | اب بطور ماڈل حد زنا سے متعلق مندرجہ ذیل مجمل خاکہ ملاحظہ فرمائیے جسے قرآن و حدیث، کتب تفسیر و شروح حدیث اور مذاہب اربعہ و ظاہریہ کی معتبر و مستند کتابوں کی روشنی میں اختصار کے پیش نظر بشکل دفعات ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۔ زنا کی تعریف : زنا وہ[۱۱] ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی عورت کی شرمگاہ (قُبُل) میں جو نہ صرف ہر دو طرح کی ملک اور دونوں کے شبہ ہی سے خالی ہو بلکہ شبہۂ اشتباہ سے بھی خالی ہو بطریق حرام اپنی خواہش پوری کرے یا کوئی عورت کسی مرد کو اپنے اوپر ایسے ہی فعل کا قابو دے دے۔ پس مجنون اور طفلِ عاقل کی وطی زنا نہ ہوگی کیونکہ ان دونوں کا فعل بصفتِ حرمت موصوف نہیں۔

۲۔ اور رکن[۱۲] زنا یہ ہے کہ التقائے ختانین و موارات حشفہ پایا جائے کیونکہ دخول و

وطی ہی سے ثابت ہوگی۔

علم بالتحریم کی شرط: ۳۔ شرط زنا یہ ہے کہ فاعل حرمت زنا[1] سے واقف ہو حتیٰ کہ لاعلمی پر شبہ واقع ہونے کے باعث حد قائم نہ کی جائے گی۔

حاکم یا قاضی کی جرح شہادت: ۴۔ زنا قاضی کے پاس اس طرح ثابت ہوگا[2] کہ چار گواہ لفظ زنا کی صراحت کے ساتھ گواہی دیں، لفظ وطی یا جماع کافی نہیں۔ جب چار گواہوں نے مجلس واحد میں کسی شخص پر زنا کی گواہی دے دی تو قاضی ان سے پوچھے گا کہ زنا کیا چیز ہے؟ اور ملزم نے کہاں زنا کیا ہے اگر گواہوں نے زنا کی صحیح تعریف بیان کر دی اور کہا کہ ہم نے دیکھا کہ ملزم نے کالمیل فی المکحلۃ (سرمہ دانی کے اندر سلائی کی طرح) دخول کیا تو اب ان سے قاضی کیفیت زنا پوچھے گا، پھر کیفیت زنا اگر بتادی تو ان سے وقت دریافت کرے گا، جب گواہوں نے ایسا وقت بتایا کہ اس کو زمانہ دراز نہ گذرا ہو تو قاضی سوال کرے گا کہ کس عورت سے زنا کیا؟ اور کس جگہ کیا؟ مکان بتائے جانے کے بعد اگر قاضی گواہوں کی عدالت سے بخوبی واقف ہو تو اب ملزم کی طرف متوجہ ہوگا اور مشہود علیہ یا مشہود علیہا سے اس کا احصان دریافت کرے گا، اگر اس نے اپنے محصن ہونے کا اقرار کیا یا بصورت انکار گواہوں نے اس کے احصان پر گواہی دی تو اب قاضی مشہود علیہ سے احصان کی تعریف پوچھے گا کہ احصان کس کو کہتے ہیں؟ اگر اس نے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تو قاضی اس کو رجم (سنگسار) کرے گا اور اگر احصان گواہوں سے ثابت ہوا اور انھوں نے احصان کی صحیح تعریف بیان کر دی تو اس کا رجم کرنا واجب ہوگا۔

احصان کی تعریف: ۵۔ رجم کے واسطے جو احصان[1] معتبر ہے وہ یہ ہے کہ آزاد عاقل بالغ مسلمان ہو کہ جس نے کسی آزاد عورت سے بہ نکاح صحیح نکاح کیا اور اس سے دخول کر لیا ہو اور وہ دونوں صفت احصان پر موجود ہوں۔

۶۔ احصان[2] کا ثبوت یا تو (ا) باقرار ہوتا ہے، یا (ب) دو مردوں کی گواہی سے یا

(ج) ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ہے۔

سزائے غیر محصن: ۷۔ اگر غیر محصن ہو تو اس کی حد (سزا) سو کوڑے ہیں بشرطیکہ آزاد ہو اور اگر غلام ہو تو پچاس کوڑے ہیں۔

گواہی: ۸۔ چار مسلمان آزاد مردوں کی گواہی زنا پر ضروری ہے، اگر چار سے کم ایک یا دو یا تین آزاد مردوں نے گواہی دی تو گواہی مردود قرار دی جائے گی اور گواہوں کو حد قذف (اسی کوڑے) لگے گی۔

۹۔ اگر چار گواہوں میں کوئی ایک گواہ غلام یا مکاتب یا کافر یا محدود القذف یا اندھا یا طفل نکلے تو سوائے طفل کے سب گواہوں کو حد قذف ماری جائے گی اور مشہود علیہ کو حد نہ ماری جائے گی۔

۱۰۔ اگر چار فاسق گواہی دیں یا گواہ راستبازی کی جانچ میں ٹھیک نہ ثابت ہوں تو نہ مشہود علیہ پر حد جاری کی جائے گی اور نہ ان گواہوں پر کیونکہ وہ تعداد میں چار ہیں۔

۱۱۔ شہادت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مجلس شہادت متحد ہو حتیٰ کہ اگر گواہوں نے مختلف مجلسوں میں گواہی دی تو ان کی گواہی قبول نہ کی جائے گی اور سب کو حد قذف دی جائیگی۔

۱۲۔ اگر چار گواہوں نے کسی مرد پر زنا کی گواہی دی لیکن کیفیت و ماہیت بتانے سے انکار کیا یا بعض نے کیفیت و ماہیت بیان کی اور بعض نے بیان نہ کی تو نہ گواہی قبول ہوگی اور نہ خود گواہوں پر حد قذف واجب ہوگی کیونکہ تعداد کا مل ہونا وجوب سے مانع ہے۔

۱۳۔ اگر چار گواہوں نے ایک شخص پر زنا کی گواہی دی مگر جس عورت سے زنا کیا ہے اس میں اختلاف کیا، یا زنا کی جگہ میں اختلاف کیا، یا زنا کے وقت میں اختلاف کیا تو ان کی گواہی باطل ہو گی لیکن گواہوں پر حد واجب نہ ہوگی۔

اقرارِ زنا: ۱۴۔ زنا کا ثبوت مرد یا عورت کے اقرار سے بھی ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں تین باتیں اہم ہیں:

(ا) اگر مُقِر (اقرار کرنے والے) نے قاضی کے بجائے کسی دوسرے کے سامنے جس کو اقامت حدود کا اختیار نہیں، اقرار کیا تو اگرچہ اقرار چار مرتبہ کیا ہو غیر معتبر ہے۔

(ب) اقرار کا صریح ہونا اور اس کے کذب کا ظاہر نہ ہونا ضروری ہے۔

(ج) اور یہ بھی ضروری ہے کہ اقرار حالتِ ہوش میں ہو چنانچہ اگر کسی نے نشہ میں اقرار کیا تو اس کو حدِ زنا نہ ماری جائے گی۔

صورتِ اقرار: دفعہ ۱۵۔ اقرار کنندہ عاقل بالغ اپنی ذات پر چار مرتبہ اپنی چار مجلسوں میں زنا کرنے کا اقرار کرے۔ بعض کے نزدیک مجالس قاضی کا اعتبار ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک اقرار کنندہ کی مجالسوں کا مختلف ہونا شرط ہے، چنانچہ مجلس واحد میں اگر اس نے چار مرتبہ اقرار کیا تو یہ بمنزلہ ایک اقرار کے ہے۔

تلقینِ رجوع: دفعہ ۱۶۔ اقرار کنندہ کو تلقین کرنا کہ جس سے حد دور ہو جائے مندوب ہے اس لیے قاضی کو چاہیے کہ اقرار کنندہ کو اقرار پر جھڑکے اور کراہت ظاہر کرے بلکہ ایک طرف دھکیل دینے کا حکم دے۔ اب اگر اس نے چار مرتبہ اقرار کر لیا تو جوازِ اقرار کے لیے اس کے صحیح العقل ہونے کی تحقیق کرے گا چنانچہ اس سے دریافت کرے گا کہ زنا کیا ہے؟ کیونکہ ممکن ہوتا ہے؟ کس کے ساتھ کیا ہے؟ کہاں کیا ہے؟ کیونکہ اس میں شبہ کا احتمال ہے، زمانہ بھی پوچھے گا کیونکہ ممکن ہے کہ ایام نابالغی میں زنا کیا ہو۔ جب زنا ثابت ہو گیا تو پوچھے گا کہ آیا وہ محصن بھی ہے؟ اگر اس نے اقرار کیا تو احصان کی تعریف پوچھے گا، اگر احصان کی تعریف بھی ٹھیک ٹھیک بیان کر دی تو پھر رجم (سنگساری) کا حکم دے گا۔

رجوع معتبر: دفعہ ۱۷۔ اگر اقرار کنندہ نے اقامتِ حد سے پہلے یا عین بیچ میں اپنے اقرار سے رجوع کر لیا تو رجوع قبول کیا جائے گا اور اس کی راہ چھوڑ دی جائے گی، رجوع میں مرد عورت دونوں برابر ہیں۔

دفعہ ۱۸۔ اگر اقرار کنندہ نے رجوع نہ کیا لیکن بھاگا تو اس سے تعرض نہ کیا جائے گا اگر اقرار

زنا پر تو قائم رہا لیکن محصن ہونے سے رجوع کیا تو یہ رجوع قبول ہوگا اور بجائے سنگساری کے کوڑے مارے جائیں گے۔

اعتبارِ تقادم: مادہ ۲۱۹۔ تقادمِ عہد (تمادیِ ایام) جس طرح ابتداءً قبولِ شہادت میں مانع ہے اسی طرح قضاء کے بعد اقامت سے مانع ہے، چنانچہ اگر تھوڑی حد قائم کیے جانے کے بعد وہ بھاگ گیا، پھر تقادمِ عہد کے بعد گرفتار ہوکر آیا تو اس پر باقی حد قائم نہ کی جائے گی، امام محمدؒ نے تقادم کی مدت ایک ماہ مقرر کی ہے اور یہی امام اعظم اور امام ابو یوسف (رحمہما اللہ تعالیٰ) سے مروی ہے۔

کیفیتِ سزا: مادہ ۲۲۰۔ حدود مسجد میں قائم نہ کی جائیں گی۔

مادہ ۲۲۱۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کو قیامِ حدود کے وقت موجود رہنا چاہیے۔

مادہ ۲۲۲۔ مرد کے بدن پر صرف ایک ازار رہے گی اور تمام حدود میں کھڑے ہونے کی حالت میں سزا دی جائے گی، عورت کسی صورت میں برہنہ نہ کی جائے گی لیکن زائد کپڑے (الحشو والفروۃ) اتار لیے جائیں گے اور اگر عورت کے بدن پر سوائے حشو و فروہ کے کچھ نہ ہو تو یہ نہ اتارے جائیں گے۔ اور عورت کو بٹھلا کر حد ماری جائے گی۔

مادہ ۲۲۳۔ کوڑے کے تسموں پر گھنڈی نہ ہو اور چوٹ درمیانی درجہ کی لگائی جائے، نہ ایسی کہ زخم پہنچائے اور نہ ایسی کہ تکلیف ہی نہ ہو۔

مادہ ۲۲۴۔ جس کوڑے سے مارا جائے وہ بھی درمیانی قسم کا ہونا چاہیے، نہ بہت سخت ہو اور نہ بہت نرم، اور ہاتھ اتنا ہی اوپر اٹھے کہ بغل دکھائی نہ دے۔

مادہ ۲۲۵۔ کوڑے سوائے چہرہ، سر اور شرمگاہوں کے تمام بدن پر متفرق مارے جائیں گے۔

مادہ ۲۲۶۔ کسی حد میں نہ ممدود کیا جائے گا نہ پکڑا یا باندھا جائے گا بلکہ کھڑا چھوڑ دیا جائے گا الا یہ کہ وہ لوگوں کو عاجز کرے۔ ممدود کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ زمین پر ڈال دیا جائے اور کھینچا جائے، یا مارنے والا کوڑے کو کھینچے اور سر پر بلند کرے، یا مارنے کے بعد کھینچے۔ یہ سب [illegible]

نہ کیا جائے کہ یہ استحقاق پر زیادتی ہوگی۔

۲۷۔ سخت گرمی یا سخت جاڑے میں حد قائم نہ کی جائے گی، اسی طرح شدت گرمی یا شدت جاڑا میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

۲۸۔ اگر مریض پر حد رجم (سنگساری) واجب ہوئی تو فوری قائم کر دی جائے گی اور اگر کوڑے واجب ہوئے ہوں تو صحت یابی کا انتظار کیا جائے گا، اگر ایسا مرض ہو جس کے زائل ہونے کی امید نہ ہو جیسے سل وغیرہ یا یہ شخص ناقص، ضعیف الخلقت ہو تو اس کو ایک عثکال جس میں سو کشادہ تسمے ہوں اس طرح مارا جائے کہ ہر تسمہ بدن پہ لگے، اور اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک ولادت کے بعد نفاس سے فارغ نہ ہولے اسے حد نہ ماری جائے گی۔

۲۹۔ رجم (سنگساری) کی صورت میں مرد کے لیے گڑھا (الحفرۃ) نہ کھودا جائے گا، اس کے برخلاف عورت کے لیے مناسب یہ ہے کہ سینہ تک گڑھا کھودا جائے اور اگر نہ کھودا گیا تو کچھ مضر نہیں۔

<u>متفرقات:</u> ۳۰۔ جب رجم شہادت سے ثابت ہوا ہو تو واجب ہے کہ پہلے گواہ رجم کریں، پھر امام اور پھر دوسرے لوگ۔ اگر گواہوں نے ابتداء کرنے سے انکار کر دیا تو مشہود علیہ سے حد ساقط ہو جائے گی مگر گواہوں پر حد قذف واجب نہ ہوگی کیونکہ سنگساری میں ابتداء سے انکار کرنا صریح رجوع از شہادت نہیں۔

۳۱۔ اگر اس شخص نے خود اقرار کیا ہو تو امام المسلمین ابتدا کرے، پھر عام مسلمان رجم کریں۔

۳۲۔ مرجوم کو غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا اور اس پر نماز پڑھی جائے گی۔

۳۳۔ شبہ سے حد واجب نہ ہوگی، شبہ کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

(الف) شبہہ در فعل یا شبہۃ الاشتباہ: یعنی غیر دلیل حل کو دلیل گمان کرنا۔

(ب) شبہہ در محل یا شبہہ حکمیہ: یعنی محل میں کوئی دلیل حلیت کی قائم ہے مگر اس کا عمل کسی

مانع کے سبب ممتنع ہوگیا۔

(ج) شبہہ در عقد۔

۴۴۔ زنا اگر جبر و اکراہ کے تحت ہو تو مجبور پر حد نہیں۔

۴۵۔ جو شخص کبھی مجنون ہو جاتا ہو اور کبھی اس کو افاقہ ہوتا ہو وہ اگر حالتِ افاقہ میں زنا کرے تو حدِ زنا کے لیے ماخوذ ہوگا اور اگر وہ کہے کہ اس نے حالتِ جنوں میں زنا کیا تو حد جاری نہ ہوگی کالبالغ اذا قال زنیت وانا صبی۔

۴۶۔ اگر کوئی کئی مرتبہ زنا کرے اور اسے اب تک حد نہ لگی ہو تو ایک بار ہی حد لگائی جائے گی۔

۴۷۔ محصن کے حق میں کوڑے اور سنگساری دونوں اور غیر محصن (باکرہ) کے حق میں کوڑے اور ایک سال کی تغریب (شہر بدر کرنا) دونوں جمع نہ کیے جائیں گے۔ وان تغریب الی السلطین پر موقوف ہے، اگر مصلحت سمجھے تو از راہِ سیاست و تعزیر شہر بدر کر دے۔

۴۸۔ اگر قاضی فقیہ عادل ہو تو لوگوں کو ادائے شہادت کا معائنہ کیے بغیر رجم کرنے کی گنجائش ہے اور اگر قاضی فقیہ غیر عادل یا عادل غیر فقیہ ہو تو لوگوں کو جب تک کہ ادائے شہادت کا بذاتِ خود معائنہ نہ کرلیں، رجم کرنا روا نہیں۔

خلاصۂ و نتائج ۱۔ فاعل کو حرمتِ زنا کا علم رہنا شرط ہے۔

۲۔ رجم کے لیے احصان اور تجلید کے لیے عقل و بلوغ شرط ہے۔

۳۔ شبہہ سے خالی ہونا ضروری ہے۔

۴۔ چار عادل گواہوں کا مجلسِ واحد میں کالمیل فی المکحلۃ کا مشاہدہ مع دیگر متفق علیہ تفصیل کے بتانا اور سنگساری کی صورت میں ابتداء کرنا شرط ہے۔

۵۔ بصورتِ اقرار مقر (اقرار کرنے والے) کا باہوش ہونا اور الفاظ کا صریح ہونا شرط ہے مزید برآں اقرار چار بار اور چار مجالس میں ہونا ضروری ہے، اس پر مستزاد قاضی کی تفصیلی تحقیق وتلقین اور فیصلہ کے بعد بھی حقِ رجوع ہے۔

۷۔ مریضانہ ضعیف الخلقت اور حاملہ و نفساء کی رعایت ۔
۸۔ غیر بر حد نہیں ۔
۸۔ تمادی ایام قبولِ شہادت اور فیصلہ کے بعد اقامت حد دونوں میں مانع ہے ۔

زناکاری کے اثرات | حلسے متجاوز جنسی انہماک خلل اعصاب اور FUNCTIONAL PSYCHOSES کا ایک اہم سبب ہوتا ہے ۔

۲۔ جنسی بداعتدالیوں سے کے جسمانی اثرات PARANOID اور MANIC DEPRESSIVE جیسے دماغی امراض کے پیدا کرنے میں خاصا اہم حصہ لیتے ہیں۔ SCHIZOPHRENIC

مزید برآں زنانی کے جذبات، خواہشات، خیالات اخلاقی وسماجی قدروں میں عدم توازن، ان کے اندر شدید اندرونی کشمکش پر تشدد جذبات، مسلسل دماغی تناؤ نیز تصادم پیدا کرنے کا خاص سبب ہوتا ہے؛ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں PSYCNONEUROSES. بتک بڑھ گئی ہے کہ متعدد تخمینوں کے مطابق یہاں کی بالغ آبادی کے ۲۵ سے ۵۰ فیصدی کے درمیان افراد کسی نہ کسی حد تک دماغی طور پر بیمار ہیں ۔

(۳) اوباش وبدکار لوگ شاذ و نادر ہی بڑھاپے تک پہنچ پاتے ہیں ۔

۴۔ امراضِ خبیثہ ۵ ۔ امراضِ قلب ۔ ۶ ۔ جنسی ہسٹریا۔

۷۔ کینسر کے دیگر اسباب میں سے ایک سبب آزادانہ جنسی اختلاط اور ایک قبل از وقت بلوغ نسوانی ہے۔

۸۔ خودکشی کی ترغیب (ناکامی کی صورت میں)

۹۔ خانگی زندگی کا اختلاط، رشتۂ ازدواج کی ناپائیداری اور طلاقوں کی کثرت۔

زناکاری کے ان اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے متذکرہ بالا اسلامی حدود کے فلسفہ پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مجرم و معاشرہ دونوں کی جرم سے پہلے، جرم کے دوران اور جرم کے مابعد کیفیات کے تجزیہ و تحلیل اور اس کے عمیق مطالعہ پر مبنی ہے۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

المراجع

۱ الحد في اللغة هو المنع ومنه الحداد للبواب وفي الشريعة هو العقوبة المقدرة حقاً لله

الهداية مع الدراية في تخريج احاديث الهداية لابي الحسن علي بن ابي بكر فرغاني مرغيناني ملقب ببرهان

الدين۔ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔ ج ۲ ص ۴۹۵ — آگے رمز "ہدایہ")

"SOCIOLOGY OF DEVIANT BEHAVIOUR" by B. MARSHALL ۲

CLINARD PUB. HOLT, RINEHART AND WINSTON, INC, THIRD EDITION

PP. 215-217. ۳ ایضاً 1968. PP. 200-201

۴ مارکس اور اس کے پیرو انگلز (ENGLES) کو یقین تھا کہ پرولتاریوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اختلاف وتصادم کی کوئی گنجائش نہ ہوگی اس لیے سیاسی جبر کی نہ ضرورت ہوگی اور نہ امکان ہی باقی رہیگا، نتیجتاً ریاست عضو معطل کی طرح خود بخود فنا ہو جائے گی لیکن کیا U.S.S.R. میں یہی ہوا؟

"CRIME AND PERSONALITY" by H. J. EYSENCK. ۵

PUB. ROUTLEDGE AND KEGAN PAUL LTD LONDON AND HENLEY

3rd ed. 1977. P. 14. ۶ دیکھیے عامہ کتب اصول فقہ۔

۷ "الاشباہ والنظائر" (رمز "الاشباہ") للعلامہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم الحنفی مصری مع شرحہ "غمز عیون البصائر" للعلامہ سید احمد الحموی" مطبعۃ العامرۃ۔ مصر ۱۲۹۰ھ ج ۱ ص ۱۸

۸ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: "واعلم انه كان من شريعة من قبلنا القصاص في القتل، والرجم في الزنا، والقطع في السرقة، فهذه الثلاث كانت متوافقة في الشرائع السماوية واطبق عليها جماهير الانبياء والامم ...." حجة الله البالغة" نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی۔ [illegible]

۹ نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث سید الاخیار [illegible]

[illegible]

اولیٰ بنصب اہلیۃ ولایۃ القضاء والامارۃ وغیرہا۔ اور علامہ ابوبکر ابن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں: "نصب القاضی فرض لانہ ینصب لاقامۃ امر مفروض وھو القضاء"
بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ ج ۷ ص ۲۔

نمبر ہدایہ ج ۳ ص ۱۰۷ المطبوعہ محولہ بالا۔ لسان الحکام فی معرفۃ الاحکام للامام ابی الولید ابراہیم محمد المعروف بابن الشحنۃ الحلبی الحنفی المتوفی ۸۸۲ھ مطبعۃ جریدۃ البرھان الاسکندریہ ۱۲۹۹ھ
رمز "لسان" ص ۳۔

" احکام القرآن" للقاضی ابی بکر محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد المعروف بابن العربی المعافری الاندلسی الاشبیلی المالکی المتوفی ۵۴۳ھ مطبعۃ السعادۃ بمصر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۳۱ھ
رمز "احکام" ج ۲ ص ۸۳ " التفسیر المظہری" للعلامہ القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی المظہری المجددی الفانی فتی المتوفی ۱۲۲۵ھ۔ ندوۃ المصنفین۔ الدہلی۔ غ م۔ رمز "المظہری"
ج ۵ ص ۴۲۹ - ۴۳۰۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۳ و ۴۹۸۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للعلامہ ابی بکر ابن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی ۵۸۷ھ۔ (رمز "بدائع") ج ۷ ص ۳۳-۳۴۔
المغنی للعلامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمود بن قدامۃ المتوفی ۶۳۰ھ۔ مطبعۃ المنار۔ بمصر ۱۳۴۷ھ تصحیح السید رشید رضا۔ الطبعۃ الاولیٰ ج ۱ ص ۱۲۹ رمز "المغنی"۔ الشرح الکبیر علی متن المقنع للامام شمس الدین ابی الفرج عبدالرحمن بن ابی عمر محمد بن احمد بن قدامۃ المقدسی المتوفی ۶۸۲ھ الطبعۃ الاولیٰ۔ مطبعۃ المنار بمصر ۱۳۴۸ھ تصحیح السید رشید رضا (رمز "المقدسی")
ج ۱۰ ص ۱۱۹ - وفی المغنی: "الزانی من اتی الفاحشۃ من قبل او دبر" ج ۱۰ ص ۱۵۱ -
وفی المقدسی: "وحد اللوطی کحد الزانی سواء وعنہ حدہ الرجم بکل حال" ج ۱۰ ص ۱۷۵
وکذا عند الامام الشافعی کما فی کتاب الام ج ۵ ص ۱۶۹ وقال ایضاً: "لا یرجم [اللوطی] الا ان یکون قد احصن"۔ فتاوی عالمگیری مطبع منشی نولکشور۔ غ م۔ (رمز "عالمگیری")
ج ۲ ص ۳۲۷ ملخصاً۔

ﷲ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷ - و فی المقدسی: ’’وا قل ذلک تغیب الحشفۃ فی الفرج‘‘ ج ۱۰ ص ۱۸۰ -

ﷲ تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر للحافظ ابی الفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ شرکۃ الطباعۃ الفنیۃ المتحدۃ بالقاھرۃ ۱۳۸۴ھ (رمز ’’تلخیص‘‘) ج ۴ ص ۶۱ - المحلی لابی محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ - ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ بمصر بتحقیق محمد منیر الدمشقی ۱۳۵۲ھ (رمز ’’المحلی‘‘) ج ۱۱ ص ۲۲۹ - اختلاف الفقہاء للامام ابی جعفر احمد بن محمد الطحاوی المتوفی ۳۲۱ھ - مطبعۃ معہد البحوث الاسلامیۃ اسلام آباد - تحقیق محمد صغیر حسن المعصومی - غ - م - ج ۱ ص ۱۵۷ (رمز ’’اختلاف‘‘) المغنی ج ۱۰ ص ۱۵۶، المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۰ - ۱۲۱ اور ص ۱۸۳ -

ﷲ احکام ج ۱ ص ۱۴۹ - السنن الکبریٰ لابی بکر احمد بن علی البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ مع الجوہر النقی لابن الترکمانی المتوفی ۷۴۵ھ - دائرۃ المعارف العثمانیہ - حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ (رمز ’’بیہقی‘‘) ج ۸ ص ۲۳۰ - ۲۳۱ - بدائع ج ۷ ص ۴۹ - (اب آگے صرف کتابوں کے نام دیں گے۔) فتاویٰ قاضیخان (رمز ’’قاضیخان‘‘) ج ۴ ص ۷۷۴ - مغنی المحتاج للشربینی (رمز ’’الشربینی‘‘) ج ۴ ص ۱۴۹ - ۱۵۰ - المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۶ - ۱۹۷ - کنز الدقائق (اردو - رمز ’’کنز‘‘) کتاب الحدود - المختصر القدوری (رمز ’’قدوری‘‘) ص ۱۸۵ - - - - - - - - - - - - ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۷ - عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷ - و فی المقدسی: ’’یشترط فی شہود الزنا سبعۃ شروط (۱) ان یکونوا اربعۃ (۲) ان یکونوا رجالا کلھم (۳) الحریۃ (۴) العدالۃ (۵) ان یکونوا مسلمین (۶) ان یصفوا الزانی (۷) یجی ءالشہود کلھم فی مجلس واحد‘‘ ج ۱۰ ص ۱۹۵ - ۱۹۸ وکذا فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۵ - ۱۷۹

ﷲ فی المقدسی: ’’یشترط للاحصان شروط سبعۃ (۱) الوطء فی القبل (۲) ان یکون فی نکاح (۳) ان یکون النکاح صحیحاً (۴) الحریۃ (۵) البلوغ (۶) العقل (۷) ان یوجد

وکان فیھا جمیعا حالی الوطء فیطاء الرجل العاقل امرأۃ عاقلۃ حرۃ"۔ ج ۲ ص ۱۵۸-۱۶۱۔ ملاحظہ ایضاً فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۶-۱۲۹۔ وزاد فی بدائع (ا) الاسلام" ج ۷ ص ۳۷-
ھکذا فی قاضیخان ج ۳ ص ۴۷۹ ولکن فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۹ وفی المقنع ج ۵ ص ۱۲۲ "لا یشترط الاسلام فی الاحصان ... وقال عطاء والنخعی والشعبی ومجاھد والثوری ھو شرط فی الاحصان" قدوری ص ۱۸۵۔ السیاسۃ الشرعیۃ ابن تیمیہ (اردو) ص ۲۰۹۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۱-۴۹۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: المظہری ج ۶ ص ۴۲۶-۴۲۹-
نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۶-۲۵۹۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۳۹-۱۴۱۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۱۳-۲۱۶۔ بدایۃ المجتہد لابی رشد الحفید (رمز "بدایۃ المجتہد") ج ۲ ص ۳۶۴۔ اور المیزان الکبریٰ العلامہ عبدالوہاب الشعرانی (رمز "المیزان") ج ۲ ص ۱۷۳۔

لالہ فتاویٰ قاضیخان ج ۳ ص ۴۷۹۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸۔ المدونۃ الکبریٰ للامام مالک روایۃ الامام سحنون التنوخی عن الامام عبدالرحمٰن بن قاسم۔ (رمز "المدونۃ") ج ۴ ص ۳۹۷ لیکن امام مالکؒ کے نزدیک عورتوں کی شہادت احصان میں بھی قبول نہ کی جائے گی، چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب وصفحہ مذکورہ۔

ﷲ تفسیر جامع البیان للطبری ج ۱۸ ص ۳۶۔ تفسیر فتح القدیر للشوکانی (رمز "فتح القدیر") ج ۴ ص ۳ کتاب الام للشافعی (رمز "کتاب الام") ج ۶ ص ۱۴۳۔ الرسالۃ للشافعی ص ۶۷ و ۱۲۸-۱۳۷۔ بدائع ج ۷ ص ۵۔ قاضیخان ج ۴ ص ۴۷۸۔ المیزان ج ۲ ص ۱۷۳-۱۷۴۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ کنز۔ کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۵۔ تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے۔ احکام القرآن للجصاص الرازی (رمز "الجصاص") ج ۲ ص ۲۰۵-۲۰۶۔ المظہری ج ۶ ص ۴۷۱۔ کتاب الام ج ۶ ص ۱۲۱-۱۲۲۔ الرسالۃ للشافعی ص ۱۲۸-۱۳۷۔ المحلی ج ۱۱ ص ۲۳۶-۲۴۲۔ بیہقی۔ ج ۸ ص ۲۱۰-۲۱۳۔ نیل الاوطار ج ۷ "باب ماجاء فی رجم الزانی المحصن وجلد البکر وتغریبھا" اور "باب حد زنا الرقیق خمسون جلدۃ" شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۶۵ و ص ۷۰-۷۱۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۵۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۴۲-۱۵۱۔ المقنع ج ۱۰ ص ۱۲۰-۱۷۵۔ ہدایہ ج ۲ ص ۲۸۹-۲۹۰۔

۱۸ه التمہید ج ۹ ص ۲۳۵-بیہقی ج ۸ ص ۲۳۴-۲۳۵-المدونۃ ج ۴ ص ۳۸۳-کتاب الام ج ۶ ص ۱۲۲-۱۲۳-المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۹-۱۸۰-المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۹-۲۰۰-بدائع ج ۷ ص ۴۷-۴۸-کنز (اردو) کتاب الحدود-عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۳-

۱۹ه کنز کتاب الحدود-ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۳-عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۵-اختلافی بحث کے لیے دیکھیے کتاب الام ج ۷ ص ۱۴۱-المغنی ج ۱۰ ص ۱۸۱-۱۸۲-المقدسی ج ۱۰ ص ۲۰۰-بدائع ج ۷ ص ۵۹-قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۸-

۲۰ه کتاب الخراج لأبی یوسف (اردو) ص ۲۶۴-قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۸-وفی اختلاف الفقہاء للطحاوی "قال اصحابنا وعثمان البتی واللیث لا حد علیہم ... وقال مالک یحد الشہود وھو قول عبد اللہ بن حسن" ج ۱ ص ۱۴۶-

۲۱ه المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۸-۱۷۹-المقدسی ج ۱۰ ص ۱۹۷-۱۹۸-بدائع ج ۷ ص ۴۸-قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۴-عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۳-وفی المیزان "ھکذا عند الائمۃ الثلاثۃ مع قول الشافعی انہ لا بأس بتفریقہم ووجہ الاول طلب التثبت فی اقامۃ الحد ووجہ الثانی المبادرۃ الی التطہیر اذا کمل النصاب ولو فی مجلس بحسب اجتہاد الحاکم وما یراہ من الحظ الاوفر والمصلحۃ للمسلمین" ج ۲ ص ۱۴۶-اختلاف ج ۱ ص ۱۴۲

۲۲ه عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷-

۲۳ه المدونۃ ج ۴ ص ۴۰۱-۴۰۲-بیہقی ج ۸ ص ۲۳۵-بدائع ج ۷ ص ۴۸-۴۹-قاضیخاں ج ۴ ص ۴۷۶-ہدایۃ ج ۲ ص ۵۰۱-۵۰۲-عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۴-

۲۴ه بدائع ج ۷ ص ۴۹-۵۰-عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷-

۲۵ه اختلاف ج ۱ ص ۱۴۳-بدائع ج ۷ ص ۵۰-قدوری ص ۱۸۵-ترمذی ج ۱ ص ۱۷۱-۱۷۲-ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۷-۴۸۸-حسن، حماد، مالک (المدونۃ ج ۴ ص ۳۸۳)، شافعی (کتاب الام ج ۶ ص ۱۱۹)، ابو ثور اور ابن المنذر کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار کر لینا بھی حد جاری کرنے کے لیے

[illegible] فی المقدسی ج ۲ ص ۱۹۰۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۶ ص ۴۳۵۔
[illegible] نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۹۔ ۲۶۵۔ بیہقی مع الجوہر النقی ج ۸ ص ۲۲۵۔ ۲۲۸۔
[illegible] بخاری ج ۲ احادیث ۱۹/۶۷۔ ۲۳/۶۷۔ ۲۶/۶۷۔ ۲۷/۶۷۔ مسلم کتاب الحدود مع شرحہ
[illegible] مسند الامام الاعظم ص ۱۵۷۔ ۱۶۱۔ ابن ماجہ ص ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ تلخیص ج ۴ کتاب حد الزنا۔
نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۶۵ سے ۲۶۷ اور ص ۲۵۹۔ ۲۶۱ کنز کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۵۔
بدائع ج ۷ ص ۵۱۔ ۵۲۔ قاضیخان ج ۴ ص ۴۷۷ دفی المقدسی "ولیعتبر فی صحۃ الاقرار
ان یذکر حقیقۃ الفعل لتزول الشبہۃ" ج ۱۰ ص ۱۹۱۔ وقال النوویؒ "وقد جاء
تلقین الرجوع عن الاقرار بالحد و عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن الخلفاء
الراشدین ومن بعدھم واتفق العلماء علیہ" شرح مسلم للنوویؒ ج ۲ ص ۶۶۔ ہدایۃ
ج ۲ ص ۴۸۸۔ ۴۸۹"

[illegible] ترمذی ج ۱ ص ۱۷۱۔ بدائع ج ۷ ص ۶۱۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۸۸۔ کنز کتاب الحدود۔ قدوری
ص ۱۸۵۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸ تلخیص الجبیر ج ۴ کتاب حد الزنا۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۸۔ المقدسی
وفیہ" وبھذا قال عطاء ویحیی بن یعمر والزھری وحماد ومالک والثوری واسحق و
ابوحنیفۃ وابو یوسف" ج ۱۰ ص ۱۳۸ وکذا فی المغنی وزاد فیہ اسم الشافعی۔ ج ۱۰ ص ۱۶۲۔
غرائب القرآن للقمی وفیہ" وبہ قال ابوحنیفۃ والشافعی والثوری واحمد واسحق"
ج ۱۸ ص ۵۴۔ المظہری ج ۶ ص ۴۳۷۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۳۔ نیل الاوطار وفیہ" والی ذلک
ذھب احمد والشافعیۃ والحنفیۃ والعترۃ وھو مروی عن مالک فی قول لہ وذھب
ابن ابی لیلی والبتی وابوثور روایۃ عن مالک وقول الشافعی انہ لا یقبل منہ الرجوع
عن الاقرار بعد کمالہ کغیرہ من الاقرارات" ج ۷ ص ۲۶۸۔ ۲۷۰۔
[illegible] المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۳۔ ۱۷۴ بدائع ج ۷ ص ۶۱۔ ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۸۔
[illegible] ہدایہ ج ۲ ص ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۸۔ وفی المیزان للشعرانی ومن ذلک قول

أبي حنيفة وعند الأئمة الثلاثة إن الشهادة في الزنا والقذف وشرب الخمر تسمع بعد مضى زمان طويل من الواقعة" ج ۲ ص ۱۷۸ - بدائع وفيه "لم يقدر ابوحنيفة رحمه الله للتقادم تقديرا وفوض ذلك الى اجتهاد كل حاكم في زمانه" ج ۷ ص ۴۶-۴۷ . وكذا في قاضيخان بهذا معناه ج ۳ ص ۴۷۷ وفيه أيضاً "والتقادم لا يمنع صحة الاقرار بالزنا" ج ۳ ص ۴۷۸ تكملة لسان الحكام للعلامه برهان الدين الحلبي ص ۳۴ -

۳۰ ابن ماجه باب النهي عن اقامة الحدود في المسجد كتاب الأم ج ۷ ص ۱۵۰ - اختلاف ج ا ص ۱۳۶ - بدائع ج ۷ ص ۶۰ - المختصر بهامش الأم ج ۵ ص ۱۷۷ -

۳۱ احكام ج ۲ ص ۸۴ - ۸۵ - في غرائب القرآن للقمي "ومعنى الطائفة .... وعن عطاء و عكرمة اثنان وعن الزهري وقتادة ثلاثة وقال ابن عباس والشافعي أربعة بعدد شهود الزنا وعن الحسن عشرة لأنها أول عقد وجوز ابن عباس الى اربعين رجلا من المصدقين بالله" ج ۱۸ ص ۶۴ - المغني ج ۱۰ ص ۱۳۷ - ۱۳۸ - المقدسي ج ۱۰ ص ۱۲۹ - ۱۳۰ بداية المجتهد ج ۲ ص ۳۶۶ - عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ -

۳۲ غرائب القرآن للقمي ج ۱۸ ص ۶۳ - مسلم مع شرحه للنووي ج ۲ ص ۶۹ - نيل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۲ - المقدسي ج ۱۰ ص ۱۲۷ - ۱۳۰ - كنز كتاب الحدود قدوری ص ۱۸۵ - بدائع ج ۷ ص ۶۰ - هدایه ج ۲ ص ۴۹۰ - ۴۹۱ - قاضیخان ج ۳ ص ۴۸۰ - ۴۸۱ - عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ - المختصر للمزني بهامش كتاب الأم ج ۵ ص ۱۷۶

۳۳ احکام ج ۲ ص ۳۸ - المظهری ج ۶ ص ۴۱۶ - ۴۱۷ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۳ - ۲۸۵ كتاب الأم ج ۶ ص ۱۳۲ - المقدسي ج ۱۰ ص ۱۲۶ - کنز کتاب الحدود - قدوری ص ۱۸۵ بدائع ج ۷ ص ۶۰ هدایه ج ۲ ص ۴۸۹ - قاضیخان ج ۳ ص ۴۸۱ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ -

۳۴ كتاب الخراج (اردو) ص ۳۶۰ - ۳۶۱ ، المظهری ج ۶ ص ۴۱۷ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۵ - كتاب الأم ج ۶ ص ۱۳۱ - ۱۳۲ - هدایه ج ۲ ص ۴۸۹ - ۴۹۰ [ولمرينه كريه

ایضاً کتاب الخراج لابی یوسف القاضی۔ انتہی۔ شاہ علی عباسی] المختصر للمزنی بہامش الام ج ۵۔ ص ۱۴۶۔

۳۵ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹ و ۶۰ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۰۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ المختصر بہامش الام ج ۵ ص ۱۴۶۔

۳۶ بدائع ج ۷ ص ۶۰ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۰۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اختلاف الطحاوی ج ۱ ص ۱۴۶۔ ۱۴۹۔ المختصر للمزنی بہامش کتاب الام ج ۵ ص ۱۴۶۔

۳۷ نیل الاوطار نقلاً عن المہدی وفیہ "وقد حکی فی البحر الاجماع علی انہ یمہل البکر حتی تزول شدۃ الحر والبرد والمرض المرجو .... وأما المرجوم اذا کان مریضاً اونحوہ فذہبت العترۃ والشافعیۃ والحنفیۃ ومالک الی أنہ لا یمہل" المرض ولا نحوہ اذ القصد اتلافہ" ج ۷ ص ۲۸۳۔ المختصر للمزنی بہامش الأم ج ۵ ص ۱۴۶ (ولم یذکر القطع۔ شاہی) بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶ بدائع ج ۷ ص ۵۹۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۰۔

۳۸ المطری ج ۶ ص ۳۲۴۔ ۳۲۹۔ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۵۴ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۹ و ۲۳۰۔ کتاب الام ج ۶ ص ۱۳۳۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۸۰۔ ۲۸۵۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۸۔ ۱۴۲۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۰۔ ۱۳۴۔ کنز کتاب الحدود۔ قدوری ص ۱۸۶۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹۔ قاضیخان ج ۴ ص ۸۱۴ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹ وفیہ "والنفساء فی اقامۃ الحد علیہما بمنزلۃ المریضۃ والحائض بمنزلۃ الصحیحۃ حتی لا ینتظر خروجہا من الحیض" ولم یذکر العثکال فی الہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۳ والترمذی ج ۱ ص ۱۸۳ والمختصر بہامش الأم ج ۵ ص ۱۴۶۔

۳۹ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ ولم یذکر الضرر فی غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۶ وبدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۶ وکنز کتاب الحدود۔ تفصیل مذاہب کے لیے دیکھیے اختلاف ج ۱ ص ۱۴۵۔ ۱۴۶ و نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۸۔ ۲۸۰ وشرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۶۷ اور تلخیص ج ۴ ص ۵۸

۱۰ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔ ولم یذکرها النسفی فی الکنز کتاب الحدود وتعدها ص ۱۸۰ وبدائع ج ۷ ص ۵۰۔
۹۵ وہدایہ ج ۲ ص ۴۸۹ وقاضیخان ج ۳ ص ۴۸۴ نیز ملاحظہ ہو نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۶-۲۷۷۔

۱۱ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۷۶-۲۷۷۔ اختلاف ج ۱ ص ۳۱۴ وفیہ "وھو قول الشعبی" کنز کتاب الحدود۔ بدائع ج ۷ ص ۵۹ قاضیخان ج ۳ ص ۴۷۹۔

۱۲ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۶۴ بخاری ج ۳ حدیث ۱۷۲۳ مسلم مع شرح للنووی کتاب الحدود ج ۲ ص ۶۸۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۱۷-۲۱۸۔ المدونۃ ج ۴ ص ۴۰۰۔ المختصر بہامش الام ج ۵ ص ۱۶۶۔ المحلی ج ۱۱ ص ۲۴۳-۲۴۶۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۶۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۳۸ اور ص ۱۶۴-۱۷۵۔ قدوری ص ۱۸۵ بدائع ج ۷ ص ۶۳۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔

۱۳ مسند الامام الاعظم مع تنسیق النظام ص ۱۵۷-۱۵۸۔ کتاب الآثار للامام محمد الشیبانی ص ۲۵۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۳۸-۲۳۹۔ ابن ماجہ ص ۱۸۶ تفصیل کے لیے دیکھیے المظہری ج ۶ ص ۴۳۰-۴۳۲ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۴۱-۲۴۲۔ تلخیص الحبیر ج ۴ ص ۵۶۔ بدائع ج ۷ ص ۳۳-۳۷۔ ہدایۃ ج ۲ ص ۴۹۳-۴۹۷۔ قاضیخان ج ۳ ص ۴۷۱-۴۷۳۔ الاشباہ والنظائر لابن نجیم ص ۱۶۳-۱۶۵ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۰-۳۳۱۔

۱۴ بخاری حدیث ۱۰۴۳۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۵۸-۱۶۰۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۸۴-۱۸۵۔ کنز کتاب الحدود بدائع ج ۷ ص ۳۴۔ ہدایہ ج ۲ ص ۴۹۹ قاضیخان ج ۳ ص ۴۸۳۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۲۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں بیہقی ج ۸ ص ۲۳۵-۲۳۶۔ الموطا للامام محمد مع التعلیق الممجد باب الاستکراہ فی الزنا۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۴۵ اور عالمگیری ج ۲ کتاب الحدود الباب الاول ولکن لا یباح الزنا عند الاکراہ وغیبۃ التضییق کما فی البدائع ج ۷ ص ۳۴۔

۱۵ المغنی ج ۱۰ ص ۱۶۹-۱۷۰۔ بدائع ج ۷ ص ۵۱۔ قاضیخان ج ۳ ص ۴۸۴۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۳۱۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۲۰ وفیہ "لا نعلم فیہ خلافا وبہ قال الشافعی واصحاب الرأی"۔

۷۶ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۷۰۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۹۷ وفیہ "قال ابن المنذر أجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم منهم عطاء والزهري ومالك وأبو حنيفة وأحمد واسحاق وأبو ثور وأبو يوسف وهو مذهب الشافعي"

۷۷ احکام ج ۱ ص ۱۵۰۔ المدونۃ ج ۴ ص ۳۹۷۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ قاضیخاں ج ۳ ص ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ہدایہ ج ۲ ص ۳۹۴۔ مغنی المحتاج للشربینی ج ۴ ص ۱۴۶۔ وکذا فی المغنی ج ۱۰ ص ۱۴۴۔ ۱۴۶ والمقدسی ج ۱۰ ص ۱۵۷ اور دونوں نے حضرت عثمان، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور النخعی، الزہری، الاوزاعی، مالک، شافعی، ابوثور، اصحاب الرأی، ابواسحاق الجوزجانی اور ابوبکر الاثرم رحمہم اللہ تعالیٰ کے نام لیے ہیں۔ وفی بدایۃ المجتہد "قال الجمہور لا جلد على من وجب عليه الرجم وقال الحسن البصري واسحق وأحمد وداؤد الثيب الزاني المحصن يجلد ثم يرجم" ج ۲ ص ۳۴۳۔ تقابلی بحث کے لیے دیکھیے المظہری ج ۶ ص ۴۲۴۔ ۴۲۶۔ اور نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۵۔ ۲۵۶۔

۷۸ اختلاف اور تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں: احکام ج ۱ ص ۱۵۰۔ غرائب القرآن للقمی ج ۱۸ ص ۴۰۔ ۴۲۔ المظہری ج ۶ ص ۴۱۷۔ ۴۲۲۔ بیہقی ج ۸ ص ۲۲۱۔ ۲۲۳۔ نیل الاوطار ج ۷ ص ۲۵۲۔ ۲۵۴۔ تلخیص ج ۴ ص ۶۰۔ ۶۱۔ ترمذی ج ۱ ص ۱۷۳۔ اختلاف ج ۱ ص ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ کتاب الأم ج ۶ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ المغنی ج ۱۰ ص ۱۳۳۔ ۱۳۷۔ المقدسی ج ۱۰ ص ۱۶۵۔ ۱۶۹۔ مغنی المحتاج للشربینی ج ۴ ص ۱۴۷۔ ۱۴۹۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ المیزان ج ۲ ص ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ہدایہ ج ۲ ص ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "قلت اذا رأى القاضي مسلما يقع في المعاصي لغلبة الشهوة مع الندم والاستحياء يأمره بالتغريبة والسفر وأما من لا يستحي ولا يندم فنفيه عن الارض حبسه حتى يتوب والله اعلم" دیکھیے المظہری ج ۶ ص ۴۲۱۔ ۷۹ قاضیخاں ج ۳ ص ۴۸۱۔ عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۹۔

۸۰ ملخص از "تہذیب تمدن" بقلم محمد اکرام اللہ۔ اقبال پبلیکیشنز، امین آباد روڈ، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء اور دوسری کتب نفسیات و سماجیات وطب۔

تبصرے

مکاتیب حافظ محمود شیرانی: مرتبہ جناب مظہر محمود شیرانی، تقطیع کلاں، ضخامت ۲۴۸ صفحات، ٹائپ باریک مگر روشن، قیمت مجلد/50 پتہ: جناب خورشید احمد خاں صاحب ۵۸، محمود منزل سمن آباد، لاہور۔

پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی (۱۸۸۰ — ۱۹۴۶ء) اردو زبان و ادب اور فارسی کے ایسے یگانہ و بلند پایہ محقق اور مصنف تھے جن کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر ارباب علم و ذوق حرز جان بنا کر رکھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی، لاہور جو اب تک مرحوم کے مقالات سات جلدوں میں بڑے اہتمام سے شائع کر چکی ہے اس نے اب بڑی کاوش اور تلاش کے بعد مرحوم کے مکاتیب کا یہ مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے، یہ کتاب دو حصوں پر تقسیم ہے: (۱) نسخہ ہائے وفا اور (۲) مجموعۂ خیال، پہلا حصہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو شیرانی صاحب نے بزمانۂ قیام انگلینڈ (از ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۳ء) اپنے والد ماجد (محمد اسماعیل خاں صاحب) اور دوسرے اعزا و اقربا کو لکھے ہیں، اور دوسرے حصہ میں وہ خطوط ہیں جو ہندوستان واپس آنے کے بعد دوستوں، شاگردوں اور ہمعصروں کے نام ہیں، حصۂ اول میں چھیاسٹھ (٦٦) مکاتیب ہیں اور حصۂ دوم میں (۱۰۷) مؤخر الذکر خطوط تو علمی ہیں ہی، کیونکہ ان میں علمی استفسارات کے جوابات ہیں جن میں بعض اہم علمی اور تحقیقی نکات و لطائف، کتابوں اور مقالات کے نام زیر تحریر آگئے ہیں، حصۂ اول کے خطوط بھی اس لیے اہم ہیں کہ ان سے انگلینڈ کے اس زمانہ کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی و تعلیمی کوائف کے علاوہ خود شیرانی صاحب کے ذاتی اخلاق و عادات، ان کے خاندانی اور خانگی معاملات و مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے، غرض کہ یہ مکاتیب بذات خود بھی تاریخی اور ادبی حیثیت سے بہت اہم اور مفید ہیں پھر جناب مظہر محمود شیرانی (اختر شیرانی مرحوم کے فرزند ارجمند) نے ان خطوط پر جگہ جگہ حواشی

اور دوستی نے کر ان خطوط کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے، شروع میں سید منظور الحسن صاحب برکاتی نے شیرانی صاحب مرحوم کی شخصیت، ان کے اخلاق و عادات اور سرزمین ٹونک سے ان کی وابستگی پر دلچسپ اور موثر پیرایہ بیان میں روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعد لائق مرتب نے مکاتیب کی نوعیت اور ان کی فراہمی کی داستان سنائی ہے اور چونکہ تلاش برابر جاری ہے اس لیے مزید مکاتیب کے ملنے کی امید ظاہر کی ہے، آخر میں بترتیب ذیل چھ اشاریے (۱) ذکور واناث، (۲) اقوام و تبار (۳) بلاد و اماکن (۴) ادارے (۵) کتب و رسائل (۶) اخبارات و جرائد بھی کو محترمہ فوزیہ خورشید نے بڑے سلیقہ اور محبت سے مرتب کیا ہے، کتاب کے رُخِ روشن پر غازہ کا کام کر رہے ہیں۔

تذکرہ مجمع الشعرائے جہانگیری: تحقیق و تعلیق از ڈاکٹر محمد سلیم اختر استاد شعبۂ تاریخ و تمدن ایشیا نیشنل یونیورسٹی آسٹریلیا۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۴۰۲ صفحات، ٹائپ، طباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت -/100، پتہ: ادارہ تحقیقات علوم مرکزی و مغربی ایشیا، کراچی یونیورسٹی، کراچی پاکستان۔

ملا قاطعی ہروی (متوفی ۱۰۲۴ھ) ہمایوں، اکبر اور جہانگیر تینوں شاہانِ مغلیہ کے دربار سے وابستہ اور اپنے وقت کے عالم و فاضل شخص تھے، تذکرہ نگاری کا خاص ذوق رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مجمع الشعرائے جہانگیری کے نام سے شعراء کا ایک ضخیم تذکرہ تین جلدوں میں مرتب کیا اور ہر جلد کا نام ایک دفتر رکھا تھا، ان میں سے دفتر اول و دوم کا تو اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے، غالباً دستبرد روزگار کا شکار ہو گئے، البتہ دفتر سوم کا مخطوطہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی اوذلی لائبریری میں محفوظ تھا، اتفاق سے یہ نسخہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد سلیم اختر کی نظر سے گذرا تو اس کی افادیت کے پیش نظر آپ نے پہلے اس پر ایک مقالہ لکھا اور پھر کراچی یونیورسٹی کے ادارۂ تحقیقات علوم مرکزی و مغربی ایشیا کی فرمائش پر اس مخطوطہ کو بڑی محنت اور کاوش سے اڈٹ بھی کر دیا۔ مصنف نے کتاب میں ۱۵۱ شعراء کے حالات قلمبند بیان کیے ہیں، مگر

مختصر اور دیکھی لشتم پشتم، بغیر کسی خاص ترتیب اور تنظیم کے، فاضل مرتب نے اپنے طویل مقدمہ میں اس کتاب کا محققانہ تجزیہ و تحلیل کرکے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی ہے:

(۱) کتاب کے نام سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اس میں عہد جہانگیر کے شاعروں کا ہی تذکرہ ہوگا حالانکہ اس میں ان شاعروں تک کا ذکر ہے جو بابر کے ہاتھوں سلطنت مغلیہ کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اس سلسلہ میں پروفیسر اسٹوری کی تغلیط بھی کی گئی ہے جنھوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کتاب ان شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے جنھوں نے جہانگیر کی مدح سرائی کی تھی (۲) کتاب کے مآخذ و مصادر کیا ہیں، (۳) کتاب میں کیا خوبیاں ہیں؟ اور اس سے کس طرح بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو دوسری کتابوں سے حاصل نہیں ہوتیں، مثلاً ہمایوں جب ایران سے ہندوستان آیا ہے تو اس کے ساتھ کون کون لوگ تھے، وغیرہ وغیرہ (۴) مگر ان خصوصیات اور خوبیوں کے باوجود کتاب میں کثرت سے غلطیاں اور فروگذاشتیں ہیں، فاضل مرتب نے دلائل کے ساتھ ان کی نشاندہی اور پھر تصحیح کی ہے، ان کے نزدیک اسٹوری کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ بانکی پور لائبریری کا یہ مخطوطہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، (۵) ملا قاطعی ہروی کو عام تذکرہ نویسوں نے خاطر خواہ اعتنا نہیں سمجھا اس لیے اس کے حالات بہت کم ملتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے عرفات العاشقین مؤلفہ تقی الدین محمد اوحدی حسینی اصفہانی اور خود قاطعی کے اپنے بیانات کی اساس پر قاطعی کے حالات و سوانح اور اس کے علم و فضل اور شاعری پر نہایت مفصل اور مبسوط گفتگو کی ہے یہاں تک کہ قاطعی نے قندھار اور آگرہ میں جن ارباب علم و ادب سے فیضان صحبت و معیت کا اکتساب کیا ان کے حالات بھی درج کر دیے ہیں، مقدمہ کے علاوہ فاضل مرتب نے تقریباً ہر صفحہ پر جو حواشی لکھے ہیں وہ بھی بہت جامع محققانہ اور معلومات افزا ہیں، ان حواشی میں قاطعی سے جو غلطیاں اور فروگذاشتیں ہو گئی تھیں ان کی تصحیح کی ہے اور تذکرہ میں مندرجہ شعراء کے حالات اور جن کتابوں میں ملتے ہیں ان کے حوالے دیے ہیں، پھر آخر میں پونے دو سو صفحات میں تعلیقات ہیں جن میں مندرجات تذکرہ سے متعلق مزید معلومات فراہم

کی گئی ہیں، اس کے بعد مآخذ و مصادر کی طویل فہرست اور اشخاص و قبائل، اماکن اور کتب و رسائل کے الگ الگ اشارے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ڈاکٹر محمد سلیم اختر کا بڑا شاندار علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے جس پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں، فارسی زبان و ادب اور اس کی تاریخ کے اساتذہ اور طلبہ کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

فرائد قاسمیہ: از مولانا مفتی نسیم احمد زیدی امروہوی تقطیع متوسط ضخامت ۲۴۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد: درج نہیں۔ پتہ: ادارہ ادبیات دلی، گلی قاسم جان دلی ۔۶

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ان اکابر علمائے ربانیین میں سے تھے جن کا ایک ایک ملفوظ یا مکتوب گنجینۂ علم و حکمت ہوتا ہے، آپ کی متعدد کتابیں اور رسائل شائع ہو چکے ہیں مگر پھر بھی کتنی ہی تحریریں ہیں جو اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں، چنانچہ ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں پھلاودہ میں ایک بلند پایہ عالم اور جامع کمالات بزرگ مولانا حافظ سید عبدالغنی (متوفی ۱۹۳۲ء) تھے جن کو حضرت نانوتوی سے براہ راست شرف تلمذ ظاہری و روحانی حاصل تھا اور حضرت کے ساتھ انھیں اس درجہ عشق تھا کہ مطبوعات کا ہر اڈیشن اور ہر غیر مطبوعہ تحریر حرز جان بنا کر رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت نانوتوی کی چند بالکل نادر و نایاب اور غیر مطبوعہ تحریروں کا جو خود حضرت کی نوشتہ تھیں، ایک مجموعہ "فرائد قاسمیہ" کے نام سے ترتیب دیا تھا جو چند علمی رسائل اور چند طویل مفصل مکاتیب پر مشتمل تھا، مشہور محقق عالم اور مصنف مولانا مفتی نسیم احمد صاحب زیدی نے مولانا حافظ سید عبدالغنی کے کتابخانہ میں اس مجموعہ کو دیکھا اور پڑھا اور پھر اس کا عکس شائع کر دیا علاوہ ازیں شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا جس میں اولاً مولانا سید عبدالغنی کے حالات زندگی اور ان کے علم و فضل کا ذکر کیا گیا اور فرائد قاسمیہ کے مضامین کا تجزیہ کر کے اس کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے اس کے بعد حضرت نانوتوی کے اور اس کتاب کے مکاتیب جن حضرات کے نام لکھے گئے ہیں ان کے جن کی تعداد نو ہے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں حضرت نانوتوی کی دوسری مطبوعہ کتابوں اور رسائل کی طرح یہ کتاب بھی نہایت اہم ہے، کیونکہ اس میں علم الکلام، فقہ، حدیث، تفسیر، فلسفہ،

اور شیعہ سنی اختلافات سے متعلق بعض نہایت اہم اور دقیق مسائل ومباحث زیر گفتگو آگئے ہیں اور حضرت نانوتوی نے ان میں جو داد تحقیق دی ہے وہ ارباب علم کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہی معذوریوں کے باوجود آپ نے اس گوہر نایاب کو حاصل کیا اور محنت وکاوش کرکے اسے دقف عام کردیا، فجزاک اللہ عنا جزاءً خیراً۔ البتہ مولانا سے یہ شکایت ہے کہ اصل مسودہ حضرت نانوتوی کے دو اور رسالوں پر مشتمل تھا جو عربی میں تھے لیکن مولانا نے ان کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ دونوں رسالے نہایت غامض اور دقیق تھے، سوال یہ ہے کہ مطبوعہ کتاب ہی ایسی کونسی سہل اور آسان ہے کہ ہر قاری کے ذہن میں آجائے۔ حضرت نانوتوی کی کوئی تحریر عوام کے بس کی ہوتی ہی نہیں ہے اور اسے ہونا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ بعض اوقات شیخ اکبر اور مجدد الف ثانی کی طرح عالم بالا کی ایسی باتیں بیان کرنے لگتے ہیں جو عوام میں غلط فہمی کا باعث ہوسکتی ہیں، اور چند ایسی چیزیں اس زیر تبصرہ کتاب میں بھی ہیں۔

نوٹ:

نمبر(۱) الحمدللہ اب حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی پہلے سے کافی صحتیاب ہیں۔ مکمل صحت یابی کے لیے درخواست ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب دہلوی شاہی امام جامع مسجد نئی دہلی حضرت مفتی صاحب کی اس اچانک علالت پر بہت متاثر ہیں، موصوف ان دنوں باہر تھے۔

عمید الرحمٰن عثمانی

مینیجر رسالہ برہان، دہلی۔

برہان

جلد نمبر ۸۸، رجب ۱۴۰۲ھ ، مطابق مئی ۱۹۸۲ء ، شمارہ نمبر ۵

مقالات

نظرات

اللہ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ دار العلوم دیوبند تقریباً پانچ ماہ تک بند رہنے اور خلفشار و انتشار کے بحرانی دور سے گذرنے کے بعد ۲۶ مارچ کو باقاعدہ و باضابطہ کھل گیا اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ چھوٹی بڑی سب جماعتوں میں مقامی اور غیر مقامی پندرہ سو طلباء زیر تعلیم ہیں ان میں سے ساڑھے تیرہ سو طلباء کے کھانے کا انتظام مطبخ میں ہے، تمام درجات میں تعلیم باقاعدہ ہو رہی ہے؛ دار الافتاء، دفتر محاسبی، کتب خانہ، اور دوسرے تمام شعبہ جات کھلے ہیں اور کام کر رہے ہیں، دفتر اہتمام کی طرف سے مدرسہ کھلنے کے بعد ہی تمام مدرسین و ملازمین کے نام نوٹس جاری کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی ڈیوٹی پر واپس آجائیں اور جو صدق دل اور خلوص سے واپس آئے گا مدرسہ اس کو خوش آمدید کہے گا اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی" اس نوٹس کے بعد مدرسین و ملازمین آنے لگے، مگر ایک خاصی تعداد (ان سطور کے لکھنے تک) ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اب تک کام پر نہیں آئے ہیں اور نہ ان کی طرف سے کوئی تحریر وصول ہوئی ہے، ایسے افراد و اشخاص کی نسبت یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک تاریخ معینہ تک واپس آکر اپنا کام کرنے لگیں ورنہ بلا اطلاع کے غیر حاضری کے سبب ان کے خلاف دستوری کارروائی عمل میں لائی جائے گی، تنخواہیں بھی مع ان کے بقایا کے تقسیم ہونی شروع ہو گئی ہیں، یہ منظر بھی بڑا رقت انگیز اور مؤثر ہے کہ مدرسہ کی عالیشان مسجد پانچ ماہ تک سنسان اور ویران رہنے کے بعد اب پھر حسب سابق آباد و معمور ہو گئی ہے، اب پانچوں وقت لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے، ایک نہایت خوش الحان قاری امامت کرتے ہیں، اور نمازیوں کی صفیں صحن میں بھی دور تک ہوتی ہیں، علی الصباح آپ مدرسہ میں گھوم

پھر کر دیکھیے تو نماز فجر سے پہلے اور اس کے بعد آپ کو طلبا مسجدمیں تو در ہ میں اور اپنے کمروں میں قرآن مجید کی جہراً تلاوت میں مشغول نظر آئیں گے۔

۱۲ر اور ۱۳ر اپریل کو مجلس شوریٰ کا اجلاس دفتر اہتمام میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ان مسائل و معاملات پر غور و خوض کیا گیا جو مدرسہ کے موجودہ حالات نے پیدا کردیے ہیں اور ان کے متعلق اہم فیصلے کیے گئے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگرچہ مدرسہ کے بند ہونے کے زمانہ میں کیمپ میں تعلیم کا انتظام تھا، تاہم اساتذہ کی کمی اور بعض اور وجوہ کی بنا پر یہ انتظام مکمل اور خاطر خواہ نہیں تھا۔ اس لیے مجلس نے تجویز کیا کہ تعلیم ماہ شعبان کے ختم اور اگر ضرورت ہو تو ماہ رمضان کے بھی کچھ دنوں تک جاری رکھی جائے اور امتحانات شوال میں ہوں۔ عجیب اتفاق ہے، یہ صورت حال ہو بہو وہی ہے جس پر آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عمل ہو رہا ہے، اس اجلاس میں مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کا استعفا بھی پیش ہوا، مجلس نے اس کو منظور نہیں کیا اور مولانا سے درخواست کی ہے کہ استعفا واپس لے لیں، مجلس نے کئی کمیٹیاں بھی مقرر کی ہیں جو اجلاس صد سالہ کے بعد سے اب تک کے حسابات جمع و خرچ، انتظامیہ اور تعلیمی کیفیت پر تحقیقات کرکے ایک معینہ مدت کے اندر اندر اپنی رپورٹ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاحی سفارشات پیش کریں گی۔

۱۴ر اپریل کو عشاء کی نماز کے بعد دارالحدیث میں طلباء و اساتذہ کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں اہالیان قصبہ بھی خاصی تعداد میں موجود تھے، مجلس شوریٰ کی طرف سے خاکسار راقم الحروف نے گھنٹہ سوا گھنٹہ خطاب کیا، میں نے اولاً مدرسہ کھل جانے پر سب کو مبارکباد دی اور پھر کہا کہ اب جب کہ ہم کو اپنے مقصد میں کامیابی اور آپ کو مادر علمی کی ہم کناری حاصل ہوگئی ہے ہمیں چاہیے کہ اب تک جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں اور کسی کی طرف سے بغض و عناد

نہ کہیں کسی کے متعلق بدزبانی اور بدکلامی نہ کریں۔ پہلے خواہ کوئی کیسا ہی رہا ہو لیکن اب دل کی صفائی سے وہ ہم سے ملنے کا خواہاں ہو تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہونا چاہیے، اشتعال انگیز باتیں ہوں گی مگر ہمیں ان کے جواب میں قرآن مجید کے حکم:

ادفع بالتی ھی احسن الآیۃ کو اپنی گرہ میں باندھ لینا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی جو غلطیاں اور فروگذاشتیں ہم سے عمداً یا بے ارادہ سرزد ہوئی ہیں، سچے دل اور خلوص نیت سے ان کے لیے جناب باری تعالیٰ میں توبہ و استغفار کرنا چاہیے، اس کے بعد میں نے کہا: اب ہمارے (مجلس شوریٰ) کے سامنے تین اہم کام ہیں: (۱) استحکام۔ (۲) اصلاح (۳) توسیع و ترقی، استحکام سے مقصد ہے، دارالعلوم کو بیرونی خلفشار اور مفسدات سے پاک و صاف کرنا اور ان سے نجات دلانا، اصلاح کے سلسلہ میں ہمیں دستور پر نظر ثانی کرنی اور اس کی تمام دفعات کو عملاً نافذ کرنا ہے، مدرسین و ملازمین کے لیے عزل و نصب اور ان کی پنشن کے قواعد و ضوابط کو از سر نو مرتب کر کے انھیں اپ ٹوڈیٹ بنانا ہے اور اسی طرح نصاب تعلیم اور طریق تعلیم میں اصلاح کر کے اسے ایسا بنانا ہے کہ معینہ مدت کے اندر مختلف علوم و فنون کی تعلیم ... بصیرت اور روشن دماغی کے ساتھ حاصل ہو سکے۔ پھر ہمیں طلباء کی اخلاقی تربیت اور ان کے قیام و طعام کی سہولتوں پر بھی مزید توجہ کرنی ہے۔ رہا توسیع و ترقی کا پروگرام! تو اس سلسلہ میں ہماری کوشش ہو گی کہ تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے چند نئے شعبے قائم کریں، مثلاً ہمارے ہاں صرف فقہ حنفی کی تعلیم ہوتی ہے، لیکن اب وقت اور حالات کا تقاضہ ہے کہ فقہ کے چاروں مذاہب کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، کیونکہ عالم اسلام کو آج جدید مسائل و معاملات درپیش ہیں ان کا حل اس کے بغیر سخت دشوار ہے، اسی طرح تاریخ (مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی و تمدنی اور علمی تاریخ) کا مضمون ہمارے ہاں نظر انداز رہا ہے لیکن اب وقت کا مطالبہ ہے کہ اب ہم اس پر خاطر خواہ توجہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی اسلامیات پر

تحقیق کا ایک فعال اور متحرک ادارہ قائم کرنا علوم و فنون کے اس طوفانی عہد میں اسلام کی ایک بڑی اہم اور ناگزیر ضرورت ہے۔

بہرحال یہ ہیں ہمارے عزائم اور مقاصد! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق اور حوصلہ وہمت عطا فرمائے کہ ہم اس عظیم منصوبہ کو بروئے کار لاسکیں اور جو کچھ ہم کریں محض اللہ کے لیے کریں اور دنیوی حرص وطمع اور نام ونمود کی خواہش اور نفسانی غرض سے ہم بالکل محفوظ ومامون رہیں، میری تقریر کے بعد مولانا عبدالحلیم صاحب نے مختصراً وعظ ونصیحت کے کلمات ارشاد فرمائے اور ان کی دعاء پر جلسہ بارہ بجے ختم ہوگیا۔

مقامی مسلمانوں کے ایک وفد نے مجلس شوریٰ سے ملنے کی خواہش کی تھی ان کو ۱۳ اپریل کو بارہ بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ ٹھیک وقت مقررہ پر کم وبیش چالیس حضرات پہنچ گئے، جو دیوبند کے مسلمانوں کی مختلف برادریوں کی نمائندگی کر رہے تھے، ان میں دو صاحبوں نے تقریریں کیں جن میں انھوں نے دارالعلوم کے ساتھ اپنی گہری محبت وارادت کا اور دارالعلوم کے کھل جانے پر اپنی دلی مسرت کا اظہار جذباتی انداز میں کیا اور ساتھ ہی دارالعلوم کے تحفظ وبقا اور اس کی ترقی کے لیے اپنی چند تجاویز پیش کیں، مجلس شوریٰ کی طرف سے جوابی تقریر کرتے ہوئے میں نے ان حضرات سے ملاقات اور گفتگو پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور ان کا اور اُن کے ذریعہ ان سب مسلمانان دیوبند کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے کیمپ کے دنوں میں بارہ سو طلبار کی دامے، درمے اور قدمے ہر ممکن مدد کمال خلوص اور للّٰہیت سے کی، میں نے کہا: اگر آج دارالعلوم میں حسب سابق یہ چہل پہل اور رونق ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بڑا دخل آپ حضرات کا بھی ہے کیونکہ مدرسہ کی تالا بندی کے بعد اگر آپ حضرات طلبار کو روک نہ لیتے اور جان ومال سے ان کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری کا غیر معمولی معاملہ نہ کرتے تو دارالعلوم کا قفل کس چابی سے کھلتا۔ رہ گئیں تجاویز! اس سلسلہ میں میں نے عرض کیا: ان تجاویز

میں بعض تو وہ ہیں جو خود مجلس شوریٰ کے پیش نظر ہیں، باقی تجاویز کی نسبت گذارش یہ ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک مجلس شوریٰ پر اعتماد کیا ہے اب اور آئندہ بھی کریں اور ان تجاویز کا معاملہ مجلس کی صوابدید پر چھوڑ دیں" اس تقریر کے بعد دوستی اور محبت کی فضا میں مجلس برخاست ہوگئی اور یہ حضرات شاداں و فرحاں رخصت ہو گئے۔

---

۱۴ اپریل کو بارہ بجے کے قریب دہلی کے مشہور اور کثیر الاشاعت تینوں اخبارات پرتاپ ملاپ اور تیج کے نمائندوں کا ایک وفد کار کے ذریعہ دارالعلوم پہنچا۔ قومی آواز کا نمائندہ اس درمیان ہی دو تین مرتبہ آچکا تھا، اس پریس ڈیلیگیشن کو مدرسہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا، لنچ ہم سب نے وفد کے ساتھ مہمان خانہ میں لیا، اس کے بعد ہم نے وفد سے کہا کہ آپ حضرات سب آزاد ہیں، دارالعلوم میں خوب گھوم پھر کر دیکھیے کہ درجات میں تعلیم ہو رہی ہے یا نہیں؟ تمام دفاتر کھلے ہیں یا نہیں؟ مطبخ میں ساڑھے تیرہ سو طلبا کا کھانا پک رہا ہے یا نہیں؟ وفد نے ایک ایک چیز کو دیکھا، طلبا، مدرسین اور ملازمین سے بات چیت کی اور پھر دفتر اہتمام میں آکر عصرانہ لیا اور ہم لوگوں سے سوال و جواب کیا، ارکان وفد کے تاثرات کیا تھے؟ وہ ان رپورٹوں سے ظاہر ہیں جو ان حضرات نے دہلی واپس پہنچ کر اپنے اخبارات میں شائع کی ہیں۔ ہم نہ صرف انہیں بلکہ ہم تمام ممبران پارلیمنٹ، اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان اور دارالعلوم کے ہمدرد مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دارالعلوم تشریف لائیں اور یہاں کے حالات کا مطالعہ بچشم خود کریں۔

افواہ تھی کہ میرٹھ سے دیوبند تک آگ لگی ہوئی ہے، فریقین میں سخت تناؤ ہے اس مجلس شوریٰ کے جلسہ کے موقع پر فسادات اور ہنگامے ہوں گے اور ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ اپریل میں اس کے نامہ نگار کی جو ایک غلط رپورٹ شائع ہوئی تھی اس نے اس افواہ کو ہوا دی تھی لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ممبران شوریٰ نے تین کاروں میں دہلی سے دارالعلوم

تک کا سفر اس امن و امان اور سکون سے طے کیا کہ کہیں ایک پتہ بھی نہیں کھڑکا۔ پھر مجلس شوریٰ کے جلسے ہوئے تو اس کامل امن و امان اور سکون و عافیت کے ساتھ کہ ایک آواز بھی مخالفت کی کہیں، دارالعلوم کے اندر یا باہر، سنائی نہیں دی۔ فاین تذھبون۔

لکھنؤ کی گزشتہ سے پیوستہ مجلس شوریٰ میں مولانا قاری محمد طیب صاحب کو معطل کر دیا گیا تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی کی بنیاد پر شوریٰ کو اب اس بارہ میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کی ہفت رکنی تحقیقاتی کمیٹی نے جس دلسوزی اور دردمندی سے اپنی سفارشات دوگانہ مرتب کی ہیں ان کا اعتراف و احترام کرتے ہوئے مجلس شوریٰ نے تجویز کیا کہ چونکہ کمیٹی کی سفارش نمبر ۳ کے متعلق مولانا موصوف کے ردعمل کا اب تک علم حاصل نہیں ہو سکا ہے اس لیے اس سلسلہ میں مجلس شوریٰ اپنے آخری فیصلہ کو آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دے۔

اطلاع برائے قارئین

برہان کا سالانہ چندہ مارچ ۸۲ء سے بیس روپے کے بجائے پچیس روپے اور غیر ملکی چالیس کے بجائے پچاس روپے اور فی شمارہ دو روپے پچاس پیسے کر دیا گیا ہے۔

نوٹ: کاغذ کی بے پناہ گرانی، کتابت کی اجرت اور محصول ڈاک میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے مجبوراً ایسا کیا گیا ہے۔

فی شمارہ قیمت : 2/50

منیجر رسالہ برہان
عمید الرحمٰن عثمانی

فقہِ اسلامی کی تدوین وترویج

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایڈیٹر البلاغ، بمبئی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شرعی احکام کا دار ومدار کتاب اللہ یعنی قرآن اور سنت رسول اللہ یعنی حدیث کی صورت میں وحی الٰہی کے تازہ ارشادات وہدایات پر تھا، اور دینی مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آراء واقوال کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آراء واقوال سے بھی کام لیا جاتا تھا، خصوصاً عہد رسالت میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم دینی امور ومعاملات میں مشورہ اور فتویٰ دیا کرتے تھے،

فقہائے صحابہؓ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال اور وحی الٰہی کے انقطاع کے بعد شرعی مسائل وحوادث میں کتاب وسنت کے بعد صحابۂ کرام مرجع تھے اور نئے مسائل میں ان صحابہ کے آراء واقوال معتبر مانے گئے جو دینی علم میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور ان اصحاب فتویٰ کے مشورہ سے اہم مسائل طے ہوتے تھے، بالفاظ دیگر خلافت راشدہ میں "اجماع امت" کی تشکیل شروع ہوگئی، اور اس دور کے اہل علم صحابہ کی رائیں معتبر مانی جانے لگیں، صحابۂ کرام میں وہی حضرات دینی مسائل میں معتبر مانے گئے جو قرآن کے عالم تھے، جنھوں نے قرآن کو لکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو پڑھا اور اس کے معنی ومفہوم اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ کو سمجھا، خلفائے راشدین کے زمانہ میں ایسے اہل علم صحابہ "قرّاء" کے لقب سے مشہور تھے، یہ لقب عالم کو غیر عالم سے ممتاز کرتا تھا۔

صحابۂ کرام میں اصحاب فتویٰ تقریباً ایک سو تیس افراد تھے، جن میں مرد اور عورتیں دونوں صنف شامل تھیں، ان میں فتویٰ کے اعتبار سے سات صحابہ مکثرین ہیں یعنی ان کے فتاوے

بہت کثرت سے ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) حضرت عمر بن خطاب (۲) حضرت علی بن ابی طالب (۳) حضرت عبداللہ بن مسعود (۴) ام المومنین حضرت عائشہ (۵) حضرت زید بن ثابت (۶) حضرت عبداللہ بن عباس (۷) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، ان حضرات کے فتاوے اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ہر صحابی کے مسائل و فتاوے کی کئی ضخیم جلدوں میں تیار ہو جائیں، ابوبکر محمد بن موسیٰ نے صرف حضرت عبداللہ بن عباس رض کے فتاوے بیس جلدوں میں جمع کیے تھے۔

اور تیرہ حضرات "متوسطین" میں ہیں (۱) حضرت ابوبکر صدیق (۲) ام المومنین حضرت ام سلمہ، (۳) حضرت انس بن مالک (۴) حضرت ابوسعید خدری (۵) حضرت ابوہریرہ، (۶) حضرت عثمان بن عفان، (۷) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، (۸) حضرت عبداللہ بن زبیر، (۹) حضرت ابوموسیٰ اشعری، (۱۰) حضرت سعد بن ابی وقاص (۱۱) حضرت سلمان فارسی، (۱۲) حضرت جابر بن عبداللہ، (۱۳) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم، ان حضرات کے فتاوے اگر جمع کیے جائیں تو ان کی چھوٹی چھوٹی جلدیں بن سکتی ہیں، ان ہی میں یہ حضرات بھی شامل کیے جا سکتے ہیں (۱) حضرت طلحہ (۲) حضرت زبیر، (۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، (۴) حضرت عمران بن حصین، (۵) حضرت ابوبکرہ (۶) حضرت عبادہ بن صامت، (۷) حضرت معاویہ بن ابی سفیان، ان حضرات کے فتاوے بھی جمع کیے جائیں تو مختصر مجموعے تیار ہو سکتے ہیں،

ان کے علاوہ باقی حضرات اصحاب فتوی "مقلّین" ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک سے چند فتاوے منقول ہیں۔ جن کو تلاش و تحقیق کے بعد مختصر مجموعہ کی صورت میں مدوّن کیا جا سکتا ہے،

فقہائے تابعین و تبع تابعین | اس کے بعد امام ابن قیم رح نے اعلام الموقعین میں تفصیل سے بتایا ہے کہ عہد صحابہ کے بعد عہد تابعین میں کس شہر میں کون کون حضرات اصحاب فتویٰ تھے۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں | یہ فقہائے سلسلہ دینی مسائل میں مرجع تھے اور ان کے فتاوے مستند

معتبر مانے جاتے تھے، (۱) سعید بن مسیب (۲) عروہ بن زبیر (۳) قاسم بن محمد (۴) خارجہ بن زید (۵) ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، (۶) سلیمان بن یسار (۷) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ رحمۃ اللہ علیہم، نیز ان کے معاصرین میں یہ حضرات فتویٰ میں مشہور تھے، ابان بن عثمان بن عفان، سالم، نافع، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، علی بن حسین زین العابدینؒ ان حضرات کے بعد مدینہ منورہ میں اصحاب فتویٰ یہ حضرات تھے، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، محمد بن ابوبکر بن محمد، عبداللہ بن عمر بن عثمان، محمد بن عبداللہ بن عمر بن عثمان، عبداللہ بن محمد بن حنفیہ، حسین بن محمد بن حنفیہ، جعفر بن محمد بن علی، عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابوبکر، محمد بن منکدر، محمد بن شہاب زہری، محمد بن لعزح نے امام زہری کے فتاوے فقہی ترتیب وابواب پر تین ضخیم اسفار میں جمع کیے تھے، ان حضرات کے معاصرین میں مدینہ منورہ میں اور بھی اصحاب فتویٰ تھے،

مکہ مکرمہ میں | اہل فقہ وفتویٰ میں یہ حضرات معتبر ومستند تھے، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، جبر، عبید بن عمیر، عمرو بن دینار، عبداللہ بن ابی ملیکہ، عبدالرحمٰن بن سابط، عکرمہ مولیٰ ابن عباس رحمہم اللہ، ان کے بعد ابوالزبیر مکی، عبداللہ بن خالد بن اسید، عبداللہ بن طاؤس، ان کے بعد عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج، سفیان بن عیینہ، ان کے بعد مسلم بن خالد زنجی، سعید بن سالم القداح رحمہم اللہ مکہ مکرمہ میں فقہ وفتویٰ میں مرجع تھے، ان کے بعد امام محمد بن ادریس شافعی، اور عبداللہ بن زبیر حمیری وغیرہ تھے،

بصرہ میں | یہاں کے اصحاب فقہ وفتویٰ میں یہ حضرات مشہور تھے، عمرو بن سلمہ جرمی، ابومریم حنفی، کعب بن اسود، حسن بصری، ابوالشعثاء، جابر بن زید، محمد بن سیرین، ابوقلابہ عبداللہ بن زید جرمی، مسلم بن یسار، ابوالعالیہ، حمید بن عبدالرحمٰن، مطرف بن عبداللہ الشخیر، زرارہ بن ابی اوفیٰ، ابوبردہ بن ابی موسیٰ اشعری، ان میں امام حسن بصری نے پانچ سو صحابہ رضی اللہ عنہ سے فیض پایا تھا، بعض علماء نے ان کے فتاوے سات ضخیم اسفار میں جمع کیے تھے

ان کے بعد بصرہ میں ایوب بن کیسان سختیانی، سلیمان تیمی، عبداللہ بن عوف، یونس بن عبید، قاسم بن ربیعہ، خالد بن ابی عمران، اشعث بن عبدالملک حمرانی، قتادہ، حفص بن سلیمان، قاضی ایاس بن معاویہ اہل فقہ وفتویٰ تھے، ان کے بعد ان کے تلامذہ اور منتسبین کا سلسلہ قائم رہا،

کوفہ میں اصحاب فتویٰ اور مفتیین میں یہاں کے یہ حضرات مستند و مرجع تھے، علقمہ بن قیس نخعی، اسود بن یزید نخعی، عمرو بن شرحبیل ہمدانی، مسروق بن اجدع ہمدانی، عابیدہ سلمانی، قاضی شریح بن حارث، سلیمان بن ربیعہ باہلی، زید بن صوحان، سوید بن غفلہ، حارث بن قیس جعفی، عبدالرحمٰن بن یزید نخعی، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، خیثمہ بن عبدالرحمٰن، سلمہ بن حبیب، مالک بن عامر، عبداللہ بن سنجرہ، زِرّ بن حُبیش، خلاس بن عمرو، عمرو بن میمون اودی، ہمام بن حارث، حارث بن سوید، یزید بن معاویہ نخعی، ربیع بن خثیم، عتبہ بن فرقد، صلہ بن زفر، شریک بن حنبل، ابو وائل شقیق بن سلمہ، و عبید بن نضلہ،

کوفہ کے یہ وہ مجتہدین و مفتیین ہیں جن کا شمار اکابر تابعین میں ہوتا ہے اور جو حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے خاص شاگردوں میں ہیں، لوگ ان سے استفتار کرتے تھے اور وہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں فتویٰ دیا کرتے تھے، اور صحابہ ان کو اجازت دیتے تھے، ان میں سے اکثر حضرات نے حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ سے علم حاصل کیا تھا۔ عمرو بن میمون اودی حضرت معاذ بن جبلؓ سے خصوصی تلمذ رکھتے تھے، حضرت معاذ بن جبل نے وفات کے وقت ان کو وصیت کی تھی کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت میں رہ کر ان سے علم دین حاصل کریں، چنانچہ عمرو بن میمون اودی نے اس پر عمل کیا،

فقہائے کوفہ کی اس فہرست میں یہ حضرات بھی قابل شمار ہیں ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (انھوں نے ایک سو بیس صحابہ سے علم حاصل کیا تھا) میسرہ، زاذان، اور ضحاک،

اس طبقہ کے بعد ابراہیم نخعی، عامر شعبی، سعید بن جبیر، قاسم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود، ابوبکر بن ابی موسیٰ، محارب بن دثار، حکم بن عتیبہ، جبلہ بن سحیم تلمیذ ابن عمر اہل فقہ و فتویٰ تھے، ان کے بعد حماد بن ابی سلیمان، سلیمان بن معتمر، سلیمان الاعمش، مسعر بن کدام کا درجہ ہے، پھر مذکورہ بالا حضرات کے سلسلۂ تلمذ میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، عبداللہ ابن شبرمہ، سعید بن اشوع، قاضی شریک، قاسم بن معن، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، حسن بن صالح ہیں، ان کے بعد کے فقہاء میں حفص بن غیاث، وکیع بن جراح اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں قاضی ابویوسف، محمد بن حسن، زفر بن ہذیل، حماد بن ابی حنیفہ، حسن بن زیاد لؤلؤی، قاضی عافیہ، اسد بن عمرو، قاضی نوح بن دراج، اور امام سفیان ثوری کے تلامذہ میں اشجعی، معافی بن عمران، یحییٰ بن آدم وغیرہ ہیں،

شام میں | ملک شام کے تابعین میں یہ حضرات اصحاب فقہ و فتویٰ تھے اور دینی مسائل و حوادث میں ان کے فتاوے معتبر مانے جاتے تھے، ابوادریس خولانی، شرحبیل بن سمط، عبداللہ بن ابی زکریا خزاعی، قبیصہ بن ذویب خزاعی، حیان بن امیہ، سلیمان بن حبیب محاربی، حارث بن عمیرہ زبیدی، خالد بن معدان، عبدالرحمٰن بن غنم اشعری، جبیر بن نفیر

ان کے بعد عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر، مکحول، عمر بن عبدالعزیز، رجاء بن حیوہ، حدیر بن کریب تھے اور اسی طبقہ مفتیین میں خلیفہ ہونے سے پہلے عبدالملک بن مروان کا بھی شمار تھا۔

اس کے بعد قاضی یحییٰ ابن حمزہ، ابوعمر، عبدالرحمٰن بن اوزاعی، اسمٰعیل بن ابی مہاجر، سلیمان بن موسیٰ اموی، سعید بن عبدالعزیز شام کے اہل فتویٰ تھے، پھر مخلد بن حسین، ولید بن مسلم، عباس بن یزید تلمیذ امام اوزاعی، شعیب ابن اسحاق تلمیذ امام ابوحنیفہ، اور ابواسحاق فزاری تلمیذ امام عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ تھے؛

مصر میں | اہل مصر مسائل و حوادث میں ان بزرگوں کے فتاوے پر عمل کرتے تھے، یزید بن ابی حبیب، بکیر بن عبداللہ بن اشج، عمرو بن حارث جن کے بارے میں ابن وہب کا قول ہے کہ اگر

[redacted]

عمرو بن حارث ہمارے درمیان زیادہ دنوں تک زندہ رہتے تو ہم امام مالک وغیرہ کے محتاج نہ ہوتے)۔ لیث بن سعد، عبیداللہ بن ابی جعفر، اس طبقہ کے بعد امام مالک کے تلامذہ میں عبداللہ بن وہب، عثمان بن کنانہ، ابن قاسم اور امام شافعی کے تلامذہ میں مزنی، بویطی، ابن عبدالحکم مصر کے اصحاب فقہ و فتویٰ ہوئے؛

اسی طرح اس دور میں یمن، قیروان، اندلس اور بغداد وغیرہ میں حضرات مجتہدین و مفتیین کی جماعت مسلمانوں کے دینی مسائل و حوادث میں مرجع تھی، تفصیل امام ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعین میں موجود ہے،

اصحاب الحدیث اور اصحاب الفقہ خلافت راشدہ کے بعد علمائے دین کے لیے "قرّاء" کے بجائے دو نئے لقب پیدا ہوئے، صورت یہ ہوئی کہ بہت سے صحابہ احادیث کی کتابت اور سند و متن پر خاص توجہ رکھتے تھے، اور یہ صحابہ اور ان کے اصحاب و تلامیذ احادیث کے الفاظ و معانی کی طرف زیادہ راغب ہوئے، ان کو اہل الحدیث کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔ ان علماء کا مرکز حجاز کے دو شہر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تھے۔ اور بہت سے صحابہ قرآن کے مقابلہ میں احادیث کی کتابت مناسب نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کو زبانی یاد کر کے الفاظ سے قطع نظر ان کے معانی و مفاہیم پر زیادہ توجہ دیتے تھے، ان حضرات کے شاگردوں نے ان کا اتباع کیا، چونکہ یہ لوگ حدیث کے ظاہری الفاظ سے زیادہ اس کے منشاء و مفہوم کا لحاظ کیا کرتے تھے اور نئے مسائل میں دوسرے شرعی دلائل سے بھی مدد لیتے تھے، اس لیے ان کو اہل الرائے یا اہل الفقہ کہا گیا، ان کا مرکز عراق کا شہر کوفہ تھا، اور یہ ہم نے جن بلاد و امصار کے اصحاب فقہ و فتویٰ کا ذکر کیا ہے، ان میں اصحاب حدیث بھی بڑی تعداد میں اپنے اصول کے مطابق دینی مسائل و حوادث میں فتویٰ صادر کرتے تھے، اس وقت اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے، ان ہی فقہاء و محدثین کے تلامذہ نے آگے چل کر دنیا میں کتاب و سنت اور فقہ و فتویٰ کو عام کیا؛

فقہ کی تدوین | حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) میں ان کی عنایت و توجہ سے احادیث و آثار کے جمع و تدوین کا باقاعدہ اہتمام ہوا، اور صحابۂ کرام کے احادیث کے صحیفوں اور کراسوں کی جگہ کتابوں کا رواج ہوا، اس طرح اموی دور میں تدوین و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور عباسی دور کی ابتداء سے مختلف علوم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی، عام لوگوں میں علمی رجحان بڑھا، عربی زبان میں نئے نئے علوم و فنون منتقل ہونے لگے، اس وقت پورے عالمِ اسلام میں علمائے تابعین اور ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے، اور ہر طرف دینی علوم کا چرچا تھا، اس لیے دینی علوم کو بھی آگے بڑھنے کا خوب موقع ملا، اور احادیث و آثار فقہی ترتیب پر کتابی شکل میں مدوّن ہوئے، چنانچہ دوسری صدی کے نصف (۱۴۰ھ تا ۱۵۰ھ) میں مختلف ممالک میں وہاں کے ائمۂ علم نے کتابیں لکھیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) مدینہ منورہ امام مالک (۲) مکہ مکرمہ میں ابن جریج (۳) بصرہ میں ربیع بن صبیح (۴) کوفہ میں سفیان ثوری (۵) شام میں اوزاعی، (۶) واسط میں ہشیم (۷) یمن میں معمر (۸) رے میں جریر بن عبدالحمید (۹) خراسان میں عبداللہ بن مبارک یہ تمام ائمۂ دین ایک وقت میں موجود تھے، اور انھوں نے اپنی کتابیں ۱۴۰ھ کے بعد لکھیں اس لیے یہ معلوم نہیں ہے کہ کس عالم نے تدوین و تالیف کی ابتداء کی، جیساکہ ہدیۃ الساری مقدمہ فتح الباری میں ہے۔

یہ تو اس زمانہ میں اصحابِ حدیث کی فقہی ترتیب پر دینی خدمات تھیں، اسی زمانہ میں اہلِ فقہ کے مرکز کوفہ میں فقہ و فتویٰ کی باقاعدہ تدوین شروع ہوئی، امام ابوحنیفہ رہ اور ان کے تلامذہ امام محمد، امام ابویوسف، امام زفر، وغیرہ نے مل کر اس کو مدوّن کر کے دنیا میں پہلی بار فقہ اسلامی کو مستقل فن کی حیثیت سے پیش کیا، ان حضرات نے قرآن و حدیث قیاس و اجماع سے فقہی مسائل و قواعد فنی حیثیت سے مدوّن کر کے تقریباً ان کو سیکڑوں کو ایک جگہ منضبط کیا، اسی لیے امام شافعی فرماتے ہیں کہ لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال ہیں

متحایین" اور قاضی صیمری نے "اخبار ابی حنیفہ واصحابہ" میں امام شافعی کا قول اس طرح نقل کیا ہے، "تمام لوگ فقہ میں اہل عراق کے عیال ہیں، اور تمام اہل عراق اہل کوفہ کے عیال ہیں اور تمام اہل کوفہ ابوحنیفہ کے عیال ہیں نیز فقہی فروعات اور مسائل کی طرح اصول فقہ کی تدوین سب سے پہلے امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ نے کی ہے۔

الغرض دوسری صدی کے وسط میں فقہاء و محدثین بالفاظ دیگر اہل الحدیث اور اہل الرائے نے اپنے اپنے اصول وقواعد کی روشنی میں مسائل کے استنباط و تدوین کی خدمت انجام دی، اس کے بعد دونوں گروہ کے تلامذہ اور متبعین نے اپنے پیشروؤں کے نقش قدم پر چل کر حدیث و فقہ کو مدوّن کیا، یہاں یہ بیجاننا ضروری ہے کہ محدثین کرام اجتہاد اور قیاس کے مخالف و منکر نہ تھے، البتہ وہ احادیث پر زیادہ توجہ دیتے تھے، اور حتی الوسع حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم پر عمل کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح فقہائے عظام احادیث و آثار کے مخالف و منکر نہ تھے، بلکہ وہ بھی قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کرتے تھے البتہ تمام اصول و فروع کا لحاظ کر کے احتیاطی راہ اختیار کرتے تھے اور قرآن و حدیث کے منشاء و مفہوم پر زیادہ زور دیتے تھے۔

فقہ کے چار مکاتب گذشتہ بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں دینی احکام کا دارومدار وحی الٰہی اور آپ کے قول و عمل پر تھا نیز اس عہد میں چند صحابہ اہل فتویٰ تھے، اس کے بعد صحابہ اور تابعین کے دور میں علوم شرعیہ کے حاملین حجاز، شام، مصر، عراق اور دیگر مرکزی مقامات میں بٹ گئے، اور ان حضرات کے اصولِ روایت و درایت ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھے، ان میں علمائے حجاز حدیث کے متون و اسناد میں مشہور و معتبر تھے، ان کے سلسلۂ تلمذ میں بڑے بڑے ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان کے سرخیل حضرت امام مالک بن انسؒ (متوفی ۱۷۹ھ) ہیں۔ جنھوں نے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے اپنی کتاب موطا کو فقہی ترتیب اور ابواب کی طرح

مرتب کیا کہ یہ کتاب گویا اس طبقہ کی ترجمان بن گئی، اس کے مقابلہ میں علمائے عراق احادیث کی روایت میں بڑی شدت سے کام لیتے تھے بلکہ غایت احتیاط و تحری کی وجہ سے فتویٰ میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے خود اپنی طرف نسبت کرتے تھے۔ تاکہ روایت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط ہو سکے، اور کوئی ایسی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جسے آپ نے نہیں فرمایا ہے یا نہیں کیا ہے، اس جماعت کے سرخیل حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (متوفی ۱۵۰ھ) ہیں جنھوں نے اپنے تلامذہ کو لے کر فقہ اور اصول فقہ کو باقاعدہ مرتب کیا۔

ان دونوں اماموں کے بعد علمائے حجاز کے طبقہ میں حضرت امام محمد بن ادریس شافعی رح متوفی (۲۰۴ھ) ہیں۔ جنھوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ائمۂ حدیث سے علوم حاصل کیے، اسی کے ساتھ امام ابو حنیفہ کے تلامذہ سے تحصیل علم کی، خصوصیت کے ساتھ امام محمد بن حسن شیبانی سے بہت زیادہ پڑھا، چونکہ امام شافعی نے علوم دینیہ کے دونوں مرکزوں یعنی حجاز اور عراق سے کسب علم کیا تھا اور دونوں مکاتب حدیث و فقہ کے اصول اور فکر و نظر سے واقف تھے، اس لیے اہل حجاز اور اہل عراق کے طرز تفقہ میں ایک درمیانی راہ پیدا کی، اور ایسی فقہ ترتیب دی، جس میں حدیث اور رائے کا توازن برقرار رکھا، اس درمیانی راہ میں امام شافعی نے اکثر مسائل میں اہل حجاز کے سرخیل اور اپنے استاد امام مالک سے اختلاف کیا اور اپنا جداگانہ مسلک قائم کیا، امام شافعی کے بعد بغداد میں امام احمد بن حنبل شیبانی رح (متوفی ۲۴۱ھ) نے اہل حجاز کے علمی سلسلہ کے ساتھ وابستگی رکھ کر اپنے مسلک اور فقہ کو رائج کیا، جس کی بنیاد زیادہ تر حدیث کے ظاہری الفاظ و معانی پر رکھی، مگر اس میں اتنا غلو نہ تھا جتنا کہ امام داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا، امام احمد بن حنبل کے فقہی فتاوے اگر جمع کیے جائیں تو تیس ضخیم جلدوں تک پہنچ سکتے ہیں، ان کے تلمیذ شیخ خلال نے الجامع الکبیر میں ان کے فتاوے اور نصوص جمع کیے ہیں، جو بیس بلکہ اس سے زائد اسفار پر مشتمل

یا جیسا کہ امام ابن قیم نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے۔

ان مذاہب اربعہ سے پہلے صحابہ کرام کے فتاوے اور اقوال مرجع تھے، پھر تابعین اور تبع تابعین نے اپنے اپنے شہروں میں اپنے یہاں کے اہل فتویٰ صحابہ کی پیروی کی بعد میں ہر شہر کے باشندوں نے مقامی مفتی و فقیہ کا اتباع کیا، نیز ایک مقام کے فتاوے دوسرے شہروں اور ملکوں میں پہنچے، اس طرح ان چاروں فقہ سے پہلے عالم اسلام میں دوسرے ائمہ فقہاء کی فقہیں رائج تھیں اور عوام ان پر عمل کرتے تھے، چنانچہ امام سفیان ثوری (متوفی ١٦١ھ) امام حسن بصری (متوفی ١١٠ھ) اور امام اوزاعی (متوفی ١٥٧ھ) کے فقہی مذاہب پر عمل تھا، مگر یہ تینوں مسلک تیسری صدی کے آخر تک معمول بہ رہ کر ختم ہو گئے، اسی طرح امام ابو ثور (متوفی ٢٤٠ھ) کا مسلک تیسری صدی تک رائج رہنے کے بعد ختم ہو گیا، البتہ امام داؤد ظاہری (متوفی ٢٧٠ھ) کا ظاہری مسلک زیادہ مدت تک چلا، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ مذہب آٹھویں صدی تک دنیا میں جاری رہا، ظاہری مسلک کے ائمہ و علماء حدیث کا مطلب اس کے ظاہری الفاظ کے مطابق بیان کرتے تھے، اور اس میں کسی قسم کے اجتہاد اور قیاس کو دخیل نہیں مانتے تھے۔

بہرحال یہ تمام فقہیں اپنے اپنے وقت میں ختم ہو گئیں اور اہل سنت والجماعت کے دینی مسائل ائمہ اربعہ کے چاروں مذاہب میں منحصر ہو گئے اور چونکہ ایک مسئلہ میں ایک ہی مسلک کی پیروی کی جا سکتی ہے اس لیے علمائے اہل سنت نے طے کر لیا کہ عام مسلمانوں کو ان چاروں فقہوں میں سے کسی ایک فقہ کو مان لینا چاہیے تاکہ فروعی مسائل اور وقتی حوادث میں ذاتی مصالح کا سدباب ہو سکے، اہل سنت والجماعت کے ان چار مذاہب کے علاوہ مسلمانوں میں بعض اور فقہیں بھی رائج ہیں جیسے فقہ جعفری، فقہ خارجی اور فقہ زیدی، ان کا تعلق شیعہ، خوارج اور زیود سے ہے اس لیے ان کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے، خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ان فقہاء اور ان فقہوں کے ماننے اور ان پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فروعی مسائل اور وقتی حوادث

میں ہم ان کی تفریعات و تصریحات کو تسلیم کرتے ہیں، ورنہ ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی کو اصل ایمان قرار دیتے ہیں، اور ان ہی کی روشنی میں صحابۂ کرام، تابعین عظام اور علمائے اسلام کا اتباع کر کے فروعات میں ان کے آراء پر عمل کرتے ہیں،

ائمۂ اربعہ کے فقہی اصول | جیساکہ معلوم ہوا ابتداء میں بہت سے بزرگوں نے اپنے طور پر فقہ کو مرتب کیا اور اس پر عمل بھی رہا مگر رفتہ رفتہ اکثر فقہیں ختم ہو گئیں، صرف چار فقہیں باقی رہ گئیں اور ان میں جو باہمی اختلاف پائے جاتے ہیں وہ بالکل قدرتی ہیں، فقہ کے چاروں مکاتب نے مسائل کے استخراج اور تفریع میں اپنے اپنے اصول کو پیش نظر رکھا، جس سے ان کی فہم و تحقیق میں کچھ اختلاف رہا، اسی لیے چاروں مذاہب میں تھوڑا تھوڑا فرق ہو گیا۔

امام ابوحنیفہ کے استنباط و استخراج کے اصول خود آپ کی زبانی یوں منقول ہیں کہ میں شرعی احکام کے استنباط میں پہلے کتاب اللہ میں غور کرتا ہوں، جب اس میں کوئی حکم نہیں پاتا تو سنت رسول اللہ اور ان آثار میں غور کرتا ہوں جو ثقہ راویوں سے ملتے ہیں، اگر سنت رسول اللہ میں بھی کامیابی نہیں ہوتی تو حضرات صحابہ میں سے جس صحابی کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس صحابی کا قول چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، جب تک قرآن میں کوئی حکم ملتا ہے حدیث کی طرف نہیں آتا، اور جب تک حدیث میں کوئی حکم ملتا ہے صحابہ کے قول کی طرف نہیں آتا، اور جب تک صحابہ کے اقوال میں کوئی حکم ملتا ہے آگے نہیں بڑھتا، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی، عامر شعبی، حسن بصری، ابن سیرین اور سعید بن مسیب وغیرہ تک پہنچتا ہے تو پھر میں بھی ان ہی کی طرح اجتہاد سے کام لیتا ہوں۔

امام مالک اپنے فقہی اصول کی رو سے پہلے کتاب اللہ کو لیتے ہیں، پھر سنت رسول اللہ میں سے جو حدیث ان کے نزدیک صحیح و ثابت ہوتی ہے اسے لیتے ہیں، اس سلسلہ میں اہل حجاز کے محدثین کیا رپر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، نیز اہل مدینہ کے تعامل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، خصوصاً وہاں کے اہل علم کے تعامل کو، حتیٰ کہ بعض اوقات حدیث کو اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس پر اہل

حدیث کا محل نہیں ہے۔

امام شافعی قرآن کے ظواہر کو اس وقت تک حجت مانتے ہیں جب تک یہ دلیل نہ مل جائے کہ یہاں پر ظاہری معنی مراد نہیں ہے، پھر سنت رسول اللہ سے استدلال کرتے ہیں اور اس میں بڑی فراخی سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ خبر واحد کے راوی اگرچہ ثقہ و ضابطہ ہوں لیکن اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے تو اسے قابل عمل سمجھتے ہیں، امام شافعی کے نزدیک امام مالک کی طرح حدیث کی تائید کے لیے تعامل ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی اہل عراق کی طرح وہ خبر واحد کے مشہور ہونے کی شرط لگاتے ہیں، اس کے بعد اجماع پر عمل کرتے ہیں، مگر اجماع بایں معنیٰ کہ اس کے خلاف کا علم بالکل نہ ہو، کیونکہ ان کے نزدیک کلی اجماع کا علم غیر ممکن ہے، اس کے بعد قیاس پر عمل کرتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی تائید کتاب وسنت سے ہوتی ہو،

امام احمد بن حنبل کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کو حجت مانتے ہیں، اس سلسلہ میں خبر واحد کی سند صحیح ہونے کی شرط پر اس پر عمل کرتے ہیں، اقوال صحابہ کو قیاس پر مقدم مانتے ہیں، جب تک کسی مسئلہ میں کسی صحابی کا کوئی قول ملتا ہے اس میں قیاس سے کام نہیں لیتے،

امام ابوحنیفہ کے بعض مسائل خلاف قیاس ہوتے ہیں، ایسے مسائل کی تخریج کا نام فقہاء احناف کے نزدیک "استحسان" ہے، امام مالک بھی بعض مسائل کو مرسلہ کے طور پر مستنبط کرتے ہیں، اس طریقہ استنباط واستدلال کا نام "استصلاح" ہے، امام شافعی استحسان اور استصلاح کی خدت سے مخالفت کرتے ہیں، لیکن ان ہی طریقوں کے مشابہ طریقہ پر بعض اوقات عمل کرتے ہیں، جس کا نام "استدلال" ہے،

فتنوں کا سدّباب | فقہ اسلامی کی تدریجی تدوین واشاعت کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اختصار کے ساتھ نہایت جامع تبصرہ کیا ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، چوتھی صدی سے پہلے عام مسلمان کسی خاص مذہب کی تقلید پر

مجتمع نہیں تھے، بلکہ جیسا کہ شیخ ابوطالب مکی رحؒ نے قوت القلوب میں لکھا ہے یہ فقہی کتابیں اور فتوؤں کے مجموعے بعد کی پیداوار ہیں، کسی خاص شخص کے آراء ومقالات کا قائل ہونا، کسی خاص مسلک پر فتویٰ دینا، اس کے قول کے مطابق تفقہ پہلی اور دوسری صدی میں نہیں تھا، اس زمانہ میں عام مسلمان اس طریقہ کے پابند نہیں تھے، میں کہتا ہوں کہ دو صدیوں کے بعد لوگوں میں کچھ کچھ اس کے اثرات ظاہر ہوئے، اس کے باوجود چوتھی صدی تک جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے لوگ کسی خاص مذہب کی تقلید نہیں کرتے تھے، بلکہ علماء اور عوام کا حال یہ تھا کہ اجماعی مسائل شرعیہ میں صرف صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے تھے، اس بارے میں عام مسلمان اور جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہیں تھا، البتہ وضو، غسل، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے طریقوں کو اپنے آباء واجداد سے یا اپنے شہر کے معلمین سے سیکھتے تھے، اور فروعات میں ان کے طریقوں کو اختیار کرتے تھے، اور جب نئے مسائل وحوادث پیش آتے تو بلا تعیین حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ جس مفتی وفقیہ کو پا جاتے مسئلہ دریافت کر لیتے، یہ تو عام مسلمانوں کا حال تھا، خواص کا حال یہ تھا کہ ان میں سے محدثین صرف احادیث رسول اللہ اور آثار صحابہ کو لیتے تھے، تعارض یا کسی وجہ سے احادیث وآثار پر عمل نہ کر سکتے تھے تو بعض متقدمین فقہاء کے کلام کو لیتے، اگر کسی مسئلہ میں دو اقوال ہوتے تو ان میں سے قوی تر قول کو لے لیتے، یہ خیال نہ کرتے کہ یہ فقیہ اہل مدینہ سے ہے یا اہل کوفہ سے ہے، اور خواص میں جو لوگ اہل تخریج تھے وہ جس مسئلہ میں تصریح نہ پاتے خود ہی تخریج اور اجتہاد کر لیتے تھے، یہ حضرات اپنے شیوخ واساتذہ کی طرف منسوب ہوتے تھے، ان میں سے کسی کو شافعی اور کسی کو حنفی کہا جاتا تھا، اسی طرح محدثین بھی اگر کسی متقدم امام کی موافقت کرتے تھے تو اس کی طرف منسوب ہوتے تھے، جیسے نسائی اور بیہقی امام شافعی رحؒ کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اس زمانہ میں مجتہد حضرات فقیہ مانے جاتے تھے اور وہی قضا اور افتاء کے منصب پر رکھے جاتے تھے، بعد میں دوسرے لوگ پیدا ہوئے جو ہر طرف منتشر ہو گئے اور دین کی مدح سے دوری کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا

[illegible] مسلمانوں نے خاص خاص مسلک کی تقلید کرلی اور مزید فتنوں میں مبتلا ہونے کے مقابلہ میں کسی ایک مذہب کو پکڑ لینا بہتر جانا؛

مذاہب اربعہ کی اشاعت | گذشتہ بیان سے فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ گذر چکی، جس سے اس کا منظر اور پس منظر سامنے آگیا۔ اب ہم چاروں فقہوں کی ترویج و اشاعت کا حال اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ پورے عالم اسلام میں ان کی مقبولیت و اشاعت کن حالات میں ہوئی اور کس ملک میں کون فقہی مسلک کب اور کس طرح پھیلا، اور موجودہ دور میں اُن کے ماننے والے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں،

حنفی مسلک | اہل سنت کا یہ پہلا فقہی مسلک امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ متوفی ۱۵۰ھ کی طرف منسوب ہے، یہ مسلک فقہ کے چاروں مسلکوں میں سب سے مقدم ہے، اس کی نشو و نما کوفہ میں ہوئی، ابتداء میں عراق کے شہروں میں پھیلا، اس کے بعد دنیا کے دور دراز ملکوں میں اس کی اشاعت ہوئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں بغداد، مصر، شام، روم، بلخ، بخارا، فرغانہ، فارس، ہندوستان، سندھ اور یمن وغیرہ کے اطراف و حدود میں پھیل گیا امام صاحب کی حیات ہی میں، فقہ حنفی کو ان کے چالیس شاگردوں نے با قاعدہ مدوّن و مرتب کیا جن میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ بھی شامل تھے، نیز امام صاحب کے شاگردوں میں اسد بن عمروؒ نے خاص طور سے آپ کی تصانیف و فتاوے کو دنیا میں پھیلایا، کہا جاتا ہے کہ ۱۷۰ھ میں جب خلیفہ ہارون رشید نے قاضی ابو یوسف کو پوری خلافت اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنایا تو ان کے اثر و رسوخ سے مذہب حنفی حدود خلافت میں خوب پھیلا، اور عباسی دور میں یہ مذہب دوسرے فقہی مذاہب پر غالب رہا، براعظم افریقہ یعنی طرابلس، تیونس اور الجزائر وغیرہ میں امام ابو محمد عبداللہ بن فروخ فاسیؒ کی وجہ سے مسلک حنفی کی اشاعت ہوئی، اس کے بعد جب اسد بن فرات بن سنانؒ وہاں کے قاضی ہوئے تو اس مسلک کو خوب فروغ ہوا، اور چوتھی صدی تک افریقہ میں اس کو غلبہ حاصل رہا، جب [illegible] میں وہاں معز بن بادیس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے [illegible]

کو دائم کیا، اندلس اور فاس میں بھی حنفی مسلک قدیم زمانہ میں رائج ہو گیا تھا، جزیرہ صقلیہ کے اکثر مسلمان حنفی فقہ کے پیرو تھے، اہل مصر ۱۶۱ھ میں اس مسلک سے اس وقت آشنا ہوئے جب خلیفہ مہدی کی طرف سے امام اسمٰعیل بن یسیع کوفیؒ کو وہاں کا قاضی بنا کر بھیجا گیا، انکی ذات سے پہلی بار مصر کے مسلمان حنفی مسلک سے واقف ہوئے،

چوتھی صدی کے مشہور جغرافیہ نویس اور سیاح علامہ مقدسی بشاری حنفیؒ نے احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں اس دور کے عالم اسلام کے مذاہب پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے، اور ہر اقلیم پر کلام کرتے ہوئے وہاں کے فقہی مسلک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یمن اور صنعاء میں حنفی مسلک عام تھا، عراق کے اکثر قاضی اور فقیہ حنفی تھے، شام کا کوئی شہر اور دیہات ایسا نہ تھا جس میں حنفی مسلک کے لوگ نہ ہوں، بسا اوقات شام کے قاضی بھی حنفی ہوا کرتے تھے، اسی طرح بلاد مشرق مثلاً خراسان، سجستان، اور ماوراء النہر کے علاقے ترکستان شرقی اور ترکستان غربی وغیرہ میں حنفیت غالب تھی، اقلیم دیلم میں جرجان اور طبرستان کے بعض نواحی میں حنفی باشندے تھے۔ اقلیم رحاب کے شہر مثلاً آرمینیہ، اور تبریز میں حنفیت کا کافی زور تھا، اقلیم جبال اور اہواز کے شہروں میں حنفیت غالب تھی، ان علاقوں میں احناف کے علماء و فقہاء، اور قضاۃ تھے، فارس کے شہروں میں بڑی تعداد میں حنفی موجود تھے، سندھ کے قصبات اور شہر حنفی علماء و فقہاء سے معمور تھے، ہندوستان کے اکثر سلاطین اور عوام حنفی تھے۔

مالکی مسلک | اہل سنت کا دوسرا فقہی مسلک مالکی ہے جو امام مالک بن انس اصبحیؒ متوفی ۱۷۹ھ کی طرف منسوب ہے، اس کا مولد و منشا مدینہ منورہ ہے یہاں سے پورے حجاز میں پھیلا، پھر بصرہ، مصر، افریقہ، اندلس، مغرب اقصیٰ، صقلیہ اور عراق میں اس کو غلبہ حاصل ہوا، نیز یہ مسلک خراسان، قزوین، ابہر، یمن، فلسطین، بلاد فارس، اور بغداد میں خوب پھولا پھلا، علامہ مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں لکھا ہے کہ مالکی مذہب کو

مصر میں سب سے پہلے روشناس کرانے والے امام عبدالرحیم بن خالد بن یزید بن یحییٰ ہیں، ان کے بعد امام عبدالرحمٰن بن قاسم نے اس کی اشاعت کی، چونکہ مصر میں امام مالک کے تلامذہ رہتے تھے اس لیے وہاں فقہ مالکی کو خوب مقبولیت و شہرت ملی، نیز عثمان بن حکم نے اس کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جب معز بن بادلیس نے سلطنت قائم کی تو بلاد مغرب کے بڑے بڑے ارباب حکومت اور اہل اقتدار کو مالکی مسلک کا پیرو کار بنایا، جس سے اس کو مغرب میں خوب غلبہ حاصل ہوا، علامہ تقی الدین فاسی مکی متوفی ۸۳۲ھ نے العقد الثمین میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں اکثر اہل مغرب مالکیہ ہیں، اندلس میں ابتداءً امام اوزاعی کا فقہی مسلک رائج تھا، اس کو سب سے پہلے صعصعہ بن سلام نے اندلس میں داخل کیا، لیکن دوسری صدی کے بعد یہ مسلک وہاں سے ختم ہوگیا، اور اس کی جگہ فقہ مالکی نے لے لی، جب امام مالک کے تلامذہ زیاد بن عبدالرحمٰن، غازی بن قیس، یحییٰ بن یحییٰ، قرعوس وغیرہ مدینہ منورہ سے اندلس واپس آئے تو انھوں نے اوزاعی مسلک کی جگہ مالکی مسلک کی نشر و اشاعت کی، نیز امیر ہشام بن عبدالرحمٰن نے لوگوں کو اس مسلک کی پیروی کا حکم دیا امام یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر کی مساعی نے بھی اندلس میں اس کی ترویج کی، امام یحییٰ بن یحییٰ کو خلیفہ ہشام بن عبدالرحمٰن بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور اندلس میں عہدۂ قضاء کے لیے وہ جس عالم کی نشاندہی کرتے اسی کو قاضی بناتا تھا، نیز دوسرے سرکاری عہدوں پر ان کے مشورہ سے مالکی مذہب کے پیرو ہی قابض ہوا کرتے تھے، اس وجہ سے اندلس میں فقہ مالکی کی خوب اشاعت ہوئی۔

علامہ مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی میں مالکی مذہب عراق، اہواز، بلادِ مغرب اور افریقہ میں خوب مروج تھا اور اندلس پر تو اس کا غلبہ ہی تھا۔

مسلک شافعی اہل سنت کا تیسرا فقہی مسلک شافعی ہے، اس کی نسبت امام محمد بن ادریس شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ کی طرف ہے، اس کی ابتداء مصر میں ہوئی، امام شافعی کے اکثر تلامذہ مصری

ہیں، اس کے بعد عراق میں اس کو فروغ ہوا، اور تیسری صدی میں حجاز، بغداد، خراسان، توران،
شام، یمن، ماوراء النہر، فارس، ہندوستان، افریقہ اور اندلس تک پہنچ گیا۔ ان تمام مقامات
میں کہیں شافعی مسلک کو غلبہ ہوا اور کہیں دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کا بھی رواج رہا،
مصر میں پہلے حنفیہ اور مالکیہ کا غلبہ تھا، مگر امام شافعی وہاں تشریف لے گئے تو ان کا مسلک
خوب پھیلا، عراق، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ میں یہ مسلک یوں آگے بڑھا کہ افتاء اور
تدریس میں حنفیہ کے ساتھ برابر کی ٹکر لی، اور دونوں میں بڑے بڑے مناظرے اور معرکے ہوئے
ایک نے دوسرے کی رد میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، شام میں پہلے وہیں کی فقہ اوزاعی
کا رواج تھا، لیکن جب امام ابوزرعہ محمد بن عثمان دمشقیؒ مصر کی قضاء کے بعد دمشق کے
قاضی بنائے گئے تو وہ اپنے ساتھ امام شافعی کا مسلک بھی لے گئے، اور اس کو پھیلایا، اس کے
بعد دمشق کے دوسرے قضاۃ نے بھی اسی مسلک کی پیروی کی، قاضی ابوزرعہ دمشقی کا قاعدہ
تھا کہ جو عالم فقہ شافعی کی مشہور کتاب "المختصر للمزنی" کو زبانی یاد کر لیتا تھا اسے
ایک دینار انعام دیتے تھے، علامہ مقدسی نے لکھا ہے کہ چوتھی صدی میں اہل شام فقہ شافعی
پر عمل کرتے تھے، وہاں کوئی شخص مالکی یا کسی اور مسلک کا نظر نہیں آتا تھا۔

علامہ سبکیؒ نے "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" میں لکھا ہے کہ ماوراء النہر میں مذہب شافعی
قفال مروزی شاشیؒ کی بدولت شافعی مسلک پھیلا، مقدسیؒ کے بیان کے مطابق شام مشرق
کے بڑے بڑے شہروں مثلاً کورہ شاش، ایلاق، طوس، ابی ورد، اور نسا وغیرہ میں شافعی مذہب
غالب تھا، نیز ہرات، سجستان، سرخس، نیشاپور، اور مرو میں یہ مسلک پایا جاتا تھا، امام سخاوی
نے "الاعلان بالتوبیخ" میں لکھا ہے کہ مرو اور خراسان میں احمد بن سیارؒ نے شافعی
مذہب کو عام کیا، ان کے بعد حافظ عبدان بن محمد ابن عیسیٰ مروزیؒ نے اس کی اشاعت کی
اور اسفرائن میں امام شافعی کے مسلک اور ان کی کتابوں کو سب سے پہلے ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق
نیشاپوریؒ نے داخل کیا۔

بغداد میں فقہ حنفی کا غلبہ تھا پھر امام شافعی نے وہاں جاکر اپنے مسلک کی ترویج فرمائی،
امام صاحب کے قدیم شاگرد حسن بن محمد زعفرانیؒ متوفی ۲۶۰ھ نے بھی بغداد میں اس مسلک کو
پھیلایا، علامہ سبکیؒ نے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں بیان کیا ہے کہ عرب کے صوبہ تہامہ میں
خاندان ابی عقامہ کے ذریعہ یہ مسلک رائج ہوا، اندلس میں مالکی مذہب کے علاوہ اور کوئی
مذہب رائج نہیں تھا، حتیٰ کہ وہاں کے لوگ کسی حنفی یا شافعی کو پاتے تو نکال دیتے تھے،
علامہ ابن اثیرؒ کے بیان کے مطابق افریقہ میں سلطان یعقوب بن یوسف بن عبدالمومن نے اپنے
آخری دورِ حکومت میں شافعیت کی طرف میلان ظاہر کیا، اور شوافع کو قاضی بنایا،

حنبلی مسلک | اس مسلک کی نسبت امام احمد بن محمد بن حنبل شیبانیؒ متوفی ۲۴۱ھ کی
طرف [illegible] کا مرکز بغداد ہے۔ یہ اہل سنت کا چوتھا فقہی مسلک ہے، اس کی اشاعت
[illegible] ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حنبلی فقہ
[illegible] کا مدار زیادہ تر احادیث واخبار پر ہے، اکثر حنابلہ شام اور
[illegible] یہ لوگ احادیث وسنن کی روایت میں سب سے آگے ہیں، علامہ ابن
[illegible] احمد کا مذہب بغداد سے نکل کر شام کے اکثر شہروں میں
[illegible] کے بعد ظاہر ہوا، امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حنبلی مسلک چوتھی
[illegible] کی حدود سے باہر آیا جب کہ مصر وافریقہ پر عبیدیوں کا قبضہ تھا،
[illegible] تھے، انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں علمائے اہل سنت کو قتل وغارت
[illegible] پوری حدود سلطنت سے ختم کر دیا تھا، اور رفض وشیعیت کو رواج
[illegible] مقدسیؒ صاحب العمدہ نے سب سے پہلے مصر میں حنبلی مسلک کو پہنچایا اور
[illegible] مقدسی بشاری نے لکھا ہے کہ چوتھی صدی میں یہ مذہب بصرہ، اقور، دیلم
[illegible] خوزستان وغیرہ میں موجود تھا، اس زمانہ میں بغداد پر حنبلیت اور شیعیت کو
[illegible] ہوا، علامہ ابن اثیر نے تاریخ الکامل میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ

اس زمانہ میں بغداد میں حنابلہ کو بڑی شوکت حاصل ہوئی۔ یہ لوگ امراء کے مکانات پر دھاوا بول کر نبیذ وغیرہ پاتے تو گرا دیتے، مغنیہ کو پاتے تو مارتے اور باجے اور دیگر سامان لہو و لعب توڑ کر پھینک دیتے اور منکرات یا تغیر شدت اختیار کرتے کہ اہل بغداد پریشان ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے شہر بغداد میں اعلان ہوگیا کہ دو حنبلی ایک جگہ جمع نہ ہوں، اور نہ اپنے مسلک کے بارے میں گفتگو کریں، حنبلی مذہب کا کامل غلبہ بلاد نجد کے علاوہ اور کہیں سننے میں نہیں آیا، فتنۂ خلق قرآن میں امام احمد کے ابتلاء، اور عباسی خلفاء و امراء اور معتزلہ کی مخالفانہ سرگرمی سے اس مسلک کی راہ میں رکاوٹ ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں مذاہب اربعہ کے پیرو | موجودہ زمانہ میں ان چاروں مذاہب کے ماننے والے کہاں کتنے ہیں، اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے، البتہ مغرب اقصیٰ، تیونس، طرابلس، الجزائر اور کئی افریقی ممالک میں مالکی مسلک غالب ہے، ان علاقوں میں احناف بھی ہیں جو ترک کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور سلاطین ترکی کے زمانہ میں یہاں آباد ہوگئے، اس لیے قلت کے باوجود حنفیت کو عروج حاصل ہے، مصر میں شافعی اور مالکی مسلک رائج ہے، صعید اور سوڈان میں مالکیہ ہیں، احناف بھی بکثرت ہیں، حکومت کا مذہب حنفی ہے، کچھ حنبلی بھی ہیں،

شام کے مسلمان آدھے حنفی، ایک چوتھائی شافعی اور ایک چوتھائی حنبلی ہیں، فلسطین میں شوافع کا غلبہ ہے، مالکی اور حنفی بھی ہیں، عراق میں حنفی مسلک کو عروج ہے، شافعی، مالکی اور حنبلی بھی ہیں، ترکی، البانیہ، بلقان میں احناف کو غلبہ حاصل ہے، کردستان اور آرمینیہ پر شوافع کا اثر و رسوخ ہے، فارس کے اہل سنت میں شوافع زیادہ ہیں، کچھ احناف بھی ہیں، افغانستان میں حنفی غالب ہیں، کچھ شافعی اور حنبلی بھی ہیں، ترکستانات غربی جس میں خیوہ (خوازرم) بخارا، تاشقند، ازبکستان، ترکمانیہ، قرغیزیہ، قزاقستان، آذربیجان وغیرہ شامل ہیں، ان میں حنفی ہیں اور ترکستانات شرقی (سنکیانگ) میں بھی حنفی ہیں ساتھ ہی کچھ شافعی ہیں، بلاد قوقاز میں احناف کو غلبہ حاصل ہے، کچھ شوافع بھی ہیں، ہندوستان میں قدیم زمانہ میں شوافع زیادہ تھے، سندھ

میں ان کی اکثریت تھی، مغربی سواحل پر قدیم زمانہ سے عربی النسل مسلمان آباد تھے، ان کا مسلک شافعی تھا، کوکن، مدراس اور مالابار میں اب بھی شوافع بکثرت آباد ہیں، اس زمانہ میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں حنفی مسلک رائج ہے، جزیرہ مالدیپ کے ۹۲ ہزار مسلمان کل کے کل شافعی ہیں، پہلے یہاں مالکی مذہب تھا، سیلون (سری لنکا) جاوا، سماترا، جزائر مشرق الہند اور جزائر فلپائن میں شوافع زیادہ ہیں، سیام (تھائی لینڈ) کے مسلمان زیادہ تر شافعی ہیں، کچھ حنفی ہیں، ہند چینی، اور آسٹریلیا کے مسلمان زیادہ تر شافعی ہیں، امریکہ کے علاقہ برازیل میں ۴۵ ہزار حنفی مسلمان آباد ہیں، نیز امریکہ کے دوسرے علاقوں میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان ہیں جو مختلف مسلک کے پیرو ہیں۔

حجاز میں شافعی اور حنبلی غالب ہیں، دیہاتوں میں احناف کے ساتھ مالکیہ بھی ہیں، اہل نجد حنبلی ہیں، اہل عسیر شافعی نیز یمن، حضرموت اور عدن کے اہل سنت شافعی ہیں، عدن میں احناف بھی ہیں، عمان پر فرقہ اباضیہ (خوارج) کا غلبہ ہے اسی کے ساتھ وہاں حنبلی اور شافعی بھی ہیں، قطر اور بحرین میں مالکی مسلک عام ہے، اسی کے ساتھ وہاں نجد کے حنابلہ بھی ہیں، احسار کے اہل سنت میں حنبلی اور مالکی غالب ہیں، کویت پر مالکیہ کا اثر زیادہ ہے۔

موجودہ دور میں مذاہب اربعہ کے بارے میں یہ معلومات تقریباً پچاس سال پہلے سے تعلق رکھتی ہیں، اس کے بعد یورپ، امریکہ، افریقہ میں خاص طور سے مسلمانوں کی بڑی تعداد وجود میں آگئی ہے جو مختلف مکاتب فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

جنگِ آزادی کا مجاہد
(مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی)

از جناب ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی۔

(۲)

اس بار یہ کام مولوی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تاریکی روشنی میں بدلنے لگی تھی۔ محب وطن مولوی کی شخصیت اور اس کی جادو بیانی نے انقلابیوں کے دلوں میں عمل کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ساتھیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ اب بھی انگریزوں سے بھگایا جا سکتا تھا اس فرصت کا احساس بھی پیدا ہو گیا تھا کہ مہم کو سر کرنے کے لیے اعتماد اور اتحاد سے کام کرنا ضروری ہے۔ مولوی نے دوسری طرف دربار کو یاد دلایا کہ فوج میں ضروری تنظیم موجود ہے۔ پھر بھی وہ ناعاقبت اندیش دیوانیوں کا شکار رہے بغیر نہ رہے، دربار میں کچھ نا اہل لوگ ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر جلنے لگے تھے۔ انھوں نے سازش کر کے مولوی کو گرفتار کرا دیا۔ مگر مولوی کا عوام میں حضرت محل سے کہیں زیادہ تھا اور خصوصاً دہلی سے آئی ہوئی افواج تو ان کے حکم کو حرفِ آخر سمجھتی تھیں آخر کار کچھ خیر سگال لوگوں نے حضرت محل پر زور ڈال کر مولوی کو آزاد کرا دیا۔ جلد ہی ان کے اثر و رسوخ پہلے کی طرح ہو گئے۔

مولوی احمد اللہ سے آئندہ مہم کے لیے فوجی طاقت کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا "کامیابی کا زرّیں موقع نکل چکا ہے۔ اب حالات کافی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ ہم کو محض اس لیے لڑنا ہے کہ یہ ہمارا اولین فرض ہو گیا ہے۔"

ہمیشہ کی طرح اب بھی مولوی کے خلوص اور جذبۂ ایثار کا عوام میں گہرا اثر تھا۔ اس سے فائدہ

اشمار کر انھوں نے افواج کی باہمی چپقلشوں کو بہ سہولت حل کرا دیا۔ پھر سپاہ میں ملک کی آزادی کا جذبہ کچھ اس طرح ابھارا کہ سپاہی دروازہ پر کھڑے ہوئے دشمن کے مقابلہ کو فوراً تیار ہو گئے۔

اس مردِ میدان نے صرف یہاں تک ہی بس نہ کی۔ وہ میدانِ جنگ میں بنفسِ نفیس سپاہیوں کے دوش بدوش رہ کر لڑتے جس سے ان میں حوصلہ۔ اعتماد اور جانبازی کے جذبات کی پرورش ہوئی۔

جب بھی ہندوستانی عالم باغ پر دھاوا بولتے مولوی کی جگہ ہمیشہ پیش رو دستہ کے ساتھ ہوتی۔ ۲۲ دسمبر کو مولوی نے ایک منصوبہ بنایا تاکہ عالم باغ کی انگریزوں کی فوج کو دھوکا دے کر گھیرا جائے۔ انگریزوں کی مورچہ بندی کے سامنے سے وہ کترا کر راستہ بدلتے ہوئے کانپور کی سڑک پر ہو لیے، اور باقی ماندہ فوجی دستوں کو جو عالم باغ پر تعینات تھے یہ بتلا گئے کہ ان کو انگریزوں پر سامنے سے حملہ کرنا چاہیے مگر اس وقت جب خود ان کا دستہ انگریزوں کے عقب میں پہنچ جائے۔ فوجی اعتبار سے یہ منصوبہ بہت مکمل تھا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ عالم باغ کے انقلابی سپاہی نظم و نسق قائم نہ کر سکے اور حملہ کے مقررہ وقت سے پہلے ہی بیٹھ رکھا گئے۔ انقلابیوں کو شکست ہوئی اور مولوی کی ترکیب رائگاں گئی۔

اس قسم کی رکاوٹوں کے باوجود مولوی احمد شاہ کے پائے استقامت میں کبھی کمزوری نہ آئی۔ ۱۵ جنوری کو خبر ملی کہ انگریزوں کی فوج کانپور سے نکل چکی ہے اور لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی ہے، یہ فوج عالم باغ کی انگریز فوج کے لیے رسد لا رہی تھی، انقلابی کیمپ میں اس امر پر غور و فکر ہوا کہ اس مدد کو منزل پر پہنچنے سے کس طرح روکا جائے۔ بات ہوتی رہی مگر کوئی طریقۂ کار طے نہ کیا جا سکا۔ ساتھیوں کی اس بزدلی اور بے اثری سے عاجز آ کر مولوی نے باآواز بلند اعلان کیا۔ " واللہ میں انگریز فوجوں کو چیر کر لکھنؤ میں داخل ہوں گا،

اور آنے والے غنیم کا مددگار دستہ میری حراست میں ہوگا۔" اس اعلان کے بعد خاموشی اور رازداری سے وہ فوج کا ایک دستہ لے کر کانپور کی طرف چل دیے۔

آوٹرم کو اس اقدام کی ہندوستانی مخبروں کے ذریعہ اطلاع مل چکی تھی اور اس نے ایک اپنا فوجی دستہ مولوی پر حملہ کرنے روانہ کر دیا تھا۔ مقابلہ ہوا۔ سپاہ کی ہمت بڑھانے کے لیے مولوی برابر صف اول میں شریک جنگ رہا۔ مقابلہ میں اس کے شانہ پر گولی لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ انگریزوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ کافی دنوں سے وہ مولوی کو گرفتار کرنے کے آرزومند تھے اور انھیں یقین تھا کہ آج وہ دن آگیا ہے۔ مگر انقلابیوں نے بے حد ہوشیاری سے مولوی کو ڈولی میں چھپا کر لکھنؤ پہنچا دیا۔ شہر میں مولوی کے زخمی ہونے کی خبر بجلی کی طرح کوند گئی ہر حریت پسند دل گرفتہ نظر آنے لگا۔ تاہم لوگوں کا جذبہ یہ تھا کہ مولوی کی عظمت کے اعتراف کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ وقت ضائع کیے بغیر ان کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ فوراً ایک بہادر برہمن دیدیہی ہنومان کی کمان میں ایک فوج روانہ ہوئی اور انگریز فوج پر جا پڑی۔ یہ بہادر کمانڈر صبح دس بجے سے شام کے چھ بجے تک اپنی بہادری کے کرشمے دکھاتا رہا جب یہ مہلک طور پر زخمی ہو کر گرا اور گرفتار ہو گیا، انقلابی فوج ہزیمت خوردہ اور پریشان حال لوٹی۔

ابھی مولوی احمد شاہ کا زخم پوری طرح بھر بھی نہ پایا تھا کہ ۵ر فروری کو وہ پھر جنگ میں شریک ہو گئے۔ اُن کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز تھی کہ سر کالن کے پہنچنے سے پہلے پہلے اوٹرم کا کیوں کر تیا پانچہ کیا جائے۔ مشکل یہ تھی کہ دن بدن سپاہی دل چھوڑتے جا رہے تھے۔ اور جگہ جگہ لڑائی میں ہار رہے تھے۔ پھر بھی وہ ناکامی کے باوجود لڑ رہے تھے۔ ان حالات میں بھی مولوی کے قدم بغیر لغزش کے اٹھ رہے تھے۔ مورخ ہومس (Holmes) اس مرد میدان کی شجاعت و استقامت کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے

ان کا لیڈر احمد شاہ اس ... کی اکثریت ... شکار ہو چکی تھی ... ہمت ... تو انا ... کسی کی جامعانہ منصوبہ ...

مصیبتوں سے عمل پیرا ہونے کی اب بھی صلاحیت رکھتا تھا اور بڑی سے بڑی فوج کی قیادت سے عاری نہ تھا۔"

انقلابیوں کی ساٹھویں رجمنٹ کے صوبہ دار نے اس عہد کا اظہار کیا کہ ایک ہی مقابلہ میں وہ انگریزوں کا لکھنؤ سے صفایا کر دے گا۔ خود بیگم حضرت محل اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ میدان میں اتر آئی تھیں۔ مگر پھر بھی بدنصیب لکھنؤ آزادی سے محروم رہا۔

آخری معرکے اور سپہ گری کی شہادت
ویر ساورکر کی کتاب کے تیسرے
حصہ، نویں باب سے اقتباسات

لکھنؤ کی شکست کے بعد پورے روہیلکھنڈ اور اودھ کی سرزمین پر کوئی ایک ایسا محفوظ گڑھ نہ رہ گیا تھا جہاں مجاہدین کی طاقت کو یک جا کیا جاتا۔ برطانوی فتح کے سیلاب کے ریلے میں جہار اور دوآب تو پہلے ہی غرق ہو چکے تھے۔ ان صوبوں سے دھکیل کر انقلابی عسکریت کو اودھ اور روہیلکھنڈ کے مختصر سے مختصر دائرہ میں گھیرا جا رہا تھا۔ قلعہ بندی کی کوئی صورت باقی نہ تھی جو مدافعت کے لیے انقلابی کہیں پیر جما سکتے۔ اوپر سے غنیم کی فوجوں کا چار سمت سے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس بنا پر انقلابیوں کو مجبور ہو جانا پڑا کہ وہ دو بدو جنگی کارروائیوں کو ترک کریں اور گوریلا حملوں کا طریقہ اختیار کریں۔ اگر شروع ہی سے وہ یہ راستہ اپنا لیتے تو کامیابی کے امکانات کئی گونہ بڑھ سکتے تھے۔ پھر بھی دیر آید درست آید کے مقولہ کے مطابق اب یہ طریق عمل اختیار کرنا پڑا۔ تاہم اب یہ بات کچھ پوشیدہ نہ رہ گئی تھی کہ فتح حاصل کرنا مشکل تھا۔ پھر بھی انقلابیوں کے کیمپ میں حالات کی نزاکت کا اندازہ ہونے کے باوجود شکستہ خاطری کے اثرات نظر نہ آتے تھے۔ بظاہر ابھی ان کے ہتھیار رکھ دینے یا محاذ کو چھوڑ بھاگنے کا کوئی امکان نہ تھا اس لیے اودھ اور روہیلکھنڈ کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آزادی کی جنگ کو گوریلا حملوں کے ذریعہ جاری رکھا جائے گا۔ لہٰذا فوجوں کو ہر جگہ یہ احکامات پہنچا دیے گئے کہ وہ انگریزوں کی افواج سے بالمقابل معرکہ آرائی سے گریز کریں کیونکہ ان کی عسکری تنظیم بہتر، بہ مضبوط تر تھی اور ان کے پاس توپوں کی بہتات تھی۔ انقلابیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ پوشیدہ رہ کر دشمن کے [illegible]

دریاؤں کے پایاب ساحلوں کی حفاظت کریں۔ ان کے لیے وسائل کو درہم برہم کرتے رہیں جن سے رابطہ قائم رکھنے اور رسد پہنچانے کی تنظیم مراد ہو مزید برآں جہاں تک اہم خطرات کے بغیر ممکن ہو ان کی چھاؤنیوں کی نگہداشت کا کام کرتے رہیں۔ اس طرح مدمقابل کی مہمات کو زیادہ سے زیادہ پرصعوبت بنانا مقصود تھا۔

مولوی احمد شاہ نے فوری طور پر ان احکامات کی تعمیل کا اہتمام شروع کر دیا۔ انگریزوں کے لکھنؤ کیمپ پر کڑی نگرانی کے لیے انھوں نے اپنا کیمپ باری کے مقام پہ قائم کیا۔ یہ جگہ انگریزوں کے پڑاؤ سے ۲۹ میل کے فاصلہ پر تھی، پاس ہی چھ ہزار فوج کے ساتھ بیگم حضرت محل کا پڑاؤ بیتاؤلی پر تھا۔ اس کارروائی کی اطلاع پاکر ان دونوں انقلابی اڈوں کو تہس نہس کرنے کی غرض سے ہوپ گرانٹ لکھنؤ سے چلا۔ اس کے ساتھ تین ہزار بہترین تربیت یافتہ سپاہی اور ایک مضبوط توپ خانہ تھا۔ اُس نے پہلے باری کی طرف رُخ کیا۔ اس سلسلہ میں اگلے ہی دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس سے انقلابی اسکاؤٹوں کی بہادری اور پختہ کاری کا ثبوت ملتا ہے۔ مولوی نے اپنے چند اسکاؤٹوں کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوج کے نقل و حرکت کے بارہ میں صحیح حالات کا پتہ چلائیں۔ یہ اسکاؤٹ رات میں خاص برطانوی کیمپ کے اندر داخل ہوئے۔ انگریز پہرہ دار نے ان کو چیلنج کیا "کون جاتا ہے؟" بے پرواہی سے جواب ملا "ہم ہیں بارھویں رجمنٹ کے لوگ" یہ جواب ایک طرح لفظ بلفظ صحیح بھی تھا کیوں کہ یہ لوگ اسی رجمنٹ کے باغی سپاہی تھے۔ پہرہ دار کو ان تفصیلات کا ہوش کہاں تھا۔ ان لوگوں کے بے پروا بے قدموں کی آواز۔ صاف اور سادہ برتاؤ اور بے دھڑک جواب نے گارڈ کے شبہات رفع کر دیے اور اس نے یہی کہا "تو ٹھیک ہے" اس طرح یہ ننھی جماعت انگریزوں کے کیمپ میں داخل ہوکر بہ سہولت ضروری معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور صبح ہوتے اپنے آقا کے سامنے مکمل رپورٹ پیش کر سکی۔

انگریزوں کے ارادوں سے آگاہی حاصل ہو جانے پر مولوی نے اپنا لائحہ عمل طے کیا۔ مختصر

پیدل دستے کے ساتھ مولوی تو اس گاؤں میں ٹھہریں گے اور سواروں کا رسالہ چھپ کر آگے بڑھ جائے گا اور جب غنیم کا پیش رو دستہ مولوی کے قریب پہنچ جائے گا تو یہ گھوم کر برابر یا پیچھے سے حملہ آور ہوگا۔ انگریز وقائع نگار مالیسن لکھتا ہے کہ "یہ فیصلہ مولوی کی ذہانت اور فوجی سوجھ بوجھ کا بین ثبوت ہے اور ان کے فن حرب کی مہارت کی بہترین مثال ہے۔"

تاہم اس زرّیں منصوبہ کی کامیابی کے لیے دو اہم شرائط تھیں۔ اول یہ کہ گاؤں میں مولوی کی فوج کی موجودگی راز میں رہے۔ دوسرے یہ کہ گھوڑے سوار دستہ جس کو دشمن پر پیچھے یا برابر سے وار کرنا تھا وقت سے پہلے اپنی نقل و حرکت کو پوشیدہ رکھے۔ ورنہ دشمن قبل از وقت چوکنا ہو سکتا تھا۔ مولوی کا جہاں تک تعلق تھا ان کا انتظام مکمل تھا۔ انھوں نے رات ہی سے گھوڑے سوار دستہ کو طے شدہ راستہ پر روانہ کر دیا تھا۔ خود انھوں نے گاؤں کو مکمل طور پر قبضہ میں کر لیا تھا اور اپنی فوج کو پوشیدہ کمین گاہوں پر تعینات کر دیا تھا۔ یہ سب کام اتنے رازدارانہ طور پر کیے گئے کہ اگلے دن صبح ہوتے ہی برطانوی جنرل کسی ادنیٰ شبہ کے بغیر دریا کے کنارے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ بس اب صرف آدھے گھنٹہ میں وہ مولوی کے جال میں پھنسا چاہتا تھا جب اس کی تباہی یقینی تھی مگر اسی آدھے گھنٹہ کے بیچ مولوی کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اور اس ناکامی کا ذمہ دار گھوڑے سواروں کا دستہ تھا۔ جب یہ دستہ مناسب مقام پر کھڑا تھا جہاں سے انگریزوں کی گذرتی ہوئی فوج متعینہ وقت پر پوری زد میں آسکتی تھی۔ کمانڈر نے دیکھا کہ غنیم کی چند توپیں بغیر حفاظت کے اُن کے سامنے رُکی ہوئی ہیں۔ یہ مولوی کی ہدایت کی نزاکت کو فراموش کر کے اس کے مال غنیمت کی طرف بڑھ گیا اور توپوں کو قبضہ میں کر لیا۔ انگریزوں نے اپنی توپیں تو جلد ہی واپس لے لیں مگر اپنے خطرہ کا بھی پورا اندازہ کر لیا۔ بہرحال ہلکے سے تصادم کے بعد انقلابیوں کی فوج کو گاؤں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

پہلی اپریل ۱۸۵۸ء تک گوروں کی فوج کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۹۶ ہزار تک جا پہنچی تھی۔ مزید برآں انگریزوں کی ساتھی سکھوں کی وفادار فوج بھی کافی تھی۔ جیساکہ پہلے بتلایا جا چکا ہے ہوپ گرانٹ بڑی تعداد میں فوج لے کر باڑی اور بتولی کی طرف مارچ کر رہا تھا۔ والپول کو حکم دیا جا چکا تھا کہ وہ جمنا کے شمال میں پہنچ جائے۔ اس طرح یہ فوجیں اور خود کمانڈران چیف کے زیر کمان فوج ایک ساتھ بڑھ رہی تھیں تاکہ انقلابیوں کے آخری سپاہی کو شمال کی جانب دھکیل کر روہیلکھنڈ میں پہنچا دیں اور وہاں ان سب کو گھیر کر ایک ہی مقام پر ختم کر ڈالیں۔ اسی اسکیم کے مطابق والپول روئیا (Ruiya) تک آچکا تھا اور وہاں کے قلعہ پر زور آزما رہا تھا۔ یہ جگہ لکھنؤ سے کل ۵۱ میل پر تھی۔ اس قلعہ کا مالک نرپت سنگھ معمولی سا جاگیردار تھا۔ اس کی حفاظتی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس قدر ہو سکا اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ لڑائی میں والپول کا مددگار جنرل ہوپ مارا گیا جس کو انگلستان میں نقصانِ عظیم کا درجہ دیا گیا۔ بہرحال نرپت سنگھ انگریزوں کی مضبوط فوج کے سامنے اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ اپنی مٹھی بھر فوج کی جان بچانے کے لیے قلعہ چھوڑ کر چل دیا۔

یہ ایک مثال تھی کہ کس طرح انگریزوں نے نئی دلی کے ساتھ بڑی بڑی فوجی ڈویژنوں کو تقریباً نہتے انقلابیوں پر استعمال کر کے ان کو اودھ کے گوشے گوشے سے نکال باہر کیا، وطن کے یہ بچھڑے ہوئے سپاہی پناہ کے لیے ہر طرف سے روہیلکھنڈ میں داخل ہونے لگے۔ اپنے شکار کو ٹھیک نشانہ پر پا کر انگریز کمانڈران چیف نے فوج کی مختلف رجمنٹوں کو یکجا کیا اور روہیلکھنڈ کی طرف مارچ کر دیا۔

انقلابیوں کے سب لیڈر شاہجہاں پور میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں کانپور کے ناناصاحب اور مولوی فیض آبادی بھی تھے۔ یہ دونوں وہ تھے جنھوں نے اپنی انقلابی کارروائیوں سے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ وہ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تنگ آچکے تھے مگر یہ دونوں ابھی تک اسی طرح چست اور تازہ دم معلوم ہوتے تھے۔ کئی بار انگریزوں کے چنگل میں آتے آتے حیرت انگیز

علیحدہ ہو کر نکل بھاگے تھے۔ اس بار جب سر کالن کو یہ خبر ملی کہ دونوں ناقابلِ تسخیر رہنما پھر اس کی زد میں ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں اور شاید اس کی آمد سے بے خبر ہیں تو اس نے شہر کو گھیر لینے کا منصوبہ بنایا۔ جب اس نے شہر کے محاصرہ کے انتظامات مکمل کر لیے تو معلوم ہوا کہ دونوں چڑیاں اڑ چکی ہیں۔ قدرتی طور پر سر کالن حیرت زدہ رہ گیا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ انقلابی رہنما اسی جانب سے فرار ہوئے تھے جہاں خود سر کالن اور اس کا دستہ حفاظتی گارڈ کا کام کر رہے تھے۔

شاہجہاں پور میں سر کالن اپنے ارادوں میں ناکام رہا۔ اب اس نے سوچا کہ تھوڑا آگے بڑھ کر بریلی کی خبر لی جائے۔ اس نے شاہجہاں پور میں چار توپوں کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو تعینات کیا اور خود بڑی تعداد میں فوج لے کر ایک دن کا سفر کر کے وہ ۴ مئی کو بریلی آ پہنچا۔ یہاں خان بہادر خاں روہیلہ کے مضبوط فوجی انتظام کے باعث ابھی تک انقلابیوں کا تسلط قائم تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے ہزیمت خوردہ انقلابی سب اس طرف بھاگے آ رہے تھے۔ دہلی کا بہادر شاہزادہ فیروز شاہ۔ شری مان نانا صاحب فرنویس۔ مولوی احمد شاہ۔ شری مان بالا صاحب بیگم حضرت محل۔ راجہ تیجا سنگھ اور دوسرے باغی رہنما روہیلکھنڈ میں داخل ہو کر اس کے پایۂ تخت بریلی میں پہنچ چکے تھے اب صرف یہی ایک جگہ تھی جہاں آزادی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ یہی وہ خاص وجہ بھی تھی کہ سر کالن اس شہر کے درپے تھا۔

ہندوستانی کیمپ میں ایسا کوئی منصوبہ نہ تھا اس شہر میں جنگ کا اہتمام کریں، آزادی کے رہنماؤں نے پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا اور اس کا اعلان بھی ہو چکا تھا کہ غنیم کے مقابلہ میں گوریلا طریقۂ جنگ استعمال کیا جائے گا۔ یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ شہر کو خالی کر کے مجاہدین روہیلکھنڈ میں پھیل جائیں گے۔ اس ضمن کی تیاریاں ہو رہی تھیں صرف آخری اقدام کا اعلان ہونا باقی تھا۔ مگر جب بہادر روہیلوں نے بدقماش فرنگیوں کی صورت دیکھی تو اکثریت نے شہر خالی کرنے سے انکار کر دیا اور تہیہ کیا کہ اس آخری موقع پر اپنے ملک اور مذہب کی خاطر

جانوں کی قربانی دیں گے۔

انگریز جنھوں نے شہر کا محاصرہ شروع کیا تھا عسکری اعتبار سے بہت مضبوط تھے مسلح توپ خانہ ساتھ تھا بڑی بڑی توپیں۔ تعداد اندازاً [illegible] جبکہ اردو دیسی [illegible] بہت [illegible] سوار تھے اپنے مدد [illegible] منظم اکثریت یافتہ دکھائی دیتے تھے [illegible] کی مدد [illegible] چیف [illegible] سے کم [illegible] افسر کے [illegible] اس سب نوک [illegible] و احتشام کے ساتھ خاں بہادر [illegible] اور [illegible] سے حیثیت [illegible] نتیجہ ۵ ستمبر کو جب تصادم ہوا تو انقلابیوں کی [illegible] کی تلواریں بجلی کے جوہر دکھانے میانوں سے باہر تھیں۔ ان تلواروں کو سنبھالے انسانوں کے ہاتھ نہ تھے بلکہ ان کا جذبۂ شہادت تھا جو ان کے مسکراتے چہروں کو موت کے آغوش میں لے جا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں نہ مغلوب ہونے والا ایمان تھا کہ ان کا مقصد عظیم اور مقدس ہے۔

تلواریں لیے وہ ایک بلائے ناگہانی کی طرح انگریز فوجوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان چند سر پھرے دیش کے سپاہیوں کے جانبازانہ حملہ سے، حیران اور پریشان برطانوی سپاہی ایک بار تو ان کے ریلے روندے ہی گئے۔ ۲۴ ہائی لینڈرز کی ٹکڑی نے اس طوفان کو روکنے کی ناکام کوشش کی مگر موت سے کھیلنے والے یہ جانباز آگے سے آگے بڑھتے گئے اور انگریزوں کی عقبی قطار تک جا پہنچے۔ پھر..... ان میں سے ایک بھی نہ لوٹا۔ سب لڑتے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔ وہ شیروں کی موت مرے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی ان میں سے کسی کے دل میں ہتھیار ڈالنے یا مورچہ چھوڑنے کا خیال نہ آیا تھا۔ ساتھیوں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک مجاہد بغیر زخم کھائے بھی گرا تھا۔ کیا یہ بزدلی تھی؟ اس کا جواب ابھی ملا جاتا ہے۔ لو! وہ انگریزی فوج کا کمانڈر اس مقام پر پہنچا چاہتا ہے جہاں یہ غازی مشتبہ حالات میں گرا تھا۔ یہ شخص ایک جست میں لاشوں کے بیچ میں سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمانڈر پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس وقت ایک وفادار سکھ سپاہی اس خطرہ کو دیکھ کر بیچ میں آ جاتا ہے اور خنجر کے ایک ہی

مادیں اس سپاہی کا سر تن سے جدا کر دیتا ہے۔ شہادت اور شجاعت کی چند لافانی داستانوں میں سے یہ وہ داستان ہے جس کی مثال اور سب پہ بھاری ہے (و یر سادر کرنے یہ واقعہ رسل کی ڈائری سے لیا ہے)

برطانوی فوج کی یہ کوشش کہ وہ باقی ماندہ مجاہدین اور ان کے رہناؤں کو گرفتار کرلیں۔ ایک بار پھر ناکام رہیں۔ خان بہادر خان کی سرکردگی میں یہ لوگ ۷ مئی ۱۸۵۸ء کو شہر خالی کر کے بریلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چند روز بعد، خان بہادر خان کے یوں جل دے کر نکل جانے پر سر کالن کیمبل گو افسردہ مگر بریلی فتح کر لینے پر مطمئن اور سر بلند، اپنے کیمپ کے بیچ میں کھڑا تھا کہ چاروں طرف سے ایک ہی آواز سنائی دی "مولوی" "مولوی" "پھر وہی مولوی" مولوی احمد شاہ کی سرگرمیوں کی خبریں برٹش کیمپ کے سپاہیوں میں پھر گشت لگانے لگی تھیں۔

اس وقت شاہجہاں پور میں مولوی ایک عجیب و غریب منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ بریلی سے کترا کر نانا صاحب اور مولوی نے شاہجہان پور کو محض لڑائی سے بچنے کے لیے چھوڑا تھا۔ نانا صاحب کے فرمان پر ساری سرکاری عمارتیں ڈھا دی گئی تھیں کیونکہ ان لیڈروں کی دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ انگریز کمانڈر بریلی کی طرف کوچ کرنے والا ہے اور وہ شاہجہاں پور کی حفاظت کے لیے کوئی مضبوط انتظام نہ کر پائے گا۔ اس لیے انھوں نے طے کر لیا تھا کہ جب وہ روانہ ہو جائے گا تو مولوی احمد شاہ گھوم کر واپس لوٹ آئیں گے اور شہر پر حملہ آور ہو کر انگریز فوج کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ اس طرح بریلی کی ہزیمت کا بدلہ لے لیا جائے گا۔

سارے اقدامات توقع کے مطابق سامنے آئے۔ انگریز دستہ بغیر معقول حفاظت کے شاہجہاں پور میں مقیم تھا۔ عمارت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کھلے میدان میں پڑا ہوا تھا۔ ۲۲ مئی کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مولوی احمد شاہ شاہجہان پور کی طرف بڑھے مگر افسروں کی

غلط تجویز پر شہر سے چار میل پرے سانس لینے کے لیے فوج کو روک لیا گیا۔
یہ چند ساعتوں کے لیے فوج کا راستہ میں سستانا ہی غضب ہو گیا۔ انگریزوں کے ہندوستانی جاسوس تاک میں تھے۔ انھوں نے بھانپ لیا اور ایک نے بھاگ کر کرنل ہیل کو شاہجہاں پور میں خطرہ سے آگاہ کر دیا۔ وہ چوکنا ہو گیا اور کھلے میدان ہی میں قلعہ بندی کی طرح مناسب انتظام کر لیا۔ مولوی کی فوج کا دباؤ بڑھتا آرہا تھا اور غنیم احتیاطی تدابیر مکمل کر چکا تھا۔ تاہم مولوی نے حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ بھی قبضہ میں لے لیا۔ پھر شہر کے متمول لوگوں پر فوج کے اخراجات کے لیے ٹیکس مقرر کیا جو جنگی قواعد کے مطابق تھا۔
سر کالن کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ خوش تھا۔ چند روز قبل وہ اپنے شکار کو پھانسنے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ اب قدرت نے دوسرا موقع بہم پہنچا دیا تھا، چنانچہ پوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ وہ تیزی سے مارچ کرتا ہوا ادھر روانہ ہوا تاکہ پھر سے شکار نشانہ سے نہ ہٹنے پائے۔ یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ اس بار مولوی کے لیے راہِ فرار مفقود تھی۔
۱۱ رمئی سے ۳ دن تک مقابلہ کی لڑائی ہوتی رہی۔ چاروں طرف سے انقلابی لیڈر اپنی اپنی سپاہ لے کر دوڑ پڑے تاکہ اس مقبولِ خاص و عام اور عظیم فدائے وطن ساتھی کو بچا سکیں۔ اودھیا کی بیگم متین صاحب۔ محمدی کا بادشاہ شاہزادہ فیروز شاہ۔ ناناصاحب فرنولیس۔ ۱۵ رمئی سے پہلے موقعِ واردات پر آچکے تھے۔ اور کیسے نہ آتے کہ شاہجہاں پور میں آزادی کا جھنڈا خطرہ میں تھا۔
فوجی طاقت میں اضافہ ہو جانے پر مولوی میں تازہ روح سرایت کر آئی تھی اور وہ شاہجہاں پور سے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں دشمنوں سے جنگی محاسبہ کرتا۔ انگریزوں کی وقتی سراسیمگی سے فائدہ اٹھاتا اور فوجی جال کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا جس میں اس کو پھانسنے کا انتظام تھا۔ وہ خطرہ سے نکل آیا تھا۔ اس مرتبہ سر کالن کو مولوی کو گرفتار کرنے اور انقلابی جماعت کی سرکوبی کا اس قدر یقین تھا کہ اس نے فوجوں کو منتشر کر دیا تھا۔ تشویش یہ تھی آخر مولوی کدھر گیا۔ اُدھر وہ اودھ میں داخل

ہوچکا تھا یعنی خاص اس صوبہ میں جہاں سے پوری ایک سال کی فوجی مہم کے بعد اور سخت جانی نقصانات برداشت کر کے اس سے گلو خلاصی حاصل ہوئی تھی۔ سرکالن نے اودھیا کو فتح کیا تو مولوی نے روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب سرکالن نے روہیلکھنڈ کو لیا تو مولوی پھر گھوم کر اودھ میں آدھمکتا ہے۔

برطانوی طاقت مولوی کو اپنے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتی تھی۔ اس کا سدباب بہرحال ضروری تھا۔ انگریزوں کی تلوار نے پہلے کبھی ہندوستان کے فسادات میں ایسی پسپائی نہ دیکھی تھی مگر وائے قسمت! جو کام انگریز کے لیے اب تک ممکن نہ ہوسکا تھا وہ خود ہندوستانیوں کی غداری نے پورا کر دکھایا۔

اودھ میں داخل ہونے کے بعد سے مولوی نے انگریز کے خلاف مدافعانہ کارروائیاں ... جاری کر دی تھیں۔ اس میں یہ کوششیں بھی شامل تھیں کہ قریب کے بااثر ہندوستانیوں ... آزادی کی جہد میں عملاً شامل کر لیا جائے تاکہ مستقبل کی دشمن کی جارحانہ سرگرمیوں پر قابو پایا جاسکے۔ اس غرض سے مولوی نے اسی نواح میں پوویں کے راجہ سے بھی رجوع کیا یہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر اس وقت مختصر سی اعانت مل جانا بھی غنیمت معلوم ہوتا تھا۔

چنانچہ بیگم حضرت محل کی طرف سے اس مضمون کا ایک سربمہر مراسلہ اس راجہ کے پاس بھیجا گیا۔ مکتوب الیہ شرکتِ جنگ کی دعوت دیکھ کر ہی خوفزدہ ہوگیا۔ بزدل ہونے کے ساتھ وہ غداری کے کمینہ جذبہ سے بھی عاری نہ تھا۔ جواب میں اس نے لکھا کہ تفصیلی گفتگو کے لیے مولوی سے ملاقات ضروری تھی۔ مولوی کو کیا تامل ہوسکتا تھا وہ راجہ سے ملاقات کے لیے پوویں جا پہنچے، مگر ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قلعہ کے سب دروازے بند تھے اور قلعہ کی دیواروں پر حفاظت کے واسطے مسلح سپاہی تعینات تھے۔ مولوی نے ہاتھی کے مہنت سے دروازہ کے قریب چلنے کو کہا تاکہ داخلہ کی کوشش کی جائے اسی دوران میں راجہ کے بھائی نے ان پر بندوق داغ دی۔ اور مولوی احمداللہ شاہ کو اس غدار کے ہاتھ سے شہادت نصیب ہوئی۔

اس اقدام پر راجہ اور اس کا بھائی فوراً باہر نکل آئے اور ان میں سے ایک نے مولوی کی مردہ لاش کا سر تن سے جدا کر دیا پھر سر کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر دونوں اپنے اس تحفہ کو انگریزوں کے ایک قریبی تھانہ میں لے گئے اور جب اس کو کپڑے سے کھولا اور اپنی وفاداری کی نشانی کو آگے بڑھانے لگے تو حبِّ وطن کا یہ انمول خزینہ انگریز افسروں کے پیروں میں لڑھکتا ہوا اب بھی اس میں سے خون جاری تھا۔ اس سر کو کوتوالی میں نمایاں جگہ پہ آویزاں کر دیا گیا۔ یہ ایسے دشمن کا سر تھا جو انگریزوں کے خلاف غیر معمولی بہادری اور جانبازی سے لڑا تھا۔ پوون کے راجہ کو اس کی غداری کے عوض پچاس ہزار روپیہ کا اعلان کردہ انعام ضرور ملا۔

جوں ہی اس موت کی اطلاع انگلستان پہنچی وہاں گھی کے چراغ جل گئے۔ انگریزوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ عام ردّ عمل یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے برطانوی دشمنوں میں سے ایک ناقابل تسخیر دشمن کیفر کردار کو پہنچا۔ جسمانی طور پر مولوی احمد اللہ شاہ دراز قد انسان تھے۔ چھریا بدن مگر مضبوط سراپا رکھتے تھے۔ بڑی اور گہری روشن آنکھیں تھیں۔ ہلالی بھنویں، ستواں ناک ان کے چہرہ کو پُر وقار بناتی تھیں۔ اس شجیع مسلمان کی زندگی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اسلامی عقائد اور ایمان باللہ کا جذبہ کسی طرح حبّ وطن کے منافی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ سچا ایمان رکھنے والا مسلمان ملکی فلاح و بہبود پہ جان دینا بھی عین ایمان اور وجہ فخر و مباہات تصور کرتا ہے۔ انگریز مؤرخ مالیسن نے بھی مرحوم کی مجاہدانہ حیات اور موت پہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"مولوی ایک غیر معمولی انسان تھا۔ ان کے اعلیٰ جنگی کارنامے جو جنگ بغاوت میں ظہور میں آئے ان کی عظمت کا ثبوت ہیں۔ ایسا دوسرا شخص کون تھا جس نے انگریز کمانڈر ان چیف جیسے عظیم المرتبت سر کالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں دو بار ناکام کیا ہو۔ اگر ایسے شخص کو فدائے وطن کہا جا سکتا ہے جو اپنے ملک کے غلام بنائے جانے کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے سازشوں اور جنگ میں نمایاں حصہ لیتا ہے تو یقیناً مولوی ایسا ہی مجاہد تھا۔ بے رحم

[illegible] سے اس کی ہمت کبھی کم نہ ہوئی۔ وہ مردانہ وار لڑا اور آزادی کے عظیم مقصد کے حصول [illegible] اس نے اپنا سر بھی پیش کر دیا۔ اس کی ذات اور کارناموں کو جو عزت واحترام ملنا چاہیے جو بہادروں کو بغیر تفریقِ مذہب وملت دیا جاتا ہے۔"

پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان

سعید احمد اکبر آبادی

(۴)

جب یہ ہنگامۂ ناؤ نوش ختم ہوا اور لوگ منتشر ہو گئے تو چونکہ لنچ کا انتظام یہیں تھا اس لیے ہم بجائے ہوٹل واپس جانے کے اسی بلڈنگ میں ٹھہر گئے، اور ادھر اُدھر دو چار احباب باتیں کرنے لگے، لنچ میں ابھی دیر تھی اور ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا، اسی بلڈنگ کے ایک بڑے کمرہ میں نماز کا اہتمام تھا، بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے، وضو وغیرہ کے لیے باتھ روم موجود تھے، میں اور میاں اسلم ہم دونوں وضو سے فارغ ہو کر نماز کے کمرہ میں پہنچے تو جماعت تیار تھی، ہم اس میں شریک ہو گئے، ایک عرب مندوب امامت کر رہے تھے، میں نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں دیکھا ہے کہ عرب مندوبین ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء کو با جماعت پڑھتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ظہر کی دو رکعت نماز قصر سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ عصر کی نماز کے لیے جماعت کھڑی ہو گئی، میں اس میں شریک نہیں ہوا، بعد میں ایک سوڈانی دوست نے پوچھا: آپ ہمارے ساتھ عصر کی نماز میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ میں نے کہا: میں سفر میں یا اور کسی ناگزیر مجبوری کی حالت میں جمع بین الصلوٰتین کے جواز کا قائل ہوں اور جب میں خود ریل میں یا ہوائی جہاز میں ہوتا ہوں تو اس پر عمل بھی کرتا ہوں، لیکن قیام کی صورت میں جمع نہیں کرتا اور ہر نماز اس کے اپنے وقت پر پڑھتا ہوں، میں نے مزید کہا: آپ حضرات کا عمل یعنی قیام کے دنوں میں بھی جمع بین الصلوٰتین اور جمع کی بھی یہ صورت کہ ظہر کا وقت ابھی شروع ہوا ہے اور آپ نے عصر کی نماز بھی پڑھ ڈالی میں اسے ناجائز تو نہیں کہہ سکتا، لیکن میرے نزدیک خدا کا

مزید یہ میں نے ایک بات یہ بھی دیکھی ہے کہ سفر تو سفر حضر میں بھی سنن ونوافل کا خیال بہت کم کرتے ہیں، عرب ممالک میں عام طور پر دیکھا ہے کہ مغرب کی جماعت ختم ہوئی کہ مسجد عموماً خالی ہو جاتی ہے، اس کے بالمقابل ہمارے ہاں سنن ونوافل کا یہ التزام ہے کہ سفر میں ہیں اور صلوٰۃ الاوابین پڑھ رہے ہیں، ریل میں جا رہے ہیں اور ظہر کے سنن ونوافل دونوں ادا کر رہے ہیں، میرے نزدیک عرب اور ہم دونوں افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، صراط مستقیم صرف اتباع سنت کا نام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمل جس طرح کیا ہے، ہمیں بھی وہ عمل اسی طرح کرنا چاہیے، ورنہ ہم احداث فی الدین کے مرتکب ہوں گے، افسوس ہے ہمارے فقہا اور صوفیا نے اس حقیقت کا لحاظ کم رکھا ہے ....

ـــ اور اسلام میں بھانت بھانت کے جو فرقے پیدا ہوئے ہیں میرے نزدیک اس میں ایک بڑی حد تک دخل اس بات کا بھی ہے کہ ہم نے لاشعوری طور پر قرآن کے حکم: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا "رسول جو کچھ تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ" اور "وَلَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" "اور اے مسلمانو! تمہارے لیے رسول اللہ ہی بہترین نمونۂ عمل ہیں" یہ اور اس جیسی دوسری آیات واحکام کو نظر انداز کر دیا ہے، خیر! نماز سے فراغت کے بعد لنچ ہوا۔ تین بجے میوزیم جانے کا پروگرام تھا، لیکن لنچ کے بعد مجھے قیلولہ کی عادت ہے اور اعلیٰ درجہ کے مغلئی کھانے جو ابھی تناول کیے تھے ان کے بعد تو قیلولہ واجب ہو جاتا ہے، اس لیے میں سیدھا ہوٹل چلا گیا اور میوزیم نہیں گیا، ڈنر ہوٹل میں ہی تھا اس لیے کہیں آنا جانا نہیں ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۸ مارچ کی صبح کو نو بجے سیمینار کا آغاز ہوا، مندوبین دو کمیٹیوں میں بٹ گئے تھے ایک کمیٹی نمبر ایک اور دوسری کمیٹی نمبر ۲، مجلس منتظمہ نے مقالات کے عنوان اور موضوع کے مطابق مندوبین کو دو کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا، میرا نام کمیٹی نمبر ایک میں تھا اور میرا خیال ہے

کرنے والوں کی اکثریت اسی کمیٹی میں تھی، کمیٹی نمبر ۱ کے اجلاس نیشنل اسمبلی ہال میں ہوتے تھے، اور کمیٹی نمبر ۲ کے سینٹ ہال میں، مقالہ کی زبان اردو، انگریزی یا عربی ہو سکتی تھی، دونوں ہالوں میں تینوں زبانوں میں فوراً ترجمہ کا انتظام بہت اچھا تھا۔ آپ کسی کی تقریر کو ان میں سے کسی زبان میں بھی سننا چاہیں، اس زبان کا نمبر گھما دیجیے اور آلۂ سماعت کو کان سے لگا لیجیے تقریر کسی زبان میں ہو رہی ہو، آپ بہرحال اسکو سنیں گے اسی زبان میں جس میں آپ سننا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے اس نظام کا تجربہ مجھ کو ۱۹۶۴ء میں قاہرہ کی مجمع البحوث الاسلامیہ کی کانفرنس میں ہوا تھا۔ کانفرنس کی سرکاری زبانیں تین تھیں: عربی، انگریزی اور فرانسیسی، ترجمہ کرنے والی تینوں لڑکیاں تھیں، وہ اس پھرتی اور خوبی سے ترجمہ کرتی تھیں کہ ترجمہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ مقالہ پڑھ رہی ہیں، مجھے سخت حیرت ہوئی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان لڑکیوں کی ٹریننگ فرانس میں ہوئی ہے، اور اب تو روزمرہ کی چیز ہو گئی ہے، جس بین الاقوامی کانفرنس میں جائیے یہ سسٹم موجود ہے۔

دونوں کمیٹیوں کے اجلاس ۸ ر اور ۹ ر مارچ کو چار چار اور ۱۰ ر کو دو، اس طرح ہر کمیٹی کی نشستیں دس ہوئیں جن میں مقالات پڑھے گئے اور ان پر مذاکرہ ہوا، پھر آخری دن یعنی ۱۰ کو سہ پہر میں دونوں کمیٹیوں کا مشترکہ اور کانفرنس کا اختتامیہ اجلاس ہوا جس میں چند تجاویز منظور ہوئیں اور چند خاص لوگوں نے مختصر مختصر تقریروں میں مندوبین کے نمائندوں کی حیثیت سے کانفرنس کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے اور پاکستان گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے میرا نام کمیٹی نمبر ۱ کی فہرست میں تھا۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ۹ بجے شروع ہوا تو اس وقت ڈائس پر صدر مجلس استقبالیہ جناب اے۔ کے۔ بروہی تشریف رکھتے تھے، پروفیسر منظور الدین احمد، صدر شعبۂ سیاسیات کراچی یونیورسٹی اور ڈاکٹر [illegible] جنرل وزارت امور مذہبی، اسلام آباد، یہ دونوں حضرات ہماری کمیٹی کا [illegible] کرنے کا کام انجام دے رہے تھے اس پہلے اجلاس کی [illegible]

اسماعیل راجی الفاروقی کا تعارف آئے نہ تھے اس لیے اس کی صدارت موصوف کی امریکن مسلمان اہلیہ ڈاکٹر لوئس لمیا الفاروقی نے کی۔ میاں بیوی دونوں امریکہ کی ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈلفیا کے خصوصی شعبہ جات میں استاد ہیں، دونوں بڑے لائق و قابل اور متعدد کتابوں اور مقالات کے مصنف ہیں۔ بیگم سے یہاں ملاقات اور گفتگو ہوئی تو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ نام کی نہیں بلکہ درحقیقت عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکی اور سچی مسلمان ہیں ــــــ اور درحقیقت یورپ اور امریکہ جہاں ہر شخص مکمل آزاد ہے اور اپنے فکر و عمل میں کسی لالچ اور دباؤ کو بالکل نہیں مانتا وہاں کسی نومسلم کے برائے نام مسلمان ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں، خود میرے ذاتی دوستوں اور ملاقاتیوں میں مغربی ممالک کے چند نومسلم مرد اور خواتین ہیں جن کی مذہبی اور اخلاقی زندگی ہم جیسے لاکھوں خاندانی مسلمانوں سے کہیں زیادہ بہتر اور قابل رشک ہے۔
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ــــــ علاوہ ازیں اگرچہ بیگم فاروقی کا اصل موضوع تدریس و تحقیق اسلام کے فنون لطیفہ ہیں، لیکن ان کی گفتگو اور بعض ان کے مقالات جو میری نظر سے گذرے ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ ان کا قرآن و حدیث، تاریخ اسلام اور تصوف کا مطالعہ بھی وسیع اور عمیق ہے،

آں محترمہ کے سوہر نامدار ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی جو اصلاً مصری ہیں اور ایک مدت سے امریکہ میں ہیں اُن سے میری ملاقات نہیں ہے لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میں کناڈا کی میکگل یونیورسٹی کے اسلامک ریسرچ اینڈ اسٹڈی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہو تو معلوم ہوا یہاں رہ کر انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو وہاں میرے قیام کے زمانہ میں طبع ہو کر آگئی تھی اور میں نے اسے پڑھا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب عربی ملکوں اور خصوصاً مصر و شام اور لبنان و عراق کے سر پر عربی قومیت کا بھوت سوار تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فاروقی کی کتاب کا موضوع بھی یہی تھا اور اس کا نام انگریزی میں Arabacism اور عربی میں العروبۃ تھا۔ میں نے اس کتاب کو اول تا آخر پڑھا تو سخت افسوس ہوا۔ کہ مصنف نے عربی قومیت کی برتری اور فضیلت ثابت کرنے کی غرض سے یہ ثابت کرنے کی

کوشش کی تھی کہ اسلام جب تک عربوں میں رہا محفوظ اور صحیح سالم رہا، لیکن عجم میں پہنچ کر اس کی صورت مسخ ہو گئی، اور اس میں قسم قسم کی رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں، اسی سلسلہ میں مصنف نے لکھا تھا کہ پوری تاریخ اسلام میں اگر عجم میں کسی نے اسلام کو صحیح سمجھا ہے تو وہ شیخ احمد سرہندی اور ڈاکٹر اقبال ہیں۔

اس ایک پہلو سے قطع نظر کتاب میں بہت سی مفید اور پر از معلومات باتیں بھی ہیں جن سے میں محظوظ ہوا۔ مثلاً قرآن مجید میں تورات، انجیل، اور زبور کے ساتھ صحف ابراہیم کا بھی ذکر ہے، اب سوال یہ ہے کہ اول الذکر کتابوں سے تو ہم واقف بھی ہیں۔ اور وہ دستیاب بھی ہیں۔ لیکن صحف ابراہیم کہاں ہیں؟ اس کے متعلق، جیسا کہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے ایک نوٹ میں لکھا ہے، میں صرف اس قدر جانتا تھا کہ اگرچہ عہد عتیق میں حضرت ابراہیم کو پیغمبر تسلیم کیا گیا ہے (Gen XX.7) لیکن صحیفۂ ابراہیم کے نام سے کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی، البتہ لندن کی ایک مذہبی سوسائٹی نے ۱۹۲۷ء میں ایک کتاب "وصیت نامۂ ابراہیم" (The Testament of Abraham) کے نام سے شائع کی تھی جو یونانی زبان میں کسی کتاب کا ترجمہ تھی اور اس کو مسٹر جی۔ ایچ بوکس نے یونانی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا، قیاس کیا جاتا ہے کہ اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی اور پہلی صدی عیسوی میں اس کو مصر میں یونانی زبان کا لباس پہنایا گیا تھا، بس صحف ابراہیم کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ صرف اسی قدر تھا،

افسوس ہے ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کی کتاب اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے اس کو پڑھے ہوئے زمانہ ہو گیا، اس لیے اب مجھے یاد نہیں ہے کہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے مسٹر بوکس کے جس انگریزی ترجمہ کا ذکر کیا ہے اسی کی بنیاد پر یا کسی اور ماخذ کی اساس پر ڈاکٹر فاروقی نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس کو کسی زمانہ میں ایک بائبل سوسائٹی نے صحف ابراہیم [illegible] (The Book of Abraham)

کتب کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ دکھانے کی غرض سے کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم سے متعلق جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں اور اس صحیفہ کے بیانات میں کس درجہ مطابقت ہے ڈاکٹر فاروقی نے یہ کیا کہ چند صفحات میں دو دو کالم بنا کر ایک کالم میں حضرت ابراہیم سے متعلق قرآنی آیات نقل کر دیں اور اس کے بالمقابل دوسرے کالم میں کتاب ابراہیم کے اقتباسات درج کر دیے، یہ بڑا عجیب و غریب انکشاف تھا، میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔ میں نے دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ اگرچہ بعض جزئی تفصیلات جو قرآن میں ہیں وہ کتاب ابراہیم میں نہیں ہیں اور بعض چیزیں جو کتاب میں ہیں وہ قرآن میں نہیں، لیکن جہاں تک بنیادی امور کا تعلق ہے دونوں کے بیانات میں بڑی حد تک مطابقت ہے اور اس سے قرآن مجید کا یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ یہ جو کچھ اوپر گذرا ہے وہ صحف سابقہ میں موجود ہے، صحف ابراہیم و موسیٰ میں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی بڑے فاضل اور اعلیٰ درجہ کے مصنف اور محقق ہیں، مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ان کی اور بھی چند کتابیں جو قابل مطالعہ ہیں اور ابھی پچھلے دنوں ایک بیرونی سفر میں ایک عزیز دوست سے جو امریکہ میں پانچ چھ برس رہ چکے تھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر فاروقی نے عرب قومیت سے متعلق اپنے سابقہ افکار و خیالات سے رجوع کر لیا ہے اور کتاب میں جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا تھا اس پر خط نسخ کھینچ دیا ہے، مزید برآں اس دوست نے بتایا کہ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کی مذہبی زندگی بھی بہت بہتر ہو گئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ فکر و عمل کی یہ تبدیلی خود ڈاکٹر صاحب کے اندرونی احساس کا نتیجہ ہے یا "جمال ہمنشیں در من اثر کرد" شیخ سعدی کے مصرعہ کے مطابق ان کی رفیقۂ حیات کے افکار و نظریات کا کرشمہ!

[illegible]

کا علم تصور تھا۔ تمام مقالات پہلے ہی سات جلدوں میں چھاپ کر منتظمین میں تقسیم کیے گئے تھے اور وقت میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ مقالہ پورا پڑھا جائے اس لیے ہر مقالہ نگار کے لیے دس منٹ مقرر کر دیے گئے تھے کہ ان میں مقالہ کا خلاصہ بیان کر دے۔ اس قرارداد کے مطابق میں نے مقالہ کے ضروری اجزاء کو دس منٹ میں سمیٹ لینے کی کوشش کی، لیکن وقت پورا ہو گیا اور بعض اجزاء رہ گئے۔ محترم صدر اور جناب اے کے بروہی نے اسے محسوس کر لیا، اس لیے ٹھیک دس منٹ پر جب میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا تو دونوں از راہ کرم ایک ساتھ بولے: "آپ کے لیے پانچ منٹ اور ہیں، تقریر جاری رکھیے۔" میں نے شکریہ ادا کیا اور پندرہ منٹ میں تقریر ختم کر دی۔ اس کے بعد میں ذرا ٹھہرا کہ شاید کوئی صاحب سوال کریں، مگر میرے مقالہ کا مضمون ہی ایسا تھا کہ اس پر کیا سوال ہو سکتا تھا، جب میں ڈائس سے اتر کر اپنی سیٹ کی طرف چلا تو بعض عرب اور دوسرے دوستوں نے مسکرا کر اور جزاک اللہ کہہ کر مقالہ کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد چند مقالات اور ہوئے، گیارہ بجے یہ سیشن ختم ہو گیا اب ہم سب لوگ چائے یا کافی کے لیے ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے، اس کا دور نصف گھنٹہ تک چلتا رہا، ساڑھے گیارہ بجے دوسرا سیشن شروع ہوا۔ پہلے سے پروگرام کے مطابق اس کی صدارت میں نے کی، ڈیڑھ بجے یہ ختم ہو گیا، نماز پڑھی، کھانا کھایا اور دوستوں سے گپ شپ کی، ڈھائی بجے تک یہ عمل ہوا، گھنٹی بجی اور تیسرا سیشن شروع ہو گیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سلطان ابو علی نے کی جو قاہرہ یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں، ساڑھے چار بجے یہ ختم ہوا۔ پانچ بجے چوتھا سیشن شروع ہوا، اور مغرب تک چلتا رہا، اس طرح دونوں کمیٹیوں کے دس دس سیشن ہوئے اور ہر سیشن میں سات آٹھ مقالات کا اوسط رہا، اس طرح کم و بیش ۱۴۰ مقالات پیش کیے گئے۔

مقالات کا معیار ان مقالات کا معیار کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے ایک مقرر تاریخ تک جو مقالات اس کو وصول ہو چکے تھے ان کی جانچ پڑتال

(Scrutiny) کے لیے ایک اکسپرٹس کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر خود جناب اے۔ کے بروہی صاحب تھے، اس کمیٹی نے تمام مقالات پڑھے اور ایک معیار قائم کیا، معیار یہ کہ کمیٹی نے تین درجات مقرر کیے A، B اور C پھر جو مقالات اول دو میں سے کسی درجہ میں آ گئے ان کا انتخاب کر لیا گیا اور مقالہ نگاروں کو کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا گیا، اور جو مقالہ C کے درجہ میں آیا اس کو رد کر دیا گیا اور مقالہ نگار کو دعوت شرکت نہیں دی گئی، اسلام آباد میں ایک عزیز دوست جو ماہرین کی اس کمیٹی کے ممبر تھے ان سے معلوم ہوا کہ کتنے ہی مشاہیر ملت اور علمائے امت تھے جن کے مقالات مقررہ معیار پر پورے نہ اترے اور انھیں نامنظور کر دیا گیا، فاقی طور پر اس انکشاف پر مجھ کو کوئی اچنبھا نہیں ہوا، کیونکہ خود میرا تجربہ یہ ہے کہ اس نوع کی دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں عموماً ان حضرات کو بھی مدعو کر لیا جاتا ہے جو اپنے ملک میں کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کے صدر یا سکریٹری ہوتے ہیں، یا کسی بڑی مسجد میں امام یا خطیب کے فرائض انجام دیتے ہیں، یہ حضرات لیڈر قسم کی شہرت رکھتے ہیں، لیکن مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف جو خاموشی سے پتہ مارنے کا کام ہے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملتا ہے تو کسی طالب علم سے اکثر مفت اور کبھی پیسے دے دلا کر مضمون لکھوا لیتے ہیں اور اسے اپنے نام سے پڑھ ڈالتے ہیں، آپ جانئے بے گار کا کام اور وہ بھی ایک طالب علم کا کیا ہوا! معیاری کیسے ہو جائے گا؟

میرے مقالہ کا معیار | اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ خود میرے مقالہ کا معیار کیا تھا؟ تو میں گذارش کروں گا یہ تو ظاہر ہے کہ مقالہ کم از کم دوسرے درجہ یعنی بی کلاس کا تو تھا ہی، جبھی تو انتخاب میں آ گیا، لیکن اگر ماہرین کی کمیٹی مجھ سے کہتی کہ میں خود اپنے مقالہ کا درجہ متعین کر دوں تو یقین کیجیے میں اس کو سی (C) کلاس سے زیادہ کا درجہ ہرگز نہ دیتا کیونکہ اول تو میں جب رفیقۂ حیات کے انتقال کے باعث سخت ملول و دل گرفتہ اور پراگندگیٔ قلب و دماغ کا شکار تھا ——————

احباب بھی جانتے ہوں کہ یہ غم جیون ساتھی ہے اس وقت میں نے یہ مقالہ صرف ایفائے عہد

کی شرم میں لکھا تھا اور اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ خدا نے میری طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ میری نظر ہمیشہ دوسروں کے محاسن پر رہتی ہے اور ان کی کوتاہیوں اور معائب سے صرف نظر کرتا ہوں، اس کے برعکس جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے نقائص ہمیشہ میرے پیش نظر رہتے ہیں اور میرا ذوق خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ لکھنے کے بعد میں اپنے مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر کروں تو اس میں کانٹ چھانٹ کرنی ہوگی اور اس کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ اسی طرح دنیا بھر کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں لیکن اپنی چھپی ہوئی کسی کتاب کو اٹھا کر پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کتاب پڑھوں گا تو اس کے نقائص سامنے آئیں گے کہ یہاں اس لفظ کے بجائے فلاں لفظ اور اس جملہ کے بدلہ میں کوئی اور جملہ ہونا چاہیے تھا، یہ حوالہ ثانوی درجہ کا ہے، اس سے بہتر حوالہ ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ اور اس سے طبیعت بدمزہ ہوگی، آخر انسان بہرحال ناقص اور اس کا ہر کام ادھورا اور ناقص ہے۔ پھر میرے دماغ پر دنیا کی ناپائیداری، فنا، حدوث اور بشری نقص کے تصور کا اس درجہ استیلا اور غلبہ ہے کہ آپ میری لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں اور مجلات و رسائل پائیں گے جو خوبصورت الماریوں میں کچھ ترتیب سے اور کچھ بے ترتیبی سے پڑے ہیں لیکن ان میں آپ تلاش کریں گے تو نہ میری کسی کتاب کا کوئی نسخہ آپ کو ملے گا، نہ میرے کسی مقالہ کی کوئی کاپی ملے گی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ریڈیو پر دو سو ڈھائی سو سے کم میری تقریریں نہیں ہوئیں اور وہ بھی مذہبی، ادبی اور تاریخی، تقسیم سے پہلے آغا محمد اشرف اور ن۔م۔ راشد علی الترتیب اردو پروگرام کے انچارج تھے اور دونوں میرے دوست تھے اس لیے ان کے زمانہ میں میری تین چار تقریریں ہر مہینہ ہو جاتی تھیں، بلکہ بعض اوقات ایک ہی موضوع پر مسلسل کئی کئی تقریریں ہوتیں، مثلاً ایک مرتبہ "دلی کے سات شہر" پر میں نے ایک سیریز براڈ کاسٹ کی، مگر میرے پاس ایک تقریر کی نقل بھی نہیں ہے، یہ سب کچھ کیوں؟ محض اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں، یہ دنیا فانی ہے، میں فانی ہوں، اور میری ہر چیز فانی ہے، جب یہ ہے تو پانی کے بلبلوں کو عمر اس میں محفوظ کرنے کی کوشش کونسی

وشوابھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اردو مخطوطات

از جناب عبدالوہاب صاحب بدر بستوی سنٹرل لائبریری وشوابھارتی یونیورسٹی
شانتی نکیتن، مغربی بنگال

نصاب بدیع العجایب مصنفہ امیر خسرو، صفحات ۲۳، کاتب روح اللہ، سال کتابت ۱۵ سنہ جلوس بادشاہ محمد شاہ غازی، طرز کتابت خط شکستہ۔ کیڑوں کے دندانِ حرص سے اکثر الفاظ واضح نہیں ہیں۔

ابتداء کے انیس ۱۹ اشعار بغیر کسی عنوان کے ہیں، اس کے بعد کل بائیس ۲۲ عنوانات مع اپنی تفصیل کے مصنف کی کاوش اور ندرتِ دماغی کا پتہ دے رہے ہیں۔ حسب ذیل عنوانات غالباً وضاحتِ نسخہ کے لیے کافی ہوں گے:

۱۔ ہر مصراع در مصراع دوم عربی قلب مصراع دیگر است بطریق لف ونشر درین مصراع عربی اول قلب مصراع دویم است۔

۲۔ مصراع عربیہ مقلوب منقول است نصف بملاحظہ لف ونشر درین قطعہ ہر مصراع عربیہ قلب مم۔

۳۔ ترجمہ ہر مصراع عربی در مصراع فارسی مقلوب است بملاحظہ۔

۴۔ مدبر الفاظ آفتاب شمس وزحل وشمس الدین۔

۵۔ درین قطعہ لفظ عربی بہ...... خود لفظ فارسی ہر یک قلب بعینہ علی معانی است۔

۶۔ ...... شش مصراع عربی مقلوب مستولیست برعایت لف ونشر۔

۷۔ القطعۃ ذوالبحرین۔

۸۔ القطعۃ فی المثلث

۹۔ 〃 〃 〃

۱۰۔ القطعۃ مقطوع الالف۔

۱۱۔ 〃 لازم الالف۔

۱۲۔ 〃 الفاظ ....

۱۳۔ الفاظ عربیہ مثلث بملاحظہ لف و نشر۔

۱۴۔ القطعۃ اول بجنس مصراع دویم بملاحظہ۔

۱۵۔ الفاظ مشترک بین المتن۔

۱۶۔ ایں قطعہ عربی و فارسی۔

۱۷۔ القطعۃ غیر منقوط۔

۱۸۔ القطعۃ مفصل الحروف۔

۱۹۔ 〃 منفصل الحروف

۲۰۔ 〃 رقطا۔

۲۱۔ 〃 خیفا یعنی کلمہ منقوط و یک کلمہ۔

۲۲۔ 〃 منقوط الحروف۔

ابتدائی پچیس (۲۵) اشعار بغیر کسی عنوان کے ہیں اور ان سے قبل نہ حمدیہ جملے ہیں اور نہ نعتیہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے غالباً شروع کا کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے۔ نسخہ کا پہلا شعر:

"مصر شہر و شہر ما و بار آب و خوف سہم ۔ سہم تیر دا جنجہ چہ بال باشد بال جان"

اسی طرح پورے نسخہ میں ہر عنوان کے تحت جتنے بھی عربی اور فارسی الفاظ آئے ہیں ان کے نیچے حروف ع اور ف سے ممیز کیا گیا ہے۔ امیر موصوف کا یہ نسخہ بنام "نصاب حضرت امیر خسرو" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے سبحان اللہ مجموعہ میں موجود ہے جس کے ...

۱۸۱۹ء کا مکتوبہ ہے[۱] نیز ایک نسخہ اس کی فرہنگ ہے جس کا نام "فرہنگ نصاب بدیع العجائب دیا[ن] صنائع بحور و اوزان" ہے" جس کے صفحات ۲۹ ہیں اور ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں کتابت کیا گیا ہے[۲]۔

فہرست خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "نصاب بدیع" جس کے مصنف کا نام محمد شریف ولد محمد اشرف اور ایک مشرّح نسخہ بنام "شرح نصاب بدیع" شارح ٹیک چند بہار کا ذکر ملتا ہے[۳] لیکن حیرت ہے کہ نمونہ کا جو پہلا شعر ذکر کیا گیا بعینہٖ وہی ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ والے نسخہ کا بھی ہے۔ اب نمونہ کے شعر سے دو مصنفین سامنے آتے ہیں، ایسی صورت میں مذکورہ دونوں مقامات کے نسخوں کا جب تک مقابلہ نہ ہو، قطعیت کے ساتھ اصل مصنف کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن مختلف ذرائع سے یہ یقینی ہے کہ امیر موصوف کی ایک تصنیف "نصاب بدائع" کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

مذکورہ بالا قلمی نسخوں کے علاوہ مطبوعہ صورت میں بنام "نصاب خسرو" کتب خانہ رحیمیہ دہلی میں برائے فروخت پایا جاتا تھا[۴]۔ ڈاکٹر وحید مرزا مرحوم نے اپنی کتاب میں "نصاب بدائع العجائب" کا ذکر کیا ہے[۵]۔ "مجلس امیر خسرو بلخی"، کابل (افغانستان) کے زیر اہتمام امیر خسرو کی حیات پر مختلف اہل علم کے مضامین کا ایک مجموعہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا جس کے جامع فقیر محمد خیر خواہ ہیں۔ اس مجموعہ میں جامع موصوف کا ایک مضمون بعنوان "نسخہ ہائے خطی آثار امیر خسرو بلخی" ہے، اس میں موصوف نے بھی "نصاب بدیع العجائب" کا ذکر کیا ہے[۶] اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم بھی اپنی کتاب میں اس نسخہ کی اطلاع دے چکے ہیں[۷]۔ ان مذکورہ شواہد کے پیش نظر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ کیا عجب ہے خدا بخش لائبریری، پٹنہ کا نسخہ بھی امیر خسرو ہی کی تصنیف ہو۔

---

۱ فہرست نسخ قلمی سبحان اللہ اورینٹل لائبریری: ص ۳۰۔ ۲ ایضاً: ص ۵۵۔
۳ فہرست قلمی کتب خدا بخش لائبریری پٹنہ، جلد ۹: ص ۴۹-۵۰۔ ۴ فہرست کتب خانہ رحیمیہ دہلی۔ ۱۳۳۸-۳۹ھ: ص ۴۷۔ ۵ (حیات) امیر خسرو: ص ۱۹۳۔ ۶ مجلس امیر خسرو بلخی: ص ۲۵۲۔ ۷ حضرت امیر خسرو آف دہلی (انگریزی اڈیشن): ص ۳۵۔

مسٹر ہرمن ایتھے (Hermann Ethe) نے "نصاب بدیع" نام کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے اور شعر اول کا جو نمونہ دیا وہ جو بہو وہی ہے جس کا تعارف کرایا جا رہا ہے؛ لیکن افسوس کہ مسٹر موصوف نے مصنف کا حوالہ نہیں دیا۔ نیز ایک شرح کی بھی اطلاع دیتے ہیں۔ جس کے شارح ملا سعد عظیم آبادی کو بتایا ہے[1]

امیر خسرو قصبہ پٹیالی[2] ضلع ایٹہ (یو۔پی) میں بسال ۶۵۱ھ ۱۲۵۳ء کو پیدا ہوئے اور دہلی میں بسال ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء وفات پائی۔ امیر خسرو مرحوم کی حیات اور ان کے آثار و افکار پر مختلف زبانوں خصوصاً اردو میں بصورت کتاب اور رسائل میں مضامین اتنی کثرت سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک چھوٹی سی لائبریری تیار ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں موصوف کی زندگی سے متعلق سطحی طور پر لکھنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو مرحوم کی حیات کے کچھ نئے اور پوشیدہ گوہر اب بھی منظرِ عام پر لائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ان کے عہد کی پوری تاریخ اور امیر موصوف کی جملہ پائی جانے والی تصانیف کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے، افسوس کہ احقر دقت اور تحقیق علم و فہم سے قطعی طور پر فی الحال محروم ہے۔

اب تک امیر خسرو پر جتنی نگارشات کتاب اور مضامین کی شکل میں گذریں، چند کو چھوڑ کر اکثر میں صرف تکرار اور اعادہ کے سوا کچھ نہیں، صرف الفاظ اور جملوں کی تقلیب بندی ہے نیا زاویۂ نگاہ یا عمیق بصیرت یکسر معدوم۔ چند کتب جو قابل مطالعہ ہیں ان میں اولین مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی کتاب "شعر العجم" جلد دوم ہے۔ جس میں امیر موصوف کی حیات اور افکار کی پر مکمل تشریحات ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ شبلی مرحوم کی فکر و تحقیق سے اصحاب علم کچھ اختلافات

---

[1] فہرست فارسی کتب قلمی انڈیا آفس لائبریری، لندن، جلد اول: ص ۱۲۹۷، [2] یہ قصبہ پہلے گنگا کے جنوبی کنارے ضلع بدایوں میں تھا لیکن اب ضلع ایٹہ میں ہے (بحوالہ حواشی تاریخ فرشتہ مترجمہ اردو جلد ۲: ص ۱۷۱ و ۱۸۰۔ مترجم سید ہاشمی فرید آبادی)

کی گنجائش نکال سکتے ہیں جس طرح حافظ محمود شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر وحید مرزا مرحوم وغیرہ نے کیے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس سے بہتر کتاب اردو میں تو کیا فارسی میں بھی غالباً نہیں ہے۔ اردو دوسری بہتر کتاب ڈاکٹر وحید مرزا مرحوم کی ہے۔

ان سلسلہ ہائے سطور میں صرف چند خدشات حیاتِ امیر خسرو سے متعلق جو کھٹک رہے تھے انھیں کو پیش کیے جا رہے ہیں۔ غلام سرور لاہوری مرحوم نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد کی اجازت پر گلستانِ سعدی کی طرز پر "بہارستان" نامی کتاب تصنیف کی تھی۔ سرور لاہوری مرحوم کی عبارت ملاحظہ ہو:-

نقل است کہ خواجہ امیر روزی بخدمت نظام الدین اولیا ربدایونی حاضر شد، دید کہ آنجناب بمطالعۂ گلستاں مصروف ساخت۔ چوں شیخ از مطالعۂ کتاب فراغت یافت، عرض کرد کہ اگر ارشاد گردد بندہ نیز یک نسخہ بطرز و طرحِ گلستاں باشد تصنیف کند و باسم بہارستان موسوم سازد، فرمود کہ مناسب است۔ پس در چند ایام کتاب بہارستان تصنیف کرد و بخدمت شیخ آورد، شیخ فرمود کہ ترک اللہ درین کتاب بسیار دادِ فصاحت و بلاغت دادی و نامش نیز بہارستان دادی۔[1] الخ

گلستانِ سعدی کے طرز پر صرف مولانا جامی کی "بہارستان" قلمی یا مطبوعہ صورت میں تو ضرور دیکھی گئی ہے لیکن امیر خسرو کی کتاب کے سلسلے میں متعدد تذکرے اور کتب تواریخ کے مطالعے کے باوجود کہیں کوئی ذکر نہیں ملا اور نہ کسی کی زبان سے ہی اب تک کان آشنا ہو سکے، دوسری قابلِ افسوس کارروائی اپنی ناچیز سمجھ میں وہ آتی ہے جو امیر خسرو کی تدفین کے سلسلے میں شیخ نظام الدین اولیاء مرحوم کی وصیت کے برخلاف عمل میں آئی۔ واقعہ کی تفصیل پہلے محمد قاسم فرشتہ (متوفی ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء) کے قلم سے ملاحظہ کیجیے:

"شیخ بارہا گفتہ بود کہ امیر خسرو بعد از من نخواہد زیست۔ چو رحلت کند پہلوی من دفن

---

[1] خزینۃ الاصفیاء: ص ۳۹۔

کنند کہ او صاحب اسرار منست و من بے او قدم در بہشت ننہم و اگر جائز بود کہ دو کس را در یک قبر گذارند، وصیت کردے کہ او را در قبر من دفن نمایند تا ہر دو یکجا باشیم۔ الحاصل چوں امیر خسرو نقل نمود، خواستند کہ بموجب وصیت پہلوئے قبر شیخ درون گنبد دفن کنند، یکی خواجہ سرایان کہ منصب وزارت داشت و مرید شیخ بود مانع شدہ کہ بعضے مریدان شیخ و امیر خسرو مشتبہ خواہد شد پس او را در پایان شیخ بر چبوترۂ یاران مدفون ساختند[1] الخ"

مذکورہ وصیت میں شیخ اولیاء مرحومؒ کی دو خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ امیر خسرو کی قبر اُن کے پہلو میں ہو اور دوسری یہ کہ شرعاً اگر اجازت ہوتی تو ہم دونوں ایک ہی قبر میں مدفون ہوتے۔ ظاہر ہے یہ دوسری تمنّا تو شرعاً ناممکن تھی لیکن پہلی خواہش شیخؒ کی وصیت کے مطابق عقیدتمندوں کا اخلاقی فرض تھا کہ اس کے مطابق عمل کرتے لیکن کتنا کم ظرف، مغرور اور بے ادب وہ خواجہ سرا تھا جس نے دیگر ارادتمندوں کے چاہنے کے باوجود اپنے پیر و مرشد کی آخری وصیت کے برخلاف امیر خسرو کو جانب پائینتی دفن کرا دیا۔ بہانہ یہ تراشا کہ دونوں قبروں میں عقیدتمندوں کے لیے اشتباہ لازم آئے گا۔ حالانکہ اس شبہہ کو دور کرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں، مثلاً کوئی نشان ہی نصب کر دیا جاتا۔

اس تدفین کو ہی بعد کے کچھ خوش اعتقاد پسندوں نے امیر خسرو کے لیے بہت بڑا اعزاز اور قلم نگاروں نے اس اہانت آمیز واقعہ کا ذکر ہی غالباً عظیم سعادت سمجھا۔ محل تدفین اور منزلت وصیت کی اہمیت پر کسی نے کوئی رائے دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ تعجب ہے مولانا شبلی مرحوم جیسی شخصیت اس تدفین پر کس طرح مطمئن ہو گئی ہے، لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب کی پائینتی دفن کیے گئے، اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی[2]

امیر خسرو اور شیخ نظام الدین اولیا مرحوم کے درمیان جس طرح کے روحانی تعلقات تھے ان کے پیش نظر یہ واقعہ تدفین قابلِ اعتراض نہیں بلکہ دونوں بزرگوں کے حق میں انتہائی توہین ہے۔

امیر خسرو کی زندگی کا تیسرا محیّر العقول وہ واقعہ ہے جب نظامی گنجوی کی "مخزن الاسرار" (مثنوی) کے جواب میں امیر موصوف نے "مطلع الانوار" لکھنے کے دوران یہ شعر لکھا: ؎

"دبدبۂ خودیم شد بلند		زلزلہ در گورِ نظامی فگند" تو پردۂ غیب سے ایک بے نیام تلوار امیر خسرو کے سامنے ظاہر ہوئی، امیر نے معاً اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیاء سے مدد چاہی تو فوراً ہی شیخ موصوف کی آستین مبارک اُس غیبی تلوار اور امیر خسرو کے درمیان حائل ہوگئی۔ محمد افضل سرخوش مرحوم (متوفی ۱۱۲۶ھ) لکھتے ہیں:

از غیرت ایں سخن شمشیرِ برہنہ از غیب بروی نمودار شد، حضرت نظام الدین اولیاء بحمایت وی در رسید و آستین مبارک کہ خود در شمشیر بداشت و آستینِ آنحضرت قطع گردید۔[۱]

اور محمد قاسم فرشتہ بایں الفاظ اطلاع دیتے ہیں:

"در تذکرۃ الاتقیاء مسطور است کہ امیر خسرو نسبت باستادانِ ماضیہ زبانِ طعن کشودی خصوص درآں وقت کہ خمسۂ نظامی را جواب می گفت و سلطان المشائخ از باطن ایشاں ترسانیدہ منع کردی و امیر خسرو در جواب گفتی کہ در پناہِ شمائم آسیبی بمن نرسد، قضارا وقتیکہ ایں بیت گفت:

کوکبۂ خسرویم باشد بلند		غلغلہ در گورِ نظامی فگند

تیغ برہنہ حوالہ امیر خسرو شد، امیر خسرو نام شیخ و شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر بزبان

---

[۱] کلمات الشعراء؛ مرتب صادق دلاوری ایم۔اے: ص ۲۵۰۔

آورد و دریں صورت دستی پیدا شدہ سرِ آستین بدم تیغ داد و تیغ از آن گذشتہ
بر درخت کنار کہ در آنجا بود رسید و امیر خسرو بخدمتِ شیخ آمدہ خواست کہ
اظہارِ آن حال نماید شیخ سرِ آستین بدو نمود[1]

درونِ مصنفین مذکور کے بیان کردہ اس کرامتی واقعہ میں کس حد تک صداقت ہے؟
ماہرینِ اسرارِ تصوف اور زندانِ عقیدت کے سوا شاید ہی کوئی سنجیدہ ذہن قبول کر سکے
سوال یہ ہے کہ جو تلوار امیر خسرو پر وار کرنے کے لیے غیبی طاقت نے بھیجا تھا بظاہر امیر خسرو
کی تعلّی قدرت کو نہایت ہی ناپسند ہوئی جس کی پاداش میں معاذ اللہ خدا کا عتاب نازل
ہونا ضروری ہو گیا۔ اور جب یہ عتاب آیا تو پیر و مرشد کا ہاتھ ڈھال ثابت ہوا اور پھر حیرت یہ
ہے کہ حضرت شیخ کی صرف آستین قطع ہوتی ہے، ہاتھ صحیح سالم رہ جاتا ہے۔ گویا سارا
وبال بیچاری بے جان آستین کے مقدر میں آیا۔ حالانکہ یہ پاداش جرم اس بندۂ گنہگار
پر ہونا تھا جو نزول تلوار کا باعث ہوا یا وہ ہاتھ زد میں آنا چاہیے تھا جو خدائی فطرت
اور اس کے فیصلہ کو روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ کیا شیخ نظام الدین اولیاء مرحوم جیسی بزرگ
ہستی کی آستینِ مبارک قابلِ قدر نہ تھی جو اس پاداش کا شکار ہو گئی۔؟ امیر خسرو نے اپنے
شعر میں نظامی سے متعلق جس خیال کا اظہار کیا اس طرح کی باتیں تقریباً ہر شاعرِ قدیم و جدید کے
اشعار میں نظر آئیں گی، صرف شاعروں ہی پر کیا منحصر، اچھے اچھے نثار بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔
لیکن اس جرم کی سزا کا کوئی بھی مستحق نہیں ہوتا۔

افسوس ہے عام طور پر تصوف کے سلسلے کی ایسی ایسی بے شمار روایتیں کتابوں میں جگہ پا گئی
ہیں اور زبان زد عام ہو گئی ہیں جو کورانہ عقیدت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ خود ساختہ روایات اور
من گھڑت واقعات کی بنیاد تو آنحضورؐ کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی، لوگوں نے

---

[1] تاریخ فرشتہ، جلد ۲: ص ۴۰۳

لاکھوں اقوال وضع کرکے نبی امیؐ کی ذات گرامی کی جانب منسوب کر دیئے اور بعض فرمودات نبوی کا نام دے کر تشہیر خبر درج کر دی۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب رحمۃ للعالمین کی طرف غلط باتوں کے منسوب کرنے میں لوگوں کو باک نہ ہوا تو کئی صدیوں بعد کے صوفیاء کرام کے بارے میں عجوبہ واقعات بیان کرنے میں کیوں ہچکچا سکتے ہیں؟

امیر خسرو اور شیخ اولیاء مرحوم جیسی برگزیدہ ہستیاں بلاشبہ ہر اسلام پسند فرد کے لیے مشعلِ راہ اور نمونۂ ہدایت ہیں لیکن اُن کے اعمالِ حیات اور واقعاتِ زندگی بیان کرنے میں اعتدال اور سنجیدگی کا لحاظ ضروری ہے اور احتیاط و تحقیق کا جوہر ہمہ وقت پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ اسی میں بزرگانِ دین کی عظمت ہے اور اغیار کی نظروں میں شانِ امتیازی بھی۔

اب آخر میں امیر موصوف کی چند مشہور تصنیفات کے سلسلے میں ترتیب زمانی کے تحت اطلاعات پیش کی جا رہی ہیں البتہ جن کتب کا سالِ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا ان کا ذکر اجمالاً کر دیا گیا ہے۔

۱۔ تحفۃ الصغر (دیوان اول) سالِ تصنیف ۶۷۱ یا ۶۷۲ھ / ۱۲۷۲ء

۲۔ وسط الحیات (" دوم) " " ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء

۳۔ قران السعدین (مثنوی) " " ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء (سلطان معز الدین کیقباد کے متعلق ہے یہ مثنوی مولوی قدرت احمد کے حاشیہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ نیز ایک شرح عبدالرسول قاسم نے کی ہے) لکھنؤ سے ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں اور ایک شرح نور الحق (ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں کر چکے ہیں۔ اور اس مثنوی کا اصل متن لکھنؤ سے ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں بھی طبع ہوا تھا۔

۴۔ غرۃ الکمال (تیسرا دیوان) سالِ تصنیف ۶۹۳ھ / ۱۲۹۴ء (قصیدہ علاء الدین محمد شاہ خلجی کی شان میں ہے)

۵۔ مطلع الانوار (مثنوی) سالِ تصنیف ۶۹۸-۹۹ھ / ۱۲۹۸-۹۹ء۔ یہ نظامی کی "مخزن الاسرار" کے مقابلے میں لکھی گئی

جو علاؤالدین محمد شاہ سے معنون ہے۔

۶۔ شیریں و خسرو (مثنوی) سال تصنیف ۶۹۸ھ ۱۲۹۸-۹۹ء۔ یہ نظامی کی خسرو و شیریں کے مقابلہ میں لکھی گئی۔

۷۔ مجنوں و لیلیٰ (مثنوی) " " ایضاً لیلیٰ و مجنوں " " " یہ لکھنؤ اور کلکتہ سے ۱۲۲۶ھ ۱۸۱۱ء
۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء و ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء اور ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں طبع ہو چکی ہے۔

۸۔ آئینہ اسکندری (مثنوی) سال تصنیف ۶۹۹ھ ۱۲۹۹-۱۳۰۰ء نظامی کی اسکندر نامہ کے مقابلہ میں لکھی گئی۔

۹۔ ہشت بہشت (") " " ۷۰۱ھ ۱۳۰۱-۲ء " " ہفت پیکر " " (اس میں بہرام گور کے عشقیہ واقعہ کا بیان ہے)

۱۰۔ دو رانی و خضر خاں سال تصنیف ۷۱۵ھ ۱۳۱۶ء (یہ علاؤالدین محمد شاہ خلجی اور دختر راجہ گجرات کی منظوم عشقیہ داستان ہے)۔

۱۱۔ نہ سپہر سال تصنیف ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء (دربار قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا بیان ہے۔)

۱۲۔ بقیہ نقیہ (دیوان چہارم) " " "

۱۳۔ اعجاز خسروی۔ سال تصنیف ۷۱۹ھ ۱۳۱۹ء (یہ انشاء اور شستہ نثر کا اعجاز ہے)

۱۴۔ تغلق نامہ (مثنوی) " " ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء اس مثنوی کا اول و آخر ناقص ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب یہ شہنشاہ جہانگیر کی نظروں سے ۱۰۱۹ھ ۱۶۱۰ء میں گزری تو اسے بہت پسند آئی لیکن ناقص ہونے کی بنا پر متفکر رہا۔ اتفاق کی بات کہ انہی ایام میں کاشان (ایران) کے ایک شاعر مرزا حیاتی سیاحۃً دکن آئے اور نظام شاہ بحری کے ملازم ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے ان مرزا موصوف کے بارے میں اپنے کسی درباری سے تعریف سنی تو دکن سے طلوا کر اپنے قریبی ملازموں میں شامل کر لیا تھا۔ ایک دن اپنے درباری شعراء کو مذکورہ مثنوی کا تکملہ لکھنے کی فرمائش کی جن میں سے مرزا حیاتی کا تکملہ اتنا پسند آیا کہ مرزا موصوف کو سونا اور چاندی میں تلوا کر پوری بموزن مالیت مرزا کو عنایت کر دی۔ حیاتی کی وفات غالباً ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء میں ہوئی [۵] (باقی آئندہ)

---

[۵] "سخنوران بلند فکر" مصنفہ محمد منور صاحب بہاءالدین گوہر: ص ۱۹-۲۰۔

تبصرے

Politics and Society during the Early Medieval Period مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی تقطیع کلاں ضخامت ۴۴۷ صفحات طباعت، ٹائپ اور کاغذ اور گٹ اپ اعلیٰ قیمت مجلد -/150 پتہ: پیوپل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ، رانی جھانسی روڈ، نئی دہلی 110055

پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) برصغیر ہند و پاک کے بلند پایہ اور ممتاز مؤرخ تھے، برصغیر کے قرون وسطیٰ کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، ان کی مستقل تصنیفات کی تعداد تو کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے مقالات کثرت سے لکھے جو ملک کے بلند پایہ علمی اور تاریخی مجلات میں یا کسی کتاب کے مقدمہ کے طور پر شائع ہو کر ارباب علم وتحقیق کے حلقوں میں مقبول ہوتے رہے، ان کے انتقال کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک منصوبہ کے ماتحت مرحوم کے منتشر مقالات کو یکجا کرنے کا کام شروع کیا اور مجموعۂ مقالات کی پہلی جلد شائع کی جو (۱) قرون وسطیٰ کا تصوف (۲) ہندوستان اور اس کا ایشیائی ماحول اور (۳) تاریخ نویسی کا طریق کار اور نقطۂ نظر، ان تین اہم عنوانات کے ماتحت متعدد بیش قیمت مقالات ومضامین پر مشتمل تھی، زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو کافی وقفہ کے بعد منظر عام پر آئی ہے، اس مجموعہ میں جو مستقل مقالات ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں: (۱) عربوں کی فتح سندھ، (۲) سلطان محمود غزنوی (۳) شہاب الدین غوری (۴) ممالیک سلاطین ہند کے کارنامے (۵) علاء الدین خلجی کی فتوحات (ترجمہ) (۶) محمد بن تغلق (۷) ضیاء الدین برنی

۸) دلی سلطنت عہد متوسط کی ابتدا میں، ان مستقل مقالات کے بعد چند ضمیمے ہیں جو مختلف چھوٹی بڑی تحریروں پر مشتمل ہیں۔

اس میں شک نہیں پروفیسر محمد حبیب کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، ذہن کھلا ہوا اور روشن تھا، طبیعت بڑی اخاذ بھی تھی اور نقاد بھی، پھر انداز نگارش اس درجہ دلآویز کہ تاریخ میں افسانہ کا لطف آتا ہے، اس لیے ہر تحریر جو ان کے قلم سے نکلتی تھی ارباب ذوق کے لیے مہدی افادی کے لفظوں میں خاصہ کی چیز" ہوتی تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ میں تحقیق اور اکتشافات جدیدہ کا قدم روز بروز بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، نئے نئے ماخذ سامنے آرہے ہیں، سینکڑوں مخطوطات جو پہلے گوشۂ گمنامی میں تھے اب منظر عام پر آگئے ہیں، پھر تاریخ نویسی کے طریقۂ کار (Methodology) میں نمایاں فرق پیدا ہوا ہے، اس بنا پر پروفیسر محمد حبیب نے جن موضوعات پر مقالات لکھے ہیں ان پر مستقل محققانہ کتابیں شائع ہوگئی ہیں، اور ان کی روشنی میں موصوف کے بعض بیانات اور نتائج مشکوک اور محل نظر یا غلط ثابت ہوگئے ہیں، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات پر خود مرحوم کو عربی یا فارسی کی کسی عبارت کو صحیح پڑھنے یا اس کا صحیح مطلب سمجھنے میں مغالطہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے حافظ محمود خاں شیرانی نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا، خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے صرف ترتیب نہیں کی بلکہ غائر نظر سے ان مقالات کا تنقیدی مطالعہ بھی کیا اور اپنے طویل اور بصیرت افروز مقدمہ میں ایسے تمام مقامات کی نشاندہی کی ہے، جس سے یہ کتاب اپ ٹو ڈیٹ مکمل اور تاریخ کے طلبا و اساتذہ کے لیے ایک ارمغان بن گئی ہے، یاد رکھنا چاہیے اس سلسلہ میں پروفیسر نظامی نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہرگز نکتہ چینی یا خورده گیری نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس سے پروفیسر محمد حبیب کی علمی عظمت اور بزرگی پر کوئی حرف آتا ہے ہمارے سلف میں اور اب تو مغرب میں بھی یہ دستور عام ہے کہ مصنف ایک کتاب لکھتا ہے اور اس کے بعد اس کا کوئی شاگرد یا معاصر یا کوئی اور متاخر عالم اس کتاب پر استدراکات لکھ کر اس کتاب کی

نقص دور کر دیتا ہے، اسی سے علم کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور معلومات میں صحت پیدا ہوتی ہے۔

اقبال اور مغربی فکر تقطیع خورد ضخامت ۱۷ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں
پتہ :- اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر،

یہ کتاب ان دو توسیعی خطبات پر مشتمل ہے جو پروفیسر سید وحید الدین نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر جون ۱۹۸۰ء میں کشمیر یونیورسٹی میں دیے تھے، پروفیسر صاحب دلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فلسفہ رہ چکے ہیں، جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، کلام اقبال پر وسیع عمیق نظر رکھتے ہیں اور تصوف کا ذوق ان کا موروثی اور خاندانی ہے، اس بنا پر ظاہر ہے اس موضوع پر لکچر کے لیے ان سے بہتر اور کس کا انتخاب ہو سکتا تھا۔ لیکن عجیب معاملہ ہے پروفیسر صاحب کے پہلے خطبہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے: "گوئٹے اور نٹشے کا اثر اقبال کے فلسفہ کی تشکیل میں اتنا نمایاں نہیں، جتنا کہ ان کے شاعرانہ تخیلات، جمالیاتی تجزیہ اور انقلابی محرکات کی نشو و نما میں رہا ہے"۔ اس کے بعد کے دوسرے خطبہ کے شروع میں فرماتے ہیں: "یہ تو اقبال کا ہر ناقد و محقق جانتا ہے کہ اقبال کی فکر پر مغربی فلسفہ کا گہرا اثر رہا ہے"، لیکن پروفیسر صاحب کے ہم نام سید عبدالواحد نے انگریزی میں اقبال پر جو ایک معرکہ آرا۔ کتاب لکھی ہے اس کے باب چہارم میں " اقبال اور مغربی فکر" کے زیر عنوان اقبال کے افکار کا مغربی فلاسفہ، نٹشے، برگسان، کانٹ اور فشٹے کے افکار سے محققانہ اور تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ہماری بحث سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مغربی مفکرین صرف فشٹے، برگسان اور آئنسٹائن ہیں جن کے افکار اور اقبال کے افکار میں قدرے مماثلت پائی جاتی ہے"۔ (ص ۱۴۴) اور نٹشے، کلام اقبال پر جس کے اثر کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے اس کے متعلق لائق مصنف لکھتے ہیں: "اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اقبال اور نٹشے کے بنیادی افکار و نظریات میں ہرگز کوئی مشابہت نہیں ہے، زندگی سے متعلق دونوں کے نقطہ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔ (ص ۱۳۲)، حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا بنیادی فکر ... فلسفہ حیات و کائنات صرف اور صرف قرآن و سنت، تاریخ اسلام اور تصوف کی

بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے اور اسی لیے ایمان کامل اور یقین محکم، جذب و وجد، سرشاری و مستی، اور بیخودی و ہشیاری یہ سب ایک ساتھ اقبال کے کلام میں رواں دواں نظر آتے ہیں، اس بنا پر اقبال بے شبہ ایک اعلیٰ پایہ کے فلاسفر تھے، لیکن یونان اور مغرب کے فلاسفہ کی طرح نہیں جو اس دولتِ یقین سے محروم تھے، کیونکہ فلسفہ نام ہی اس علم کا ہے جس میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہ کہی جائے، البتہ ہاں اقبال فلسفہ کے طالب علم رہے تھے، اس بنا پر ان کے کلام میں اگر معنی و لفظ کے اعتبار سے کسی مغربی فلسفی کے ساتھ کہیں مماثلت نظر آتی ہے تو اس کو اس مغربی فلسفی کا گہرا اثر کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شاعر دیوانِ غالب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اشعار میں کہیں "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی ترکیبیں بے ساختہ استعمال کر ڈالے تو آپ جھٹ اعلان کر دیں کہ اس شاعر کے کلام پر غالب کے فکر کا بڑا گہرا اثر ہے، پس ہم اس سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتے کہ اقبال کی بنیادی فکر پر مغربی فلسفہ کا گہرا اثر ہے" اقبال کا بنیادی فکر وہ ہے جو "اسرار خودی اور رموز بے خودی" میں یا ضرب کلیم اور بال جبریل میں نظر آتا ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" میں بحث و استدلال کے لیے جو طریقہ کار (Methodology) اختیار کی ہے اس کا ہیولیٰ مغربی فکر سے مستعار ہے، اور انھوں نے خطبات میں مغربی فلاسفہ کے حوالے بھی کثرت سے دیے اور ان کے اقتباسات پیش کیے ہیں، اس کے علاوہ اقبال کے منظوم کلام میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو بعض مغربی شعراء کی نظموں کا ترجمہ یا ان کا چربہ ہیں، یا اقبال نے اپنے اشعار میں بعض مغربی مفکرین پر تنقید بھی کی ہے۔ مثلاً نطشے کو مجذوب فرنگی کہا ہے، پروفیسر سید وحید الدین نے اپنے ان دونوں لکچروں میں ان تمام مباحث پر مختصر سہی مگر بڑی فاضلانہ اور دیدہ ورانہ گفتگو کی ہے، اس لیے اقبالیات کے طالب علم کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔" (س)

(بقیہ صفحہ ...)

عقلمندی ہے، البتہ ہاں اس قطرہ کا حوصلہ قابل رشک ہے جو دریا کی آغوش میں جذب ہو کر لافانی ہو گیا، میں اپنی طبیعت کے اس انداز پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی وجہ سے اب بھی میں اپنے آپ کو ایک ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہوں، اپنے علمی اور عملی نقائص کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہوں، اور خود ... خدمت ... اور ...

برہان

دہلی

جلد نمبر ۸۸، شعبان ۱۴۰۲ھ، مطابق جون ۱۹۸۲ء، شمارہ نمبر ۶

مقالات

نظرات

از ۲۱ تا ۲۳ فروری ۸۲ء تین روزہ "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک سیمینار بڑے طمطراق اور تزک و احتشام کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڑھ میں منعقد ہوا جس میں برصغیر ہند و پاک کے نامور علماء و فضلاء اور اساتذۂ جامعات کے علاوہ عرب اور دوسرے ممالک کے ممتاز ارباب علم و قلم نے بھی شرکت کی، ان حضرات نے مقالات پڑھے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، دار المصنفین کے ارباب حل و عقد نے اس عظیم بین الاقوامی سیمینار کو خاطر خواہ طور پر صوری اور معنوی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لیے جو اہتمام و انتظام کیا اور مہمان نوازی جس دلسوزی، محبت اور توجہ سے کی وہ بے شبہ دار المصنفین کی روایات کے شایان شان اور ان کے عین مطابق تھا، اس اجتماع کی نہایت مفصل روئداد، حسن بیان و زور خطابت کی گلکاریوں کے ساتھ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے قلم سے معارف میں مسلسل شائع ہو رہی ہے اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند گذارشات ہیں جن کا اس موقع پر پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

سیمنار میں جو تقریریں ہوئیں اور جو مقالات پڑھے گئے اگرچہ ان میں بحیثیت مجموعی مستشرقین پر نکتہ چینی اور ان کی مذمت کے ساتھ ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ خدمات کا اعتراف دبی زبان اور ہلکے لب و لہجہ میں کیا گیا اور تنقیص و تہجین کا اظہار بڑے زور شور اور جوش و خروش سے ہوا، ہمارے نزدیک

باوجود مگر ایک ایسے اہم علمی اجتماع کے شایانِ شان نہیں تھا۔ مستشرقین کا معروضی مطالعہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مستشرقین کی ایک فہرست بنائی جاتی اور جن حضرات کو مدعو کیا جاتا ان سے درخواست کی جاتی کہ جن مستشرقین کے کاموں کا انھوں نے جامع اور تحلیلی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے اس کو اس فہرست میں سے منتخب کرلیں اور سیمینار میں اس پر ایک ایسا مقالہ پیش کریں جس میں مستشرقین کی علمی و تحقیقی کاوشوں کے ساتھ اس کی غلط یا غلو بیانیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین کے محاسن اور معائب دونوں بیک وقت اہلِ بزم کے سامنے آجاتے اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا کہ فلاں مستشرق سے فائدہ کتنا پہنچا اور نقصان کس درجہ کا اور کتنا ہوا!

جن مغربی مصنفین نے اسلام پر لکھا ہے، ہمارے خیال میں ان کو دو طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے: (۱) مشنریز یا مبلغین عیسائیت اور (۲) مستشرقین" استشراق ایک تحریک تھی جو اٹلی میں پیدا ہوئی، وہاں سے جرمنی میں پھلی پھولی اور پھر فرانس، برطانیہ، ہنگری، ہولینڈ، امریکہ اور روس تک میں پھیل گئی، جرمنی میں اس تحریک استشراق کا ذکر علامہ اقبال نے پیامِ مشرق کے مقدمہ میں جس انداز سے کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، مذکورۂ بالا دو گروہوں میں سے پہلا گروہ یعنی مشنریز! یہ کھلا ہوا اسلام دشمن طبقہ ہے، اس بنا پر اس کا مقصد ہی اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر چکانی اور دشنام طرازی ہے، ہمارے زمانہ کے مشہور مستشرق پروفیسر گب اور پروفیسر آربیری نے خود بڑی ندامت اور افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے، اب رہے مستشرقین! تو ان لوگوں کے کام کس درجہ متنوع اور کس کثرت سے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ راقم کے قیام کے زمانہ میں جب میں نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو ایک روز میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری گیا وہاں اور چند کتابوں کے ساتھ جرمنی زبان میں ایک

کتاب ملی جو دو جلدوں میں تھی اور اس میں صرف ان مستشرقین کا تذکرہ تھا جنھوں نے جرمنی زبان میں اسلامیات کے کسی موضوع پر لکھا ہے، یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور میں نے قلم رکھ دیا، جو حال جرمنی زبان کا ہے کم و بیش فرانسیسی اور انگریزی زبان کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کارنامے اس کثرت سے ہیں کہ فرد واحد کا ان سب پر حاوی ہونا ناممکن ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے یہ کارنامے حد درجہ متنوع ہیں، لیکن بنیادی طور پر ان کو مندرجۂ ذیل اقسام پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) مستشرقین نے مختلف موضوعات پر ...... سینکڑوں نادر و نایاب مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر بڑی کاوش اور محنت سے اڈٹ کر کے چھاپا اور پورا عالم اسلام ان سے استفادہ کر رہا ہے، (۲) مستشرقین نے عربی زبان کی لغت لکھی، (۳) عربی کتابوں کا ترجمہ کیا (۴) اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر کتابیں لکھیں، (۵) اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ، (۶) عرب و ایران کی تاریخ (۷) اسلام کے مختلف نظام مثلاً معاشرتی نظام، اقتصادی نظام، سیاسی نظام، اسلام کے فنونِ لطیفہ مثلاً فن تعمیر، فن خطاطی، مصوری، برتن سازی وغیرہ ان پر کتابیں لکھیں (۷) قرآن و حدیث کا انڈکس تیار کیا، (۸) انسائیکلو پیڈیا کے دو دو اڈیشن، قدیم اور جدید تیار کیے، (۹) عربی زبان کا علم الالسنہ کی روشنی میں مطالعہ کیا (۱۰) یورپ پر مسلمانوں کے علمی اور تہذیبی احسانات پر کتابیں لکھیں، (۱۱) سیرت نبوی، اس کے مآخذ و مصادر اور اسلام کی تعلیمات پر کتابیں لکھیں، اب غور کیجئے یہ تمام موضوعات و عنوانات خالص علمی اور ان میں سے اکثر سیکولر ہیں یعنی ان پر بحث و گفتگو کے سلسلہ میں مذہب کا کہیں ذکر ہی نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو ضمناً اور برائے نام اور ان پر مستشرقین نے جو داد تحقیق دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب و ایران میں مستشرقین کی ان کتابوں کا ترجمہ ہوا، یہ گویا اس بات کا اعتراف تھا کہ خود عرب و ایران کے علماء و فضلاء اب تک [illegible] تحقیقات پر

جو خود ان کے گھر کی چیز تھے اس درجہ محققانہ سرمایۂ علم پیش نہیں کر سکے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مستشرقین کے ان کارناموں سے اسلامی لٹریچر کے سرمایہ میں غیر معمولی اور نہایت وقیع اضافہ ہوا ہے، تحقیق کی نئی راہیں کھلی ہیں اور ان علوم و فنون کے بہت سے پوشیدہ خزانے ہاتھ آئے ہیں، پھر مسلمان طلباء کو مغربی طرز تحقیق سے آشنا کر کے ان لوگوں نے عالم اسلام میں مسلمان محققین کی ایک ایسی نسل پیدا کی ہے جو اپنے اپنے ملکوں میں آج نہایت عظیم الشان تحقیقی کام اسلامیات کے مختلف موضوعات پر کر رہے ہیں، بے شبہ مستشرقین کی یہ خدمات علمی حیثیت سے مسلمانوں پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا یا منکر ہونا خود اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

ہمارے علماء کی جو عام ذہنیت مستشرقین کے بارہ میں ہے وہ غالب کے اس شعر کا مصداق ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے، مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری نے سیرت نبوی پر اپنی وقیع کتاب اصح السیر کے مقدمہ لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے اڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں رد و بدل کیا ہوگا اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے، مجھ کو یہ پڑھ کر سخت تعجب اور افسوس ہوا اور میں نے اپنے مخدوم مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جو اس زمانہ میں نہایت بلند پایہ محقق ہیں اور ان مخطوطات پر جن کی نظر بڑی وسیع اور عمیق ہے، مولانا نے حسب معمول اور از راہ شفقت بزرگانہ فوراً جواب دیا اور تحریر فرمایا: "طبقات ابن سعد کا اڈیشن جس مخطوطہ پر مبنی ہے، میں نے اسے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے۔"

اس خط سے اندازہ ہوگا کہ مستشرقین نے اڈیٹنگ کا کام کس دیانت داری سے کیا ہوگا

بہرحال مستشرقین کے کارناموں کا یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے جو ان پر گفتگو کرتے وقت کبھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے، لیکن یہ ان کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے، دوسرا رخ، افسوس کی بات ہے، کہیں داغ دار ہے اور کہیں بالکل تاریک ہے، اور یہ وہ موقع ہے جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن و حدیث اور تاریخ و تصوف اسلام کے بعض مباحث و مسائل پر بحث و گفتگو کے بعد نتائج اخذ کرتے اور ان کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ہم امور ذیل پیش نظر رکھیں: (۱) پہلی بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ تمام مستشرقین اس باب میں متفق نہیں ہیں اور سب کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں ایک نہیں ہے، چنانچہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (قاہرہ) جنھوں نے اپنے دو رفقائے کار کی معیت میں پروفیسر اجنز گولڈزیہر کی ایک نہایت اہم کتاب کا ترجمہ جرمن زبان سے عربی میں "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام" کے نام سے کیا ہے کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"مستشرقین میں جہاں ایسے لوگ ہیں جو من مانی بات کرتے ہیں اور اس لیے خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بربنائے جہالت یا علم کے باوجود گمراہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اسی طبقہ میں ایسے حضرات بھی ہیں جو حق بات واشگاف طریقہ پر کہتے ہیں" مصنف کے نزدیک گولڈزیہر کا شمار بھی اسی دوسرے طبقہ میں ہے، چنانچہ آگے چل کر گولڈزیہر کے فضائل و مناقب بیان کرنے کے بعد رقم طراز ہیں: "اپنے ان کمالات و خصوصیات کے باعث ہی گولڈزیہر کا شمار ان اکابر مستشرقین میں ہوتا ہے جنھوں نے بقدر استطاعت اسلام کو، اس کی روح اور اس کی تعلیمات اور اس کے مذاہب کو اور ان عوامل کو جو ان مذاہب (فقہیہ و کلامیہ) کی ایجاد اور ان میں اختلافات کا باعث ہوئے ہیں سمجھا ہے"

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین کے لیے نبوت اور وحی کی حقیقت جو اسلام میں ہے عموماً ناقابل فہم ہے، کیونکہ اگر وہ سمجھ میں آجائے تو پھر وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوجائیں، اس بنا پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ دنیا کے ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم انقلابی شخصیت کی حیثیت سے کرتے ہیں، اس لیے ایک متعصب اور ایک کوتاہ اندیش میں ان دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔

(۳) پھر تیسری بات جو نہایت اہم اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں تاریخ اسلام اور اپنے ادبی مآخذ و مصادر کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے، کون نہیں جانتا کہ تاریخ کے قدیم مآخذ میں رطب و یابس اور صحیح و غلط ہر قسم کی روایات بھری پڑی ہیں، ایک مسلمان اغانی میں غلمان وجواری اور محلات شاہی میں عیش و عشرت کے واقعات پڑھتا یا ابونواس کے دیوان کا مطالعہ کرتا ہے تو شرم سے گردن خم ہوجاتی ہے، علاوہ ازیں واقدی ابن اسحق اور طبری اور یعقوبی وغیرہ کا کیا ذکر! خود احادیث اور بعض تفاسیر خصوصاً تفسیر درمنثور (جلال الدین سیوطی) میں بعض ایسی روایات ملتی ہیں جو ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اور جن سے اسلام کی تعلیمات مجروح ہوتی ہیں، امام بخاری نے الجامع الصحیح میں صحت کا التزام کیا ہے، لیکن ادب المفرد میں نہیں کیا اس لیے اس میں بھی بعض اس قسم کی روایات نے جگہ پالی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بعض روایات کو محض یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت کے منافی ہیں، پھر تصوف کی کتابیں اور صوفیا کے تذکرے بھی ایسے اقوال وملفوظات اور ایسے احوال و مقامات کے ذکر سے محفوظ نہیں ہیں جن کی زد شریعت پر پڑتی ہے، مستشرقین جب ہرزہ سرائی پر آتے ہیں تو یہی روایات ان کا سہارا بنتی ہیں، خوب اچھی طرح یاد ہے جس زمانہ میں ہم لوگ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) میں مقیم تھے سورت کے گجراتی زبان کے ایک ہندو اخبار نے اسلام کے خلاف سخت زہریلے مضامین کا ایک سلسلہ قسط وار

شائع کرنا شروع کیا، جب اس مضمون کی ستر قسطیں شائع ہو چکیں اور حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ الکشمیری کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک طرف تو آپ نے حکومت کو ادھر متوجہ کرکے اخبار پر مقدمہ دائر کرایا اور دوسری جانب اس مضمون کا اردو میں ترجمہ کرانے کے بعد مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور خاکسار راقم الحروف ہم تین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس کا کام اخبار مذکور کے مضمون کو از اول تا آخر پڑھنا اور پھر اس کا جواب تیار کرنا تھا، اب اس تقریب سے بہ زمانہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ مضمون میں اسلام کے خلاف جو باتیں کہی گئی تھیں ان میں سے اکثر باتیں کسی نہ کسی روایت کے حوالہ سے کہی گئی تھیں اور وہ حوالے درست تھے۔

بہرحال اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ دارالمصنفین کے سیمینار میں ایک منظور کردہ تجویز کے مطابق اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مستقل کام کرنے کی غرض سے ایک عالمی ادارہ قائم ہو رہا ہے جس کا سکریٹریٹ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں ہوگا، اور ہر دو برس کے بعد اس ادارہ کی طرف سے ایک بین الاقوامی سیمینار کسی ایک نئے ملک میں منعقد ہوتا رہے گا، چنانچہ اجلاس دوم کے لیے قطر سے اور اجلاس سوم کے لیے پاکستان کی جانب سے دعوت آچکی اور وہ منظور بھی ہو گئی ہے، ہم مندرجہ ذیل گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

(۱) ایک وسیع لائبریری قائم کی جائے جو دنیا بھر کے تمام مستشرقین کی کتابوں اور ان کے مقالات، نیز ان کے مصادر و مراجع پر مشتمل ہو، (۲) ادارہ کے کارکنوں کے دو سکشن ہونے چاہئیں، ایک سکشن کا کام ہوگا مستشرقین کی کتابوں کا پڑھنا اور ان میں جو قابل گرفت چیزیں ہیں ان کی نشان دہی کرنا اور دوسرے سکشن کا کام ہوگا مراجع و مصادر کا مطالعہ کرکے خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر روایات متعلقہ کا تنقیدی جائزہ لینا اور صحت و عدم صحت کے اعتبار سے ان کی حیثیت و نوعیت متعین کرنا (۳) آئندہ جو سیمینار ہوا کریں ان میں غور کیا جائے کہ الگ الگ کسی ایک خاص مستشرق پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی جائے

خدا پرستی اور مادیت کی جنگ

جناب مولانا سید کاظم صاحب نقوی ریڈر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

یہ بدنظمیاں کیوں اور کس لیے ؟ کہا جاتا ہے کہ یہ وسیع اور عظیم دنیا ویسی منظم اور مرتب
ہیں ہے جیسا کہ خدا پرستوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے ۔ اس عالم رنگ و بو کے گوشہ
کنار میں بہت سی چیزیں ایسی دکھائی دیتی ہیں جن کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے
علاوہ اس دنیا میں بدنظمیاں بھی موجود ہیں جو صاف صاف بتا رہی ہیں کہ اس عالم کے
وجود میں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے کسی غرض کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی صاحب عقل ہستی نے
دنیا کی ان تمام چیزوں کو اپنے ارادے اور اختیار سے نہیں پیدا کیا ہے ۔

اس اعتراض کو مادہ پرستوں نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً جرمن سائنسدان
ڈاکٹر بوخنر (BOCHNER.) اس اعتراض کو مندرجۂ ذیل لفظوں میں ذکر کرتے ہیں۔

"اگر مختلف قسم کے موجودات مثلاً انسان اور جانور کے رہنے کی جگہ وجود میں
لانا کسی باشعور پیدا کرنے والی طاقت کے ذمّے ہوتی۔ اس کے قدرت و
اختیار کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا ہوتا تو یہ وسیع فضا جو ہر چیز سے خالی ہے
قابل استفادہ عنصر سے محروم ہے اور اسے مختلف کواکب و سیارات اپنی سیر
و تفریح کا میدان بنائے ہوئے ہیں کس مقصد کے لیے خلق ہوئی اور اس کا کیا
فائدہ ہے ؟ منظومۂ شمسی کے دوسرے کروں سے زمین کے کرۂ سکون کے
مقابلہ کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟" (انتفاق العلیم)

بعض دوسرے منکرینِ خدا اسی غلط فہمی میں اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمین کی گہرائیوں میں۔ اندھیرے غاروں میں ایسے جانور دکھائی دیتے ہیں جن کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے چہروں پر دو ننھی آنکھیں موجود ہیں جن کا ان کی زندگی میں یقیناً کوئی اثر نہیں ہے۔ اسی طرح انسان یا بعض دوسرے حیوانات کے جسموں میں ایسے اعضاء نظر آتے ہیں جو بے ضرورت ہیں۔ ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ منجملہ ان کے مردوں کے سینے پر دو چھوٹے چھوٹے نشان موجود ہیں جن کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ان کی زندگی میں ان نشانوں کا کوئی اثر ہے۔" (عرفان و اصول مادی)

یہ اعتراض چند رخوں سے قابلِ بحث ہے:

۱۔ **تضاد گوئیاں** حقیقت یہ ہے کہ مادیین کی باتوں میں کھلا ہوا تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف یہ حضرات فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ عالم از سر تا پا کچھ مادی اصول کا پابند ہے۔ اس میں کوئی غیر منظم چیز دکھائی نہیں دیتی ہے اس لیے ان نیچرل قوانین اور ضوابط سے بالاتر کسی طاقت کو وجود نہیں مانا جا سکتا۔ لیکن مذکورۂ بالا اعتراض میں آپ دیکھ رہے ہیں وہی حضرات اس کے بالکل برعکس فرما رہے ہیں کہ دنیا میں ہمیں بدنظمیاں نظر آتی ہیں لہٰذا کوئی صاحب عقل و اختیار۔ علیم و حکیم ذات موجود نہیں ہے۔ یہ بدنظمیاں اس طرح کی طاقت کو ماننے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔

اس بنا پر مادہ پرست طبقہ یا یہ تسلیم کرے کہ عالم سر سے پیر تک منظم اور مرتب ہے۔ ناقابلِ تبدیل اصول اور قوانین اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس صورت میں اسے موجودہ اعتراض سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ وہ اگر موجودہ اعتراض پر مصر رہنا چاہتا ہے تو اس کو خیرباد کہنا ہوگا جو ہر ایک ان لوگوں کی زبانوں پر آتی رہتی ہے۔ مگر یہ کہ آئندہ اس کی بابت بھی کچھ گفتگو کی جائے۔

۲۔ **بصیرت سے کام لیجیے** ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کسی چیز کے مفید یا غیر مفید ہونے کا

معلوم کیسے کر حاصل ہوتا ہے؟ اس بات کا معیار کیا ہے؟ مثلاً کس طرح ہم سمجھیں کہ مردوں کے سینے کے اوپر جو نشانات ہیں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے یا ان کے علاوہ بہت سے کتنے بے فائدہ ہیں۔؟

یقیناً مادّیین کی طرف سے اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ چونکہ ہمیں ان چیزوں میں کوئی فائدہ نہیں نظر آتا ہے لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ وہ غیر مفید ہیں۔ کسی چیز میں فائدہ ہونے اور نہ ہونے کا معیار ہماری تشخیص ہے۔

ان حضرات سے ہماری عرض ہے کہ پھر آپ یہ نہ کہیے کہ مردوں کے سینہ کے نشان یا فلاں غار نشین جانور کی بے نور آنکھیں غیر مفید ہیں۔ اب یوں فرمائیے کہ ہم نے ان میں کوئی فائدہ نہیں پایا اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہم ان کے فائدے سے بے خبر ہیں حقیقتاً مادہ پرست اگر معقولیت سے کام لیں تو انھیں "نہیں ہے" کے بجائے کہنا چاہیے "ہم نہیں جانتے" اور "ہم ناواقف ہیں"

اس بنا پر اب اعتراض کی صورت بدل گئی۔ وہ نفی مطلق کے درجہ سے اتر کر عدم علم کے درجہ میں آگیا۔ اب یوں کہا جائے گا کہ دنیا کے بہت سے موجودات میں ہم نے کوئی فائدہ نہیں دیکھا یا ہم ان کے مفید ہونے سے ناواقف ہیں۔

۳۔ انسانی علم کی قیمت | اب جبکہ بات کھنچ کر یہاں تک پہونچ گئی ہے تو چند سوال پیش آتے ہیں:

الف۔ انسانی علوم اور معلومات محدود ہیں یا غیر محدود؟

ہر شخص کہے گا کہ انسانی علم محدود ہے۔ انسان کے معلومات کی تعداد مجہولات کی تعداد کی بہ نسبت بہت کم ہے۔

ب۔ آیا ہم ان محدود معلومات کے ذریعہ تمام چیزوں کو جانتے ہیں؟ کیا ہمیں معلوم ہے کہ آسمانوں کی بلندیوں میں کیا ہے؟ زمین کی تہوں اور سمندروں کی گہرائیوں کے اندر کیا چیزیں

ہیں ؟

ابھی اس کا جواب بھی معلوم ہے۔ کیونکہ محققین اور بڑے بڑے سائنسدان صریحاً کہتے ہیں کہ ہمارے معلومات مجہولات کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔

ہم سے سب سے نزدیک خود ہماری ذات ہے۔ تمام چیزوں کی بہ نسبت سب سے قریب ہماری زندگی ہے لیکن اب تک نہیں پتہ چل سکا کہ انسان کیا ہے اور ہماری حیات کی کیا حقیقت ہے۔؟

کیا زندگی اسی کیمیکل تاثیر و تاثر اور جسمانی خلیوں کے فزیکل افعال کا نام ہے؟ اگر نہیں تو پھر زندگی کی ماہیت کیا ہے؟ بہرحال اس حیات کی کچھ ایسی حقیقت ہے جواب تک واضح نہیں ہوئی ہے۔ فرانسیسی دانشور ڈاکٹر کیرل (ALEXIS CARREL) نے اپنی کتاب میں ایک مستقل عنوان "لازم است کہ خود را بشناسیم" قائم کر کے لکھا ہے۔

"جو علوم تمام زندہ موجودات کے متعلق عموماً اور انسان کے متعلق خصوصاً بحث کرتے ہیں ابھی زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ وہ اس وقت مرحلہ توصیفی میں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک راز اور معمہ ہے جسے آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی ایسے ذرائع نہیں موجود ہیں جن کی مدد سے انسان کے جزئیات کا پورا مطالعہ کیا جا سکے۔ یہ دیکھا جا سکے کہ بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے کیا تعلقات ہیں"

کچھ آگے بڑھ کر پھر ڈاکٹر کیرل رقم طراز ہیں:

"واقعہ اپنی ہستی سے ہماری ناواقفیت بہت زیادہ ہے۔ ہماری اندرونی دنیا کے بہت وسیع پہلو ابھی اندھیرے میں ہیں۔ انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی تحقیق کرنے والے جو سوالات قائم کرتے ہیں ان میں سے اکثر لا جواب رہ جاتے ہیں۔" (کتاب "انسان موجود ناشناختہ")

ج۔ آیا انسانی علوم اپنے کمال کے آخری نقطے تک پہنچ گئے یا ابھی راستے میں ہیں؟

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے۔ کیونکہ انسانی علوم ہمیشہ تغیر و تبدل کے عالم میں اور برابر ترقی کر رہے ہیں ہر سال۔ ہر مہینے۔ ہر روز بلکہ ہر گھنٹہ وہ ایک نئی منزل میں قدم رکھتے ہیں۔ روز بروز اور لحظہ بلحظہ انسانی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

۵۔ آیا جو باتیں اب تک منکشف ہو چکی ہیں ان کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی؟ کیا یہ باتیں مفروضے کے طور پر بھی تسلیم کرنے کے قابل تھیں؟ مثلاً پانچ سو سال پہلے کئی ٹن کا راکٹ آسمان کی طرف پھینکنا۔ زمین کی قوت جاذبہ کے حدود سے اس کا نکلنا اور چاند کے گرد چکر لگانا۔ پھر رفتہ رفتہ ایسے راکٹ بن جانا جو چاند کی گود میں بیٹھ کر وہاں کے تمام خصوصیات کے نوٹو لے کے زمین کی طرف از خود روانہ کر دیں انسان کے تصور کے قابل تھا؟ آیا ان ننھے ننھے مفید اور مضر جراثیم کی موجودگی۔ اس منظومہ شمسی کے علاوہ دوسرے منظومات۔ اس ہماری کہکشاں کے علاوہ دوسری کہکشاؤں کی موجودگی سے انسان با خبر تھا؟

یقیناً ان سوالات کا جواب بھی نفی میں سنیے گا۔

۶۔ کیا مادہ پرست طبقہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ممکن ہے سو برس کے بعد ایسی باتوں کا پتہ چلے۔ ایسی چیزیں انسان کے علم میں آئیں جن کی بنا پر اُس دور کے انسان کی حالت ہمارے لحاظ سے وہی ہو جو ہماری حالت ہزار سال قبل کے لحاظ سے۔ البتہ ہر معقول آدمی کہے گا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ آج پچاس برس بعد کے متعلق ایسی پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں جنھیں سُن کر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ سو سال یا ہزار سال کے بعد انسان کیا کرے گا؟ اسے خدا ہی جانتا ہے۔

یہاں تک ہم صرف سوالات کرتے رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ یہ حقیقت سب کے سامنے آ گئی کہ ہمیں حق نہیں کہ جس چیز کو ہم نہ جانیں اور نہ سمجھیں اس کے متعلق کہہ دیں کہ وہ نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ ناقص۔ محدود علوم جس کی وضاحت نہ کر سکیں اُسے ہم بے اثر قرار دے دیں۔ کیا تمام علوم ہمارے ہاتھوں میں دے دیے گئے ہیں؟ کیا کوئی نامعلوم چیز باقی نہیں رہ گئی ہے تاکہ یقین کے ساتھ کسی چیز کے بے فائدہ ہونے کا ہم فیصلہ کر دیں؟ کیا انسان اپنے

ان محدود معلومات کے باوجود ہر چیز کو سمجھ گیا ہے؟ کیا اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ اس اعتراض میں ذکر شدہ موجودات کے فوائد اور مقاصد کا مستقبل میں پتہ چل جائے؟

آیا ان چیزوں کا انکشاف اہم ہے یا ایٹمی طاقت کا انکشاف؟ ہماری کہکشاں کے علاوہ دوسری کہکشاؤں کا انکشاف؟ عالم پیمار اکٹوں کا انکشاف؟ یہ مسئلہ بالکل ویسا ہی ہے کہ کسی بیابان میں ہمیں ایک شاندار قصر دکھائی دے عمارت کا ہر حصہ، ہر چیز نہایت موزوں۔ انتہائی سلیقہ کا نمونہ نظر آئے۔ لیکن عمارت کے کسی گوشے میں ایک کھڑکی یا لکڑی کا ایک ٹکڑا نصب ہو جو بظاہر بے فائدہ، بے مقصد، بے تسمیہ ہو۔

کیا عقل و ضمیر ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اس عظیم عمارت کو نتیجۂ اتفاق قرار دے دیں اور اس کا شاہد اسی بے ربط کھڑکی یا ناموزوں لکڑی کے ٹکڑے کو بنایا جائے؟ کیا ہمیں حق ہے کہ بظاہر اس بے ربط کھڑکی کو واقعاً بے فائدہ کہیں یا ہمارا فرض ہے کہ اس کے فائدے اور مقصد کی کھوج میں لگے رہیں؟ کیا صرف ان دو چیزوں کو دیکھ لینے کی وجہ سے اس قصر کے اردگرد کے راستوں، اس کے باغیچہ کی منظم روشوں، وہاں کی باقاعدہ کیاریوں، حسین اور مرتب درختوں۔ عمارت کے بلند اور مستحکم ستونوں، اس کے اصول کے مطابق کمروں اور ان کے دروازوں کی طرف سے منظم روشنی کرتے ہوئے سب کو خود بخود چلتی ہوئی ہواؤں، تیز موسلا دھار بارشوں، کبھی کبھار آنے والے زلزلوں کی غیر اختیاری کارگزاری مان لیا جائے گا؟ کہاں ہے عقلِ سلیم و منصف مزاج انسانی ضمیر؟

۴۔ دلچسپ اعترافات | ہماری گذارش کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے ان محدود معلومات کی ان روز بروز ترقیوں کے ساتھ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم چیز سے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض چیزوں کے بے فائدہ ہونے کا فیصلہ کر دیں۔ کیا سائنسدان خود

اقرار نہیں کرتے ہیں کہ تمام علوم ابھی کمال کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ روز بروز نامعلوم باتوں کے چہرے سے پردہ ہٹ رہا ہے؟

آئن اشٹائن (Einstein) کا کہنا ہے۔

"معمائے خلقت ابھی حل نہیں ہوا ہے، یہاں تک کہ اطمینان نہیں پیدا کیا جا سکتا کہ آخر کار یہ گتھی سلجھ جائے گی، اب تک ہم نے جتنی نیچر کی کتاب پڑھی ہے اس نے ہمیں بہت سی چیزیں سکھائی ہیں، ہم اس کی زبان کے اصول سے آشنا ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ ان بہت سی جلدوں کے مقابلے میں جو پڑھی اور سمجھی جا چکی ہیں ابھی مکمل حل اور انکشاف سے ہم بہت دور ہیں۔" (خلاصۂ فلسفۂ آئینسٹین)

کیمیل فلیماریَن (Camille Flamarion) کہتے ہیں۔

"ہم سوچتے ہیں۔ مگر یہی سوچنے کی قوت کیا ہے؟ ہم راستہ چلتے ہیں مگر یہ ہمارے عضلات کا عمل کیا ہے؟ کوئی شخص ان باتوں کو نہیں جانتا۔ میں اپنے ارادے کو ایک غیر مادی طاقت سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود جب ہاتھ کے اونچا کرنے کا ارادہ کرتا تو دیکھتا ہوں کہ وہ غیر مادی ارادہ میرے ہاتھ کو جو ایک مادی عضو ہے حرکت دیتا ہے، یہ آخر کیونکر ہوتا ہے؟ وہ چیز کہ جس کے واسطے سے اس میری غیر مادی طاقت کا نتیجہ مادی ہوتا ہے کیا ہے؟ کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو اس کا جواب دے...... اے لوگو! مجھے جواب دو لیکن یہ ممکن ہے کہ میں دس برس تک سوال کرتا رہوں اور تم کسی بات کا جواب نہ دے سکو۔" (القویٰ الطبیعیۃ المجہولۃ)

ولیم جیمز (William James) کے الفاظ ہیں:

"ہمارا علم قطرے کے مانند اور ہماری جہالت سمندر کے مانند ہے، فقط جو بات

تاکیدی طور پر کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ مادی معلومات کی دنیا گھری ہوئی ہے ایک زیادہ وسیع دوسری قسم کے عالم سے جس کے خصوصیات کا اب تک ہم پتہ نہیں چلا سکے ہیں" (نمود ہائی روحی)

فرانس کے طبیہ کالج کے ایک فرانسیسی پروفیسر کا قول ہے:۔

"انسان کے موجودہ علوم کا نہایت احترام کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ اس امر کا بھی ضرور یقین رکھنا چاہیے کہ موجودہ علوم جتنی بھی زیادہ وسعت حاصل کرلیں پھر بھی نمایاں نقائص ہمیشہ رکھتے ہیں"

اس کے بعد موجودہ علوم کے تاریک نقطوں کی متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اگر ایک بربری، ایک مصر کے کاشتکار، ایک روس کے دیہاتی سے نیچر کی دنیا کے متعلق اس کے معلومات کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ ان باتوں کا دسواں حصہ بھی نہیں جانتا ہوگا جو ابتدائی کتابوں میں لکھی جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن آئے گا جب ہمارے زمانے کے پڑھے لکھے ان کے مقابلے میں ویسے ہی ہوں گے جیسے دیہاتی لوگ فرانس یونیورسٹی کے پروفیسروں کے سامنے"

اس کے بعد اس بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے کہ ہمارے علوم نیچر کے ظاہری حالات کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہیں۔ نیچر کے راز اور اسباب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ وہ اس بحث کے آخر میں مندرجہ ذیل جملے لکھتے ہیں:۔

"حقیقی سے تسدان وہ ہے جو بیک وقت بہادر اور منکسر مزاج دونوں ہو منکسر مزاج اس لیے کہ ہمارے معلومات بہت تھوڑے ہیں۔ بہادر اس لیے ہو کہ ہمارے سامنے نامعلوم دنیاؤں تک پہنچنے کے واسطے دروازے کھلے ہوئے ہیں" (مقدمہ کتاب نمود ہائی روحی)

۵۔ کیا ساری کائنات صرف ہمارے لیے ہے؟ تعجب کی بات ہے کہ ہم نے ہر چیز کا معیار اپنی

ذات کو قرار دے لیا ہے۔ جس شی کو اپنے لیے مفید نہیں پاتے اسے لغو اور فضول قرار دے دیتے ہیں۔ کیا تمام عالم ہمارے لیے پیدا کیے گئے ہیں؟ یہ منظومات شمسیہ۔ یہ کہکشائیں سب ہمارے واسطے وجود میں آئی ہیں؟ کیا کسی چیز کے مفید ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ اس سے انسان کو فائدہ پہنچے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان وسیع کروں اور مستقل دنیاؤں میں وہاں کے ماحول کے مناسب کچھ زندہ موجودات ہوں کہ جن سے ہم ابھی بے خبر ہیں؟ یہ وسیع فضائیں ان کے لیے فائدہ بخش ہوں۔؟

نہایت افسوس کی بات ہے کہ وہ انسان جس کی نسبت ان تمام موجودات سے وہی ہے جو ایک صفر کی نسبت غیر محدود عدد سے ہوتی ہے، وہ انسان کہ جو عالم کے ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے اتنا خود خواہ اور مغرور ہو جائے کہ اپنی ذات کو عالم وجود کا مقصد اعلیٰ سمجھنے لگے۔ تمام موجودات کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار اپنی معمولی سی شخصیت کو قرار دے لے اور مادہ پرست لوگوں کی طرح کہنے لگے کہ چونکہ آسمانوں کی یہ وسیع فضائیں میری جولانگاہ نہیں ہیں اس لیے ان کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اگر ایک چھوٹی سی چڑیا دنیا کے کسی بہت کپڑا تیار کرنے کے کارخانہ کے اوپر سے اڑتی ہوئی گزرے، وہ اپنے دل میں سوچے کہ اس کارخانے کا بنانے والا کتنا بیوقوف تھا آخر اس کارخانے سے مجھے اور میری جیسی دوسری چڑیوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ یہ کپڑے کے لمبے لمبے ہزاروں تھان کس کام کے، ان سے میں کیا فائدہ اٹھا سکتی ہوں؟

کیا چڑیا کے ان خیالات پر آپ نہیں ہنسیے گا؟ کیا اس کی باتیں آپ کی نظر مبارک میں صحیح ہیں؟ اگر ایک چیونٹی فولاد یا لوہے کا عظیم الشان کارخانہ دیکھ کر تعجب کرے، اس کے بنانے والے کا مذاق اڑائے اور کہے کہ یہ تمام بڑی چھوٹی مشینیں بیکار ہیں یہ تمام ساز و سامان فضول ہے کیونکہ اس سے میری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس سے میری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو کیا اس [illegible] مادہ پرست طبقہ کے نزدیک اس کی

معیار میں معقول ہوں گی۔؟

آخر انسان بلا وجہ اپنے کو کیوں اتنا اہم اور با عزت سمجھتا ہے؟ کس لیے اپنے آپ کو طفیل جاننا اور خود کو ہر چیز کے با مقصد یا فائدہ ہونے کا واحد معیار قرار دیتا ہے؟

۹۔ کیا اس ایک پر سب قربان؟ بالفرض اگر ہم مان لیں کہ دنیا میں بعض چیزیں غیر منظم اور بے مقصد ہیں، ایسے نظر آتے ہیں جن کے وجود کا کوئی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ تسلیم کرلیں کہ نہ صرف بعض چیزیں بلکہ پورے عالم پر بدنظمی چھائی ہوئی ہے۔ جدھر بھی نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں نظم وضبط کے بجائے بدنظمی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس درہم برہم عالم کے ایک کونے میں، ان تمام بدنظمیوں کے درمیان ایک سبز وشاداب پودا، ایک چھوٹا سا جاندار جسے خوردبین کے ذریعہ بمشکل دیکھا جا سکتا ہے، ایک صحیح وسالم آنکھ، ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک سنتا ہوا کان ہو۔

ہم حساب احتمالات (Probability) اور ضمیر انسانی کے فیصلے کے ذریعہ ثابت کرسکتے ہیں کہ یہی ایک عدد منظم اور مرتب چیز اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اسے کسی باشعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی مرتب اور منظم چیز کی بابت یہ دعویٰ کرے کہ اس کا نظم وضبط اتفاقی طور پر ہے تو اس کا غلط ہونا حساب احتمالات کی مدد سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

یہ اس وقت عرض کیا جائے گا جب کہ عالم کی اکثر چیزوں میں بدنظمی دکھائی دے۔ صرف اکا دکا چیزیں منظم، مرتب، با قاعدہ، با فائدہ اور نتیجہ خیز دکھائی دیں لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے، یہ عالم سر سے پیر تک منظم ہے، جہاں کہیں ہم نظر ڈالیں چھوٹے سے چھوٹے ذرّوں سے لے کر بڑے سے بڑے آسمانی کُروں تک ہر چیز حیرت انگیز نظم وضبط کی مالک معلوم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر بعض ساکنین ارض کے خیال کے مطابق عالم کے کسی گوشہ میں [illegible] نظر آئے تو کیا اس کے علاوہ تمام چیزوں میں جو منظم

قریب میں سمجھتے ہے اس سے آنکھیں بند کر لی جائیں گی۔؟ ان سب کو اس ایک پر قربان کر دیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ آپ کے سامنے ایک کتاب آئی، آپ نے دیکھا کہ وہ نہایت گہرے معنی خیز مطالب پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی کے ایک مقام پر کچھ جملے دکھائی دیے جو آپ کی نظر میں کوئی مفہوم نہیں ہے۔ انصاف سے فرمائیے کہ اس کتاب کے متعلق آپ کیا فیصلہ کریں گے۔؟

کیا آپ ان تمام گہرے مطالب سے چشم پوشی کرتے ہوئے جو ایک اونچے دماغ اور وسیع معلومات کا پتہ دے رہے ہیں اس کتاب کے لکھنے والے کو نافہم۔ جاہل قرار دے دیجیے گا جس نے بلا کسی مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے قلم ہاتھوں میں لے کر کاغذ پر لکیریں بنانا شروع کر دی ہیں؟ کم از کم یہی فیصلہ جو آپ اس کتاب کے بارے میں کیا اس عالم وجود اور اس کے موجودات کی بابت بھی براہ مہربانی فرمائیے۔

۷۔ بے نظمی کے ذریعہ نظم وضبط کا تعارف آخری بات اس اعتراض کے سلسلے میں یہ ہے کہ عام طور سے ہم ہر چیز کے وجود کو اس کے عدم سے سمجھتے ہیں، جب تک کوئی چیز معدوم نہ ہو جائے اس کے وجود کی طرف کمل طور سے انسانی ذہن متوجہ نہیں ہوتا ہے، یعنی کسی چیز کے وجود کی جانب توجہ اور اس کا علم اس کے یا اس کے مانند اشیاء کی نیستی کے ذریعہ ہوتا ہے، اگر اس طرح کے موازنے کا موقع نہ ملے تو وجود کا جاننا دشوار بلکہ بعض اوقات غیر ممکن ہو جائے گا۔ اگر ہمیشہ دن رہے، کبھی رات نہ ہو تو حقیقت نور کا تصور مشکل کام ہوگا، اگر تمام افراد انسانی ہمیشہ صحیح وسالم رہیں، کبھی کوئی بیمار نہ پڑے تو ہمارے نزدیک تندرستی کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا، اگر ہماری زمین ہمیشہ ساکن رہتی تو اس کے سکون کو ہم محسوس نہیں کر سکتے تھے، یہ تمام حقیقتیں اندھیرے، بیماری، زلزلے کے ذریعہ نمایاں ہوئیں، ایک سفید کپڑے یا کاغذ پر سیاہ نقطہ اس غرض سے بنا دیا جاتا ہے کہ کپڑے یا کاغذ کی غیر معمولی سفیدی آنکھوں کو محسوس ہو۔

اچھا ہم نے مان لیا کہ جو چیزیں ہمیں بے فائدہ نظر آتی ہیں وہ واقعاً بے فائدہ ہیں۔

یہ بدنظمی جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں حقیقتاً نظم ہے۔ کیا اس صورت میں یہی فائدہ کافی نہیں ہے کہ ہم اس بدنظمی سے نظم کی موجودگی کا پتہ چلائیں؟ اس سے بڑا کونسا فائدہ ہو سکتا ہے کہ نظم عالم کے نمایاں کرنے کے لیے عالم کے کسی گوشے میں کوئی ایسی چیز رکھ دی جائے جو بظاہر بے فائدہ اور بے مقصد ہو، ان غیر منظم یا غیر مفید موجودات کو دیکھ کر نظم اور فائدے کا مفہوم سمجھ میں آئے، انھیں دیکھ کر ہمیں یہ سوچنے کا موقع ملے کہ اگر تمام موجودات بے فائدہ ہوتے، تمام جانداروں کی آنکھیں بے نور ہوتیں، انسان کا جسم از سرتا پا ایک فضول عضو ہوتا تو واقعتاً پھر کیا ہوتا؟ اور اب جبکہ ایسا نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگر دنیا میں اندھی آنکھ یا کوئی غیر مفید جزو جسم نظر نہ آتا تو کیا اس نظم عالم کی حقیقت مکمل طور سے نمایاں ہوتی اور ہم صحیح طریقے سے اس حقیقت کو سمجھ سکتے تھے؟

ان اِکا دُکا بدنظمیوں سے اس عظیم حقیقت کا ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس عالم میں کوئی ہستی موجود ہے جس نے اس نظام کو قائم کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ یہ نظم خود بخود تمام عالم میں حکم فرما ہو گیا ہو بلکہ ایک غیر معمولی طاقت نے اپنے علم و ارادے سے اس عالم کو نظم و فائدے کے زیور سے آراستہ کیا ہے، اس نے ہر چیز کو مفید اور با مقصد قرار دیا ہے وہ جب چاہے اُسے بے فائدہ اور بے مقصد بنا دے۔

بعض مادیین کہتے ہیں کہ عالم کو قہراً منظم ہونا چاہیے، نظم و ضبط عالم کے لیے ضروری اور اس کی لازمی خاصیت ہے۔

ہماری عرض کی ہوئی باتوں سے پتہ چلا کہ یہ بات ایسے لوگوں نے کہی ہے جو بدنظمی کا تصور نہیں کر سکے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے نظم و ضبط کو عالم وجود کی لازمی خاصیت قرار دیا ہے۔ لیکن بظاہر غیر منظم موجودات کا مشاہدہ انھیں بتا دے گا کہ نظم عالم وجود کا لازمہ نہیں ہے، وہ ایک قدرت اور ارادے کی پیداوار ہے جس نے پورے اختیار کے ساتھ اسے ایجاد کیا ہے۔

پیشوایان اسلام کے ارشادات میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ موجود ہے، بعض اوقات نومولود بچوں کے جسموں میں بعض اعضاء زائد یا کم ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق نے اس کا راز بیان کرتے ہوئے وہی بات فرمائی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو توحید مفضل)

ایک اعتراض:

یہاں صرف ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ بدنظمی موجودات کی صرف ایک قسم میں نظر آتی ہے۔ مثلاً تمام مردوں کے سینہ پر ایک دوسرے سے مشابہ نشانات ہوتے ہیں۔

جواب:

گذشتہ باتیں نظر میں رکھتے ہوئے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یہ بدنظمی ایک خاص مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وجود میں آئی ہے۔ اس بدنظمی میں مکمل طور سے نظم و ضبط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس بدنظمی کو خاص مقامات پر مخصوص موجودات میں ہونا چاہیے تاکہ اس سے وہ نتیجہ اور مقصد حاصل ہو جسے اس کے وجود میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس بدنظمی کا سرچشمہ درحقیقت وہی نظم ہے اور یہ اسی کا پتہ دیتی ہے۔

یہ ویسا ہی ہے کہ کسی کاپی اور رجسٹر کے کاغذ کی انتہائی سفیدی اور عمدگی کو بتانے کے لیے اس کے ہر صفحے کے اوپر ایک خوبصورت سا نقطہ بنا دیا جائے، چونکہ ایسے ہر نقطے [illegible] پر منظم طور سے بنایا گیا ہے لہٰذا نقطے [illegible] نہیں بنایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر یہ نقطے غیر منظم ہوں، ہر صفحے پر ایک جگہ، ہر نقطے کی صورت دوسرے نقطے سے مختلف ہو تو کیا یہ گمان نہ ہوگا کہ وہ اتفاقاً بلا کسی مقصد [illegible] ملحوظ رکھتے ہوئے ان صفحات پر بن گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ بدنظمی اس وقت نظم و [illegible] کی طرف راہنمائی کر سکتی ہے جبکہ منظم ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام گفتگو اس فرض کی صورت میں ہے کہ جن چیزوں کو ہم غیر منظم

بکھر رہے ہیں وہ واقعاً غیر منظم ہوں۔ لیکن ہمارے گزشتہ اور آئندہ بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوئی اور واضح تر ہو گی کہ ہمیں کسی طرح اس کا حق نہیں ہے کہ ہم اس طرح کی چیزوں کو اس عالم وجود میں بد نظمی کی مثال قرار دیں۔

ان تباہ کاریوں کا کیا جواب ہے؟ پرانے زمانے سے خدا کے بعض ماننے والوں کو ایک چیز نے متزلزل بنا رکھا ہے۔ مادہ پرستوں نے بھی اسے اپنا ایک مؤثر اور کارگر حربہ اپنے الحادی پروپیگنڈے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ وہ زمین اور آسمان کی آفتوں اور بلاؤں کا مسئلہ ہے۔

یہ اعتراض نیا نہیں ہے قدیم زمانے سے بحث اور گفتگو کا مرکز ہے بعض گزشتہ فلاسفہ کے اقوال میں بھی ملتا ہے، وہ کہتے ہیں:

"اگر عالم کا ایک علیم و حکیم خالق ہے، اگر دنیا کی ہر چیز میں اسرار اور حکمتیں موجود ہیں تو کیوں کبھی کبھی ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو علم و حکمت کے بالکل خلاف ہیں؛ جن کا نتیجہ مفاسد اور نقصانات کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جیسے زلزلے، گوناگوں بلائیں، طرح طرح کی آفتیں، مختلف قسم کی متعدد بیماریاں ان کی وجہ سے یہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی جانیں تلف ہو جاتی ہیں، کبھی ایک زلزلہ بڑے بڑے شہروں کو زیر و زبر کر دیتا ہے، ایک وبائی مرض سینکڑوں آدمیوں کی جان لے لیتا ہے، پہاڑ کے دامن سے سیلاب ابھر آتا ہے اور نہ جانے کتنی آبادیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ آندھی کے جھکڑ چلتے ہیں اور ناقابل تلافی نقصانات کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اگر عالم ہستی کا انتظام ایک علیم و حکیم خدا کے ہاتھوں میں ہے تو اس عالم کی صورت کو موجودہ شکل سے بہتر ہونا چاہیے تھا نہ آفتیں اور بلائیں آتیں، نہ خونریزیاں ہوتیں، نہ طرح طرح کی بیماریاں ہوتیں، نہ جہالت ہوتی نہ ناکامی، اس دنیا کو ہر نقص اور ضرر سے پاک ہونا چاہیے تھا۔"

اس کے اور گزشتہ اعتراض کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، دونوں کا سرچشمہ

[illegible] - اس بنا پر جو جوابات گذر چکے ہیں وہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ [illegible] ہوں گے۔ اس کے ساتھ مناسب ہے کہ اس بارے میں کچھ زیادہ وضاحت کر دی [illegible] کیونکہ یہاں پر لوگوں کے پیر بڑی شدت سے پھسلتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ طوفان آیا، اس نے بہت سے لوگوں کی زندگی کو عدم کے سپرد کر دیا، ہمیں اس کی وجہ سے سوائے ضرر اور نقصان کے کچھ نظر نہ آیا، لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ جس عالم کے ایک انتہائی چھوٹے سے ذرّے میں اپنے محدود اور سطحی معلومات کے ساتھ ہمیں بہت سے حیرت انگیز اسرار و رموز نظر آئے ہوں ہم باآسانی اس طوفان کے متعلق فیصلہ کر دیں؟

ذرا غور فرمایئے کہ آپ کس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ہم اس دنیا میں رہتے ہیں جہاں تمام جانداروں کے جسم کی ایک بافت (خلیہ) جس کی لمبائی فقط ۱/۱۰۰ ملی میٹر ہے ۲۲ دھاتوں سے مل کر بنی ہے جن کا باہمی تناسب اور توازن حیرت انگیز ہے، یہ ایک ننھی سی زندہ بافت قوت جاذبہ اور قوت دافعہ دونوں کی مالک ہے، اس کے پاس ہضم کرنے اور غذا کو جزو بدن بنانے کا پورا ساز و سامان بھی موجود ہے، وہ اتنے بڑے لحیم شحیم آدمی سے بہت جلدی اپنا مانند بھی پیدا کر سکتی ہے، ہم اس عالم میں سانس لیتے ہیں جس کے ہر ہر گوشے میں ایک ہمہ گیر نظام کے انوکھے نمونے سامنے آتے ہیں، ایسے عظیم الشان عالم میں کیا یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک سرسری نگاہ کر کے وہاں کے حادثوں کی اصلی وجہ سے بے خبری کے باوجود انھیں سرے سے مضر قرار دے دیں؟ کیا ہمیں کچھ بھی پتہ ہے کہ اس طوفانی ہوا نے اس وقت سے جب یہ ہلکی پھلکی نسیم سحری کی صورت میں کسی دور دراز مقام سے چلی تھی، اب تک اپنے دوران سفر میں کیا خدمات انجام دی ہے؟ کیا کوئی جانتا ہے کہ وہ اپنے جانے کے [illegible] کیا اثرات چھوڑ جائے گی جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے؟ خلاصہ یہ کہ ماضی اور مستقبل میں پوری دنیا کے اسباب اور نتائج کے مکمل سلسلے کی کیا ہمیں خبر ہے تاکہ ان کے فائدے اور نقصان کی بابت ہم فیصلہ کر سکیں؟ کیا تمام

جہالت سے حجابات نے بے نقاب ہو گئے ہیں؟ کسی چیز کے چہرے پر جہالت کا پردہ نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اپنے کو اس فیصلے کا حق دار سمجھیں؟ آیا انسانی علم و تحقیق برابر ترقی اور کمال کا راستہ نہیں طے کر رہا ہے؟ کیا ان حادثوں کے قابل توجہ فوائد کسی دن منکشف نہیں ہو سکتے؟

بہت سی باتیں سطحی نگاہ میں ظلم اور بے رحمی معلوم ہوتی تھیں، ان کے کسی فائدے کا تصور تک نہیں تھا، لیکن آج جدید علوم کے ماہرین نے علمی اور سائنسی عینک کی مدد سے ان کے عجیب و غریب اسرار کا انکشاف کیا ہے۔

نومولود بچہ کیوں روتا ہے۔؟

عام طور سے بچہ پیدا ہونے کے بعد بہت روتا ہے، ماں باپ کو اس کے رونے سے تکلیف اور ہر شخص کے جذبات ہمدردی اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بظاہر اس رونے کا نتیجہ سوائے بچے کے ہلکان ہونے اور ماں باپ کی پریشانی کے کچھ نہیں ہے لیکن شاید لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہو کہ طویل تحقیقات کے بعد یہ پتہ چلا کہ اگر بچہ نہ روئے تو شاید وہ زندہ نہ رہ سکے، کیونکہ نومولود بچے بلکہ ہر شخص کے جسم کو اپنی زندگی باقی رکھنے کے لیے حرکت اور ورزش کی بڑی ضرورت ہے، اگر حرکت نہ کرے تو اس کے تمام اعضاء بدن کے از کار رفتہ ہو جانے یا کم از کم نشوونما کے ٹھہر جانے کا اندیشہ ہے، چونکہ بچپنے میں آدمی کو ورزش کی زیادہ ضرورت ہے اسی لیے بچے کی فطرت میں کھیلنے کودنے اور دوڑنے کا جذبہ

[illegible]

... لیے اسے ایک قسم کی غیر اختیاری حرکت

[illegible]

اس کے اور ... [illegible]

سنبھلتے ہیں، ان سب کا مجموعہ بچّے کے لیے ایک ورزش کے مثل ہے۔

دوسری طرف نومولود بچے کے دماغ میں رطوبتیں زیادہ ہیں، ان کے باہر آنے کا ذریعہ سوائے گریے کے دوسرا نہیں ہے، اگر وہ رطوبتیں باہر نہ نکلیں تو خطرناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آنکھیں کمزور یا نابینا ہو سکتی ہیں اور دوسری بیماریوں میں بچہ مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آنسوؤں کے غدود براہِ راست اپنے مادے کو خون سے اخذ کرتے ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ پانی کا کسی ایک حصّۂ بدن میں کم ہونا اس کے دوسرے حصوں پر اثر ڈالتا ہے جن میں سے ایک دماغ بھی ہے۔

دنیائے اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت امام جعفر صادقؑ نے سینکڑوں برس پہلے بعینہٖ یہی بات مفضّل سے فرمائی تھی۔

"اے مفضّل! یہ بات جانو کہ بچوں کے رونے کے بہت سے فائدے ہیں، ان کے دماغ میں ایسی رطوبتیں موجود ہوتی ہیں جو اگر اپنی حالت پر باقی رہیں تو بہت سے امراض جیسے نابینائی وغیرہ پیدا کر سکتی ہیں، گریہ ان رطوبتوں کو بچّوں کے دماغ سے خارج کر دیتا ہے، اس طرح بچوں کی جسمانی صحت و سلامتی محفوظ رہتی ہے، اکثر بچّوں کے ماں باپ ان کے رونے سے متاثر ہو کر انھیں خاموش کرتے ہیں حالانکہ انھیں یہ خبر نہیں کہ رونا بچوں کے لیے بہتر ہے۔"

نومولود بچّوں کے گریے کی مثال دینے کا مقصد یہ تھا کہ ایسی سینکڑوں چیزیں ہیں جو پہلے ہمیں معلوم نہیں تھیں، تدریجاً ان کے چہرے سے جہالت کا پردہ ہٹا، اس کے بعد کیا ہمارا ایمان اجازت دیتا ہے کہ ہم دنیا میں پیش آنے والے حادثوں کے متعلق نہایت آسانی [illegible] فائدہ یا نقصان رساں ہیں، یہ فیصلہ اس صورت میں صحیح ہے اگر گزشتہ اور آئندہ اوقات پر حاوی ہوں، یہ جانتے [illegible] ہے۔

ہم کس طرح اور کیوں گزشتہ اور آئندہ کے بارے میں، دنیا کے انجام جیسے مسائل کی بابت اظہار خیال کرتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا کے چھوٹے چھوٹے اسرار زندگی سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں؟ جبکہ ہمارے معلومات مجہولات کے مقابلے میں صفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں پھر انسانی علوم کے محدود ہونے کے متعلق جدید علوم کے بعض ماہرین کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں تاکہ سادہ لوح افراد اس طرح کے اعتراضات سے متاثر نہ ہوں۔

"ولیم کریڈکس"، انگلینڈ کے بڑے سائنسدانوں میں سے تھے، ایٹم کے متعلق انھوں نے تحقیقات بھی کیے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"تمام ان صفات کے درمیان جنھوں نے مطالعات روحی میں میری مدد کی ... بہت سے اسرار درموز کو میرے لیے آسان کر دیا جن کی مجھ سے امید نہیں کی جاتی ... مؤثر یہ صفت ہے کہ میں اپنی جہالت کا مکمل اور راسخ عقیدہ رکھتا ہوں۔" (...علی اطلال المذہب المادی ص ۱۳۶)

انگلستان کے سائنسدانوں میں سے ایک دوسرے صاحب کا قول ہے:

"جو ہم جانتے ہیں اس کے مقابلے میں جو ہم نہیں جانتے ہیچ ہے بعض لوگ ... بات دل کی گہرائیوں سے نہیں کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کا اظہار مکمل اعتقاد کے ساتھ کر رہا ہوں"۔ (علی اطلال المذہب المادی ص ۱۳۷)

ممتاز فرانسیسی فلسفی اور اہل قلم "مورس میٹرلینگ" کے الفاظ ہیں:

"اگر ہمیں یہ خیال ہے کہ ایٹم کے بھید ہمیں معلوم ہیں تو ابھی ذرّات برقی اور الیکٹران کے اسرار ہم نہیں جانتے ہیں، ہمیں نہیں پتہ کہ بجلی کا ایک ذرّہ اور الیکٹران کس چیز سے بنایا گیا ہے اور اس کے کیا اجزاء ہیں جن سے وہ مرکب ہے؟ کیونکہ الیکٹران اتنا چھوٹا، اس طرح بھاگتا اور یوں تیزی سے ادھر اُدھر تتر بتر ہوتا ہے کہ ہم اب تک اسے ایک ...

گرفتار نہیں کر سکے ہیں۔ وہ ہمارے معائنہ اور ہماری تحقیق کا مرکز نہیں بن سکا ہے اگر ہم یہ نہیں جانتے کہ ایک ذرہ نور جسے لاطینی زبان میں (فوتون) کہتے ہیں کاہے سے بنایا گیا ہے اور اس کے اجزاء ترکیبیہ کیا ہیں؟ چونکہ اب تک ہم کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ اسے تنہا گرفتار کرکے اپنے تحقیقات اور معائنے کا مرکز بنائیں، ہم ابھی اس سے عاجز ہیں کہ آواز کی لہروں کے ایک چھوٹے سے ذرّے کو تنہا مرکزِ تحقیق قرار دیں"! کیا یہی انصاف ہے؟

بالفرض ان آفات ارضیہ وسماویہ کے اسرار اور فوائد ہم نہ معلوم کر سکیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کے ان تمام عجیب وغریب رموز سے آنکھیں بند کر لیں جن کا ... چکا ہے کیونکہ اس طرح کی کچھ باتوں سے ہماری ناواقفیت کا ہرگز یہ تقاضہ ... کہ اپنے دوسرے معلومات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

... نفیس سینری آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، اس میں فطرت کا ایک ... دکھایا گیا ہے، ایک طرف گھنے درخت ہیں، دوسری طرف کیاریوں میں ... پودوں کی نازک شاخوں پر دلکش غنچے اور پھول ہیں۔ پہاڑوں کی ایک قطار ہے ... برف سے ڈھکی ہوئی ہیں، پہاڑوں کے دامن میں صاف وشفاف ... چشمے جاری ہیں۔ سینری کے یہ مناظر آرٹسٹ کی مہارت، اس کے ذوق ... رہے ہیں۔ اسی کے ایک گوشے میں کچھ کاواک لکیریں، کچھ بے معنے ... دیتے ہیں، اس مقام پر کیا عقل اور ضمیر اجازت دیتے ہیں کہ ان چند ... کی وجہ سے ان تمام خوشنما، دلکش، خوبصورت مناظر سے آنکھیں ... ایک زبردست، ماہر آرٹسٹ کی گردش قلم کا نتیجہ ہونے کا پتہ دے رہے ... پوری سینری کو اتفاقی یا ایسے شخص کا نتیجۂ قلم قرار دے دیا جائے جو آرٹ سے ... بہرہ ہو اور جس نے اس کام میں کسی مقصد اور غرض کو پیشِ نظر نہ رکھا ہو؟

مجہول تھا اب بے نقاب ہو گئے ہیں ؟ کسی چیز کے چہرے پر جہالت کا پردہ نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اپنے کر اس فیصلے کا حق دار نہیں ؟ آیا انسانی علم و تحقیق برابر ترقی اور کمال کا راستہ نہیں طے کر رہا ہے ؟ کیا ان حادثوں کے قابل توجہ فوائد کسی دن منکشف نہیں ہو سکتے ؟

بہت سی باتیں سطحی نگاہ میں ظلم اور بے رحمی معلوم ہوتی تھیں، ان کے کسی فائدے کا تصور تک نہیں تھا، لیکن آج جدید علوم کے ماہرین نے علمی اور سائنسی عینک کی مدد سے ان کے عجیب و غریب اسرار کا انکشاف کیا ہے۔

نومولود بچہ کیوں روتا ہے ؟

عام طور سے بچہ پیدا ہونے کے بعد بہت روتا ہے، ماں باپ کو اس کے رونے سے تکلیف اور ہر شخص کے جذبات ہمدردی اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بظاہر اس رونے کا نتیجہ سوائے بچے کے ہلکان ہونے اور ماں باپ کی پریشانی کے کچھ نہیں ہے لیکن شاید لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہو کہ طویل تحقیقات کے بعد یہ پتہ چلا کہ اگر بچہ نہ روئے تو شاید وہ زندہ نہ رہ سکے، کیونکہ نومولود بچے بلکہ ہر شخص کے جسم کو اپنی زندگی باقی رکھنے کے لیے حرکت اور ورزش کی بڑی ضرورت ہے، اگر حرکت نہ کرے تو اس کے تمام اعضاء بدن کے از کار رفتہ ہو جانے یا کم از کم نشو و نما کے ٹھہر جانے کا اندیشہ ہے، چونکہ بچپنے میں آدمی کو ورزش کی زیادہ ضرورت ہے اسی لیے بچے کی فطرت میں کھیلنے کودنے اور دوڑنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

نومولود بچہ چونکہ ورزش پر قادر نہیں ہے اس لیے اسے ایک قسم کی غیر اختیاری حرکت کی ضرورت ہے اس کا رونا اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، چونکہ رونے کی حالت میں بچے کے بدن کا ہر حصہ کام کرتا ہے، دل کی دھڑکن زیادہ شدید [illegible] پھیپھڑوں کی حرکت اور سانس کی آمد و شد زیادہ تیز ہو جاتی ہے [illegible] اس کی رگیں خون سے بھر جاتی ہیں، اس کے چہرے [illegible] کی پٹھیاں اور ان کے پٹھے

ٹہلاتے ہیں، ان سب کا مجموعہ بچّے کے لیے ایک ورزش کے مثل ہے۔

دوسری طرف نومولود بچے کے دماغ میں رطوبتیں زیادہ ہیں، ان کے باہر آنے کا ذریعہ سوائے گریے کے دوسرا نہیں ہے، اگر وہ رطوبتیں باہر نہ نکلیں تو خطرناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آنکھیں کمزور یا نابینا ہو سکتی ہیں اور دوسری بیماریوں میں بچہ مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آنسوؤں کے غدود براہ راست اپنے مادے کو خون سے اخذ کرتے ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ پانی کا کسی ایک حصّۂ بدن میں کم ہونا اس کے دوسرے حصوں پر اثر ڈالتا ہے جن میں سے ایک دماغ بھی ہے۔

دنیائے اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت امام جعفر صادقؑ نے سینکڑوں برس پہلے بعینہٖ یہی بات مفضّل سے فرمائی تھی۔

"اے مفضّل! یہ بات جانو کہ بچوں کے رونے کے بہت سے فائدے ہیں، ان کے دماغ میں ایسی رطوبتیں موجود ہوتی ہیں جو اگر اپنی حالت پر باقی رہیں تو بہت سے امراض جیسے نابینائی وغیرہ پیدا کر سکتی ہیں، گریہ ان رطوبتوں کو بچّوں کے دماغ سے خارج کر دیتا ہے، اس طرح بچوں کی جسمانی صحت وسلامتی محفوظ رہتی ہے، اکثر بچّوں کے ماں باپ ان کے رونے سے متاثر ہو کر انھیں خاموش کرتے ہیں حالانکہ انھیں یہ خبر نہیں کہ رونا بچوں کے لیے بہتر ہے۔"

نومولود بچوں کے گریے کی مثال دینے کا مقصد یہ تھا کہ ایسی سینکڑوں چیزیں ہیں جو پہلے ہمیں معلوم نہیں تھیں، تدریجاً ان کے چہرے سے جہالت کا پردہ ہٹا، اس کے بعد کیا ہمارا ضمیر ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ہم دنیا میں پیش آنے والے حادثوں کے متعلق نہایت آسانی سے فیصلہ کر دیں اور کہہ دیں کہ وہ بے فائدہ یا نقصان رساں ہیں؟ یہ فیصلہ اس صورت میں صحیح ہے جبکہ ہم تمام چیزوں کے اسرار اور ان کے گزشتہ اور آئندہ اثرات پر حاوی ہوں، یہ جانتے ہوں کہ اس حادثے میں سوائے ضرر کے کوئی دوسرا پہلو نہیں ہے۔

ہم کس طرح اور کیوں کر گذشتہ اور آئندہ کے بارے میں، دنیا کے انتہائی پیچیدہ مسائل کی بابت اظہار خیال کرتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا کے چھوٹے چھوٹے موجودات کے اسرار زندگی سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں؟ جبکہ ہمارے معلومات مجہولات کے مقابلے میں صفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں پھر انسانی علوم کے محدود ہونے کے متعلق جدید علوم کے بعض ماہرین کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں تاکہ سادہ لوح افراد اس طرح کے اعتراضات سے متاثر نہ ہوں۔

"ولیم کریڈکس"، انگلینڈ کے بڑے سائنسدانوں میں سے تھے، ایٹم کے متعلق انھوں نے تحقیقات بھی کیے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"تمام ان صفات کے درمیان جنھوں نے مطالعات روحی میں میری مدد کی اور بہت سے اسرار و رموز کو میرے لیے آسان کر دیا جن کی مجھ سے امید نہیں کی جاتی تھی سب سے مؤثر یہ صفت ہے کہ میں اپنی جہالت کا مکمل اور راسخ عقیدہ رکھتا ہوں" (کتاب علی اطلال المذہب المادی ص ۱۳۶)

انگلستان کے سائنسدانوں میں سے ایک دوسرے صاحب کا قول ہے:

"جو ہم جانتے ہیں اس کے مقابلے میں جو ہم نہیں جانتے ہیچ ہے۔ بعض لوگ یہ بات دل کی گہرائیوں سے نہیں کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کا اظہار مکمل اعتقاد کے ساتھ کر رہا ہوں"۔ (علی اطلال المذہب المادی ص ۱۳۷)

ممتاز فرانسیسی فلسفی اور اہل قلم "مورس میٹرلینگ" کے الفاظ ہیں:

"اگر ہمیں یہ خیال ہے کہ ایٹم کے بھید ہمیں معلوم ہیں تو ابھی ذرّات برق اور الیکٹران کے اسرار ہم نہیں جانتے ہیں، ہمیں نہیں پتہ کہ بجلی کا ایک ذرّہ اور الیکٹران کس چیز سے بنایا گیا ہے اور اس کے کیا اجزاء ہیں جن سے وہ مرکب ہے؟ کیونکہ الیکٹران اتنا چھوٹا، اس طرح بھاگتا اور یوں تیزی سے اِدھر اُدھر تتر بتر ہوتا ہے کہ ہم اب تک اسے اکیلا

گرفتار نہیں کر سکے ہیں۔ وہ ہمارے معائنہ اور ہماری تحقیق کا مرکز نہیں بن سکا ہے اسی طرح ہم نہیں جانتے کہ ایک ذرۂ نور جسے لاطینی زبان میں (فوتون) کہتے ہیں کاہے سے بنا گیا ہے اور اس کے اجزاء ترکیبیہ کیا ہیں؟ چونکہ اب تک ہم کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ اسے تنہا گرفتار کر کے اپنے تحقیقات اور معائنے کا مرکز بنائیں، ہم ابھی اس سے بھی عاجز ہیں کہ آواز کی لہروں کے ایک چھوٹے سے دقیقے کو تنہا مرکز تحقیق قرار دیں"! کیا یہی انصاف ہے؟

اگر بالفرض ان آفات ارضیہ وسماویہ کے اسرار اور فوائد ہم نہ معلوم کر سکیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کے ان تمام عجیب و غریب رموز سے آنکھیں بند کر لیں جن کا پتہ چل چکا ہے، کیونکہ اس طرح کی کچھ باتوں سے ہماری ناواقفیت کا ہرگز یہ تقاضہ نہیں ہے کہ اپنے دوسرے معلومات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

فرض کیجیے کہ ایک نفیس سینری آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، اس میں فطرت کا ایک دلربا اور خوشنما منظر دکھایا گیا ہے، ایک طرف گھنے درخت ہیں، دوسری طرف کیاریوں میں خوبصورت پودوں کی نازک شاخوں پر دلکش غنچے اور پھول ہیں۔ پہاڑوں کی ایک قطار ہے جن کی چوٹیاں قدرتی برف سے ڈھکی ہوئی ہیں، پہاڑوں کے دامن میں صاف وشفاف موتی جیسے پانی کے چشمے جاری ہیں۔ سینری کے یہ مناظر آرٹسٹ کی مہارت، اس کے ذوق اور سلیقے کا پتہ دے رہے ہیں۔ اسی کے ایک گوشے میں کچھ کاواک لکیریں، کچھ بے معنے مبہم نقطے دکھائی دیتے ہیں، اس مقام پر کیا عقل اور ضمیر اجازت دیتے ہیں کہ ان چند لکیروں اور نقطوں کی وجہ سے ان تمام خوشنما، دلکش، خوبصورت مناظر سے آنکھیں بند کر کے جو ایک زبردست، ماہر آرٹسٹ کی گردش قلم کا نتیجہ ہونے کا پتہ دے رہے ہیں اس پوری سینری کو اتفاقی یا ایسے شخص کا نتیجۂ قلم قرار دے دیا جائے جو آرٹ سے بالکل بے بہرہ ہو اور جس نے اس کام میں کسی مقصد اور غرض کو پیشِ نظر نہ رکھا ہو؟

اس دنیا میں ایسی پراسرار چیزیں بہت دکھائی دیتی ہیں جن میں سے ہر ایک خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل، تشفی بخش دلیل ہے۔

آیا چیونٹی کی حیرت انگیز زندگی کا جائزہ، اس کے علاوہ مختلف جانوروں کی ذاتی خصلتیں اور عادتیں، ان کے رہنے سہنے کے طریقے دیکھنے کے بعد بھی ان کے پیدا کرنے والے کے علم و قدرت میں کوئی شک رہ جاتا ہے؟ آیا رموز کائنات کا ایک گوشہ نہ جاننے کی وجہ سے سب چیزوں کو پس لشت ڈال دیا جائے گا؟ آیا اس عظیم دنیا کی قیمت ایک سینٹری کے برابر بھی نہیں ہے؟

کیا برا ہے کہ یہاں اس پراسرار دنیا کے عجائب کا ایک چھوٹا سا نمونہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر دیا جائے۔

وہ ماں جس نے کبھی اپنے بچہ کی صورت نہیں دیکھی!

ایک فرانسیسی دانشور نے ایک پرندے کے حالات زندگی کے متعلق ریسرچ شروع کی، پرندے کا نام فرانسیسی زبان میں "اکسپکلوپ" ہے، اس کا حال خود ان صاحب کی زبانی سنیے:

"میں نے اس پرندے کے حالات کا جائزہ لیا ہے، اس کے مخصوص حالات میں سے یہ ہے کہ وہ انڈے دے کر مر جاتا ہے، ہرگز ماں اپنے بچوں کی صورت اور بچے اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھتے ہیں۔

یہ بچے انڈے سے نکلنے کے وقت لمبے لمبے چھوٹے کیڑوں کے مانند ہیں، بے بال و پر، یہ اپنے ضروریات زندگی اور روزی حاصل کرنے پر قادر نہیں ہوتے، یہاں تک کہ وہ ان حادثوں سے بھی اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے جن سے وہ دوچار ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں ایک سال تک اسی حالت میں کسی محفوظ جگہ رہنا چاہیے اور ان کی خوراک ان کے پہلو میں ہو، اسی لیے جب ان کی ماں محسوس کرتی ہے کہ انڈے دینے کا وقت آگیا ہے تو وہ لکڑی کا

ایک ٹکڑا ڈھونڈھ کر اس میں ایک گہرا اور لمبا سوراخ کرتی ہے، اس کے بعد روزی فراہم کرنے میں مشغول ہوتی اور ایسی نازک پتیاں، کونپلیں جن سے اس کے نومولود بچے فائدہ اٹھا سکیں ان میں سے ایک کے واسطے ایک سال کی خوراک کے برابر اکٹھا کرکے اسے سوراخ کی تہ میں رکھ دیتی ہے، پھر اس کے اوپر بیٹھ کر ایک انڈا دیتی اور بعض مخصوص لکڑیوں کے گاڑھے رس سے کچھ بلندی پر نسبتاً مضبوط چھت بنا دیتی ہے، اس کام سے فارغ ہوکر دوبارہ آزوقہ کی فراہمی میں منہمک ہوجاتی ہے، دوسرے بچے کے ایک سال کی ضروریات زندگی مہیا کر لینے کے بعد ان کے پاس بیٹھ کر دوسرا انڈا دیتی، پھر پہلے کی طرح دوسری چھت تیار کرتی ہے، اس طرح اپنے انڈوں کی تعداد کے مطابق کئی منزلہ عمارت بنا کر اپنا کام مکمل کرکے یہ مہربان ماں مرجاتی ہے اور اس کے بچے بعد میں نکلتے ہیں" اسے کبھی نہ بھولیے کہ پوری عمر میں صرف ایک بار موسم بہار میں یہ پرندہ انڈے دیتا اور اپنے بچوں کی زندگی باقی رہنے کا بندوبست کرجاتا ہے۔"

یہی سائنسدان اس پرندے کی داستان زندگی بیان کرتے کے بعد لکھتا ہے:

" انسان جس وقت ان مناظر کے جمال کو دیکھتا تو وہ حیران اور ششدر رہ جاتا ہے کہ کیونکہ بعض ان حیرت انگیز چیزوں کو اتفاقات سے وابستہ قرار دیتے ہوئے چیونٹیوں کے الہامات سے لے کر انسان کے ادراکات تک کو پانی کے بصورت برف جم جانے، لکڑی کے سلگنے، اجسام کے گرپڑنے کے مثل ایک نیچرل عمل کا نتیجہ سمجھتے ہیں؟ یہ خیالات بلکہ گمراہ کن خرافات جنھیں تجرباتی علوم کے نام کے نیچے چھپایا جاتا ہے حقیقی علم کی طرف سے غلط ثابت ہوگئے ہیں۔ کیونکہ طبیعیات کا سچا عالم ہرگز ان بیہودہ اور باطل خیالات کا معتقد نہیں ہوسکتا، جب انسان ان کمزور کیڑے مکوڑوں کے حقیر بلوں کو اپنے مطالعات اور تحقیقات کا مرکز قرار دے تو وہ نہایت واضح طور پر عنایت الٰہی کی آواز کو سنے گا جو اپنے مخلوقات کو ان کے روزمرہ کے کام بتارہی ہے۔" (رہبر سعادت)

اس عجیب وغریب پرندے کی بابت ہم اور آپ مل کر سوچیں، دیکھیں کہ وہ اپنے زیر اولاد بچوں کے ضروریات اور ان کی عاجزی کو کہاں سے جانتا ہے؟ ان باتوں کو اس نے کس سے سیکھا ہے؟ آیا اس کی ماں نے سکھایا ہے حالانکہ وہ اس کی صورت تک نہیں دیکھتا؟ تجربے کے ذریعہ انھیں حاصل کیا ہے جبکہ اس کی پوری عمر میں ایک مرتبہ سے زیادہ ان باتوں کے وجود میں آنے کا موقع نہیں ہوتا۔؟

اگر کہیں کہ ہم اسے ہم جنسوں کو دیکھ کر اس پرندے نے یہ کام سیکھے ہیں تو پھر سوچنا پڑے گا کہ وہ ذاتی شعور اور قوت اس میں کہاں سے آئی جس نے اسے ابھارا کہ ہم جنسوں کے عمل کو دیکھے اور یاد رکھے۔؟

دوسری طرف یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس قسم کا سب سے پہلا پرندہ جب وجود میں آیا تو وہ ان باریک نکات سے کس طرح واقف بنا، اس نے تو یہ عمل کسی دوسرے جانور سے نہیں دیکھا تھا۔؟

خوش قسمتی سے چونکہ اس جانور کی کدوکاوش، اس کا یہ طرزِ عمل اس کی زندگی اور اس کے ماحول سے متعلق نہیں اس لیے اس کا سبب ماحول اور اپنے ضروریات پورا کرنے کی مطابقت نہیں ہوسکتا، لعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے"۔ جس طرح انسان کو جب اپنی زندگی کے باقی رکھنے کے لیے سردی اور گرمی سے بچاؤ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنا سر چھپانے کے واسطے کسی نہ کسی صورت کا گھر بنالیا، کسی نہ کسی طرح اپنے جسم کو ڈھانک لیا، اپنے لیے گھر بنانا اگر اس نے جانوروں سے سیکھ بھی لیا ہو تو کپڑے پہننا اس نے کسی سے نہیں سیکھا، اس قسم کی توجیہ اس پرندے کے مذکورہ کاموں کی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہ اس کی ذات سے متعلق نہیں ہیں، اس کے ان بچوں سے متعلق ہیں جو اس کے مرنے کے بعد دنیا میں آئیں گے، یہ کام دوسرے کی زندگی کے باقی رہنے کا انتظام ہے جو ابھی کتمِ عدم کے اندر منہ چھپائے ہے۔

کیا اسی پرندے کے ان کاموں کے پہلوؤں میں غور و خوض ہمیں اس مبداء علم و قدرت ذات کا شناسا بنانے کے لیے کافی نہیں ہے جو ان تمام الہامات کا سرچشمہ ہے؟

بانگ بیدار باش | گزشتہ اعتراض کے جواب میں عرض کیا گیا کہ ہر چیز کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے۔

اس بناء پر اگر انسان ہمیشہ راحت و آرام کے سایے میں زندگی بسر کرے، کسی قسم کی ناگواری سے اس کی زندگی دوچار نہ ہو، رنج و غم کا بھیانک چہرہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے تو کیا ممکن ہے کہ انسان راحت اور آسائش کی قیمت کا صحیح اندازہ اور مکمل طور پر اس کی قدر دانی کرے۔؟

دوسری طرف اپنے علم پر گھمنڈ، اپنی ترقیوں پر غرور، اپنی عزت اور دولت پر تکبر، غیر محدود خواہشیں اور تمنائیں، بے انتہا ہوسیں اور حسرتیں اس دائمی راحت و مسرت کے ساتھ آیا ظلم، فساد، ہنگامہ آرائی، سرکشی، خودغرضی انسان کو زندہ رہنے کا موقع دے گی؟ جس انسان نے شکست، ناکامی اور غم و اندوہ کی کبھی صورت نہ دیکھی ہو اس کا انجام معلوم ہے۔

آیا جو نقصانات، جو مضرتیں، جو مصائب انسان مذکورہ صورت میں برداشت کرے گا وہ بدرجہا آفات ارضیہ و سماویہ کے خساروں سے زیادہ نہیں ہیں؟ آیا سرکشی، خود خواہی، غرور جو انسانی سماج کے حق میں سمِ قاتل ہیں ان کی روک تھام میں اس طرح کے حادثے اور مصیبتیں مؤثر اور مفید نہیں ہیں۔؟

آج ان تمام حادثوں، بلاؤں، آفتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم، خوں ریزی، ہنگامہ آرائی، فتنہ انگیزی کا بازار گرم ہے، طاقتور قومیں کمزور اقوام و ملل کا برابر خون چوس رہی ہیں، طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ ان کی دولتوں سے اپنے گھر بھر رہی ہیں، جہاں تک سیاسی حالات اجازت دیں کسی پست سے پست بداخلاقی کے ارتکاب میں انھیں باک نہیں ہے، ہر روز دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں ایک نیا فتنہ سر اٹھاتا ہے، کوئی بھی اس دنیا میں خوش حال

اور طمئن نہیں ہے، اس عالم کی اس روز شکل و صورت کیا ہو گی جب انسان ہر لحاظ سے راحت، آسودگی، اطمینان اور آسائش میں بسر کر رہا ہو؟ کوئی چیز اس کی پریشان حالی، کبیدہ خاطری کا سبب نہ ہو؟ خلاصہ یہ کہ اگر اس سرکش، مغرور، نفسانی خواہشوں کے پتلے، مجسمۂ ہوا وہوس انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، اسے کسی طرح متنبہ اور ہوشیار نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ وہ تمام حدود اور قوانین سے بے پرواہ ہو کر دوسرے افراد کے حقوق کو روند ڈالے گا اور آخر میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو ڈالے گا، وہ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو پورا کرنے کی خاطر کسی قسم کے ظلم و تعدی سے باز نہیں آئے گا، انسان کی ان کج رفتاریوں کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسے سماج میں خلوص، تعاون، ہمدردی، خیر خواہی، بے لوثی کا کوئی نام و نشان نہیں دکھائی دے گا، اس کے بعد پورے معاشرے کی عمارت کا ڈھا جانا لازمی ہے۔

غافل اور فراموش کار انسان کے بیدار کرنے کے لیے، شریفانہ جذبات اور احساسات کی طرف اس کی نگاہ کو متوجہ کرنے کی خاطر زلزلوں، طوفانوں، قحط سالیوں، وباؤں وغیرہ کا آنا ضروری ہے۔

ظلم و جور، سرکشی اور تمرد سے بچانے کے واسطے عقل لازم قرار دیتی ہے کہ انسان کے سر پر خطرے کی گھنٹی ہمیشہ بجتی رہے، ہوشیار، خبردار کی آوازیں ہمیشہ اُسے جھنجھوڑتی رہیں۔

ان حادثوں، آفتوں اور بلاؤں کا ایک اہم فائدہ وہ بھی ہے جس کی طرف سابق اعتراض کے جواب میں اشارہ کیا گیا کہ یہ ہماری نگاہ کو ایک ہمہ گیر تنظیم و ضبط کی طرف متوجہ کرتی ہیں جو تمام کائنات میں پھیلا ہوا ہے، وہ ہماری نظروں کو ایک ایسے طاقتور خالق کی ذات کی طرف موڑتی ہیں جو اس عالم مادّہ کے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی ہے اور جس کے دست قدرت میں تمام مادی اسباب کا سلسلہ ہے، انسان خود بخود اپنی فطرت کے تقاضے سے مصیبت اور گرفتاری کے اوقات میں خصوصیت سے ہمیشہ اس مرکز اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں پستی اور زوال کا گزر نہیں، جس سے بالاتر اقتدار اور طاقت کا تصور ممکن نہیں، آدمی اس ذات کے دامن میں

ے کر مصائب و شدائد سے چھٹکارے کے لیے اس سے امداد طلب کرتا ہے،
نسان مصائب و شدائد سے دوچار نہ ہو تو مادی لذتوں میں ہمیشہ غرق ہوتے اور
ہ کسی کے محتاج نہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس منعم حقیقی سے بے خبر اور دور ہوتا
ے گا" اس بناء پر اس سے بہتر اور بالا تر کوئی فائدہ ہو سکتا ہے کہ یہ آفات و حوادث
ان کی فطرت اور اس کے جذبۂ خدا پرستی کو بیدار کرتے ہیں، مادیت کے دلفریب مناظر
اس کی چکاچوند نگاہوں کو کبھی کبھی اس کے پروردگار کی جانب موڑتے ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ انسان صرف اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا
اس کی خلقت ایک زیادہ مکمل ابدی اور جاودانی زندگی کے پیش نظر ہوئی ہے،
نیوی زندگی اس زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ انسان اس عارضی، مادی زندگی میں مشغول
ـ اور سرگرم ہو کر اس حیات ابدی کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے
ل اور ارتقاء کے سلسلے میں کچھ کد و کاوش نہیں کرتا، ضرورت ہے کہ اس کو خوب جھنجھوڑ کر
طرح جگایا، چونکایا جائے، اس رواں دواں دنیا کے زوال و فنا کو اس کی آنکھوں
سامنے مجسم کر کے پیش کیا جائے، انسان کو صاف اور مؤثر طور پر بتایا جائے کہ اس کا
سد اصلی اور وطن حقیقی یہ دنیا نہیں بلکہ ایک دوسرا عالم ہے۔

انسان اس شخص کے مانند ہے جو کار یا ٹرین میں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہو اور
ر کوں سے گذر رہا ہو، اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے دوست سے باتوں میں اس طرح محو ہو کر
پنا مقصد سفر اس کے ذہن میں ہو اور نہ اس بات کا خیال اس کے دماغ میں ہو کہ میں اپنے
ین نہیں، پردیس میں ہوں، ممکن ہے کہ اس کی یہ خود فراموشی اسے منزل مقصود کے بجائے
ی دوسری جگہ پہنچا دے، اسی دوران میں ریل گاڑی کا ایک غیر معمولی ہچکولا یا ہموار راستے
چلتے چلتے دفعتاً کار کا کسی گڑھے میں چلا جانا اس کے کھوئے ہوئے حواس کو دوبارہ واپس
آتا ہے۔

علامہ طاش کبری زادہ رح

جناب [illegible] نعمانی صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۱)

کسی بھی ملک کی شہرت و عظمت کا دار و مدار علوم و فنون کی ترقی میں مضمر ہے، ترکی سلاطین کی فیاضی، علم دوستی اور قدردانی کی بدولت علماء اور ارباب کمال کا ہر دور میں ایک مجمع نظر آتا ہے، ترکوں نے اپنے بے مثال کارناموں، ملکی اصلاحوں، صنعت و حرفت، معماری و نقاشی میں نمایاں ترقی کے ساتھ سرزمین ترکی کو دارالعلوم والفنون کی حیثیت بھی دی، ترکی میں علمی ترقی کا دور سلطان اُرخان سے شروع ہوتا ہے، یہی وہ مدبر حکمراں تھا جس کے عہد حکومت میں ازنیق میں ایک شاندار مدرسہ کی بنیاد پڑی، یہ نخل ثمر بار ہوا۔ اس کے بعد ترکوں کے تقریباً سبھی سلاطین اور شہزادے علوم و فنون کے مربی و سرپرست رہے اور وزراء و امراء بھی ان کے نقش قدم پر گامزن رہے، سلطان مراد ثانی، سلطان محمد فاتح، سلطان بایزید ثانی، سلطان سلیم اول، اور سلطان اعظم بڑے معارف پرور اور خود بھی شعری و ادبی ذوق کے حامل تھے، سلطان محمد فاتح نے فتوحات میں بڑا نام پایا، مگر اس نے علم اور علماء کی سرپرستی میں کشور کشائی سے کم کوشش نہیں کی۔ اس نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد وہاں کے آٹھ بڑے گرجوں کو مدارس میں تبدیل کیا، ان مدارس کو سرکاری حیثیت دی، ان مدارس میں تدریس بڑا اعزاز خیال کی جاتی تھی۔

ترکی میں نویں اور دسویں صدی ہجری کا زمانہ علوم و فنون کی گرم بازاری اور فضلاء کی کثرت کے اعتبار سے عہد زرّیں قرار دیے جانے کے لائق ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس عہد

[illegible] علوم و فنون کی ہر شاخ ثمر بار ہوئی، اس کی نظیر سابقہ صدیوں میں اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تذکرہ نویسی، حدیث، تفسیر، فقہ، علم کلام، تاریخ و سیرت کے فن کو ان متذکرہ صدیوں میں حیرت انگیز ارتقاء حاصل ہوا۔ شمس الدین فناری، [illegible] الخیالی، ملا خسرو، قطب الدین ازنیقی، علاء الدین رومی، عبدالرحمٰن چلپی، [illegible] علاء الدین طوسی، مولیٰ فتح اللہ شیرازی علاء الدین علی القوشجی، حسن چلپی، قاضی زادہ، [illegible] الدین الکساری، مصلح الدین قسطلانی، خطیب زادہ، مولیٰ مصنفک، ابن کمال پاشا، مصلح الدین مصطفیٰ بن خلیل۔ مولیٰ خیر الدین، مفتی ابوالسعود وغیرہ جیسے نادرۂ روزگار علماء نے اس عہد میں اپنے وسعتِ علم، بلندیٔ فکر، مہارت فن، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کے لازوال نقوش قائم کیے ہیں۔

اس عہد عروج میں جن نفوسِ قدسیہ نے اپنی زندگیاں قربان گاہ علم پر نثار کیں، ان میں کچھ تو نگاہوں کا مرکز بن گئے، کچھ ارباب کمال ہمارے تغافل کا شکار ہو گئے، اس خاکستر میں بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے حالات و کمالات کو منظرِ عام پر لایا جائے تو آسمانِ علم و ادب کے بہت سے تابندہ ستارے ماند پڑ جائیں گے، ذیل میں ایک ایسی ہی شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے جس نے اپنے معلومات کی وسعت، تحقیقات کی ندرت اور علمی فضیلت کے سبب معاصرین اور متاخرین سے خراج تحسین حاصل کیا اور اپنے بعد کتابوں کا ایسا نادر ذخیرہ چھوڑ گئے جس کے سبب بزمِ علم و ادب میں آج بھی ان کا نام عقیدت و احترام سے لیا جاتا ہے، وہ پوری عمر جادۂ علم و تحقیق پر گام زن رہے، تاریخ، تذکرہ اور مختلف علوم و فنون ان کا موضوع رہے، ان کی ایک معرکۃ الآراء کتاب "الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ" ہے۔ جس میں ترکی کے دس سلاطین کے عہد کے علماء، فضلاء اور ادباء کے حالات اور علمی کارناموں کا بڑا دلکش و دل آویز مرقع پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے جہاں ان کی غیر معمولی محنت، وسعتِ علم اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس عہد

تذکرہ میں مختلف اسلامی علوم و فنون کے ارتقار کی ایک تابناک تصویر بھی نظر کے سامنے آجاتی ہے، زیرِ نظر مضمون میں ترکی کے اس نامور عالم اور مؤرخ علامہ طاش کبری زادہ کے احوالِ حیات پیش کیے جاتے ہیں۔

نام و نسب | احمد نام، والد کا نام مصطفیٰ، دادا خلیل، عصام الدین لقب ابو الخیر کنیت ہے،[۱] ان کے والد کا لقب مصلح الدین ہے اس لیے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں احمد بن مصلح الدین بھی ذکر ہوا ہے، عام طور پر طاش کبری زادہ سے مشہور ہیں، یہ عرف ایسا چلا کہ اصل نام پر غالب آگیا[۱] طاش کبری دراصل ترک علمار کے ایک خاندان کا نام ہے جو اناطولی میں قسطمونی کے قریب ایک گاؤں طاش کوپری سے ماخوذ ہے۔[۲]

خاندان | طاش کبری ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کے دادا خلیل علم و ادب کے بڑے دلدادہ تھے، ان کے دو صاحبزادے تھے ایک قاسم (یہ طاش کبری کے چچا تھے) بڑے صاحبِ کمال عالم تھے، درس و تدریس انھوں نے وظیفۂ حیات بنالیا تھا، مدرسۂ اسدیہ بروسا میں درس کے فرائض انجام دیتے تھے، اس کے بعد مدرسہ اسحاقیہ میں درس دینے لگے، تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، مشہور کتابوں پر ان کی تعلیقات اور اہم مسائل پر ان کے کئی رسالے یادگار ہیں، انھوں نے ۹۱۹ھ میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا،[۳] دوسرے صاحبزادے مصلح الدین مصطفیٰ تھے ۸۵۷ھ میں پیدا ہوئے، وقت کے افاضل سے کسبِ فیض کیا، سندِ فراغ کے بعد مسندِ درس کو زینت بخشی، پہلے مدرسۂ اسدیہ بروسا میں درس دیا، پھر مدرسۂ بیعنار القرہ میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے، اس کے بعد ادرنہ میں، پھر آٹھ بڑے مدارس میں سے[۴]

---

[۱] البدر الطالع ج ۱ ص ۱۲۱، [۲] دائرۂ معارف اسلامیہ ۱۲/۳۶۵، [۳] حدائق الحنفیہ ص ۳۴۱

[۴] سلطان محمد فاتح نے ۸۵۶ھ میں فتح قسطنطنیہ کے بعد علم و علمار کی سرپرستی کی خاطر وہاں کے آٹھ بڑے گرجوں کو مدارس میں تبدیل کر دیا تھا، ان مدارس میں تدریس بڑے اعزاز و افتخار کی بات سمجھی جاتی، ان

ایک مدرسہ میں خدمتِ درس دیتے رہے[1] مصلح الدین ایک باکمال عالم اور کامیاب مدرس تھے، سلطان بایزید خاں ان کی علمی قابلیت کا بہت معترف تھا، اس نے اپنے بیٹے سلیم خاں کا اتالیق بھی ان کو مقرر کیا، سلطان نے ان کی فقہی مہارت کو دیکھتے ہوئے قضا کے منصب پر ان کو فائز کر دیا، انھوں نے شاہی حکم کی بجاآوری کے لیے مسندِ قضا کو سنبھال تو لیا لیکن اپنے والد کی نصیحت کہ "بیٹا عہدۂ قضا کبھی قبول نہ کرنا" پر عمل کرتے ہوئے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا، اس کے بعد مدرسۂ سابقہ میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، اس کے بعد مدرسہ سلطانیہ بروسا آ گئے، سلطان نے از راہِ قدردانی ستر درہم یومیہ مقرر کر دیا، جب حسام چلپی کا سلیم خاں کے اوائل عہد حکومت میں انتقال ہو گیا تو موصوف کو ان کی جگہ کر دیا گیا، ۹۳۵ھ میں ان کا بھی انتقال ہو گیا، مصلح الدین درس و تدریس کے ساتھ زہد و اتقاء میں بھی بڑا مرتبہ رکھتے تھے، دنیا کے زخارف سے ہمیشہ کنارہ کش رہے حدیث، تفسیر، فقہ، اصول اور علوم ادبیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا پاکیزہ ذوق بھی تھا، انھوں نے تفسیر بیضاوی اور شرح وقایہ پر تعلیقات لکھیں، ایک رسالہ علم فرائض پر اور ایک رسالہ حدیث الابتداء پر بھی ان سے یادگار رہے[2]

ولادت و تعلیم ۱۴ ربیع الاوّل ۹۰۱ھ کو احمد کی ولادت بروسا میں ہوئی[3] اپنے نام اور ولادت کے سلسلہ میں وہ خود اپنے والد کا بیان یوں نقل کرتے ہیں کہ "میری ولادت میں ایک ماہ باقی تھا، والد نے ایک رات ایک بزرگ صفت شخص کو خواب میں دیکھا، وہ بزرگ والد سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے گھر ایک لڑکے کی ولادت ہونے والی ہے۔ اس کا نام احمد رکھنا، والد جب سفر پر جانے لگے تو انھوں نے یہ خواب والدہ ماجدہ سے بیان کر دیا، میری ولادت ۱۴ ربیع الاول ۹۰۱ھ کو ہوئی، جب میں سنِ تمیز کو پہنچا اور والد

[1] الفوائد البہیہ ص ۲۳۔ [2] طرب الاماثل ص ۲۴۱، [3] شذرات الذہب ۳۵۳/۸

ر وہ منتقل ہوگئے۔ انھوں نے قرآن پاک کی تعلیم کا آغاز کیا تو اس وقت والد نے ان کو
مصباح الدین کے لقب سے سرفراز کیا اور اعطاء الخیر کنیت رکھی[۱]۔ والد تیرہ گئے تو یہ بھی
وہاں والد سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے، اور جب والد استانبول چلے گئے تو یہ
بروسا آگئے اور وہاں کے اعیانِ علم سے کسبِ فیض کرتے رہے، صاحب العقد لکھتے ہیں
اپنے والد سے تفسیر و حدیث میں مہارت تامہ حاصل کی، اس کے بعد علی محمد القوجوی کے
دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے اور مصلح محمد میرم چلپی کے پاس علومِ ریاضی کی تکمیل کی اور
دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کرتے رہے[۲]۔ جب طاش کبری کے والد قسطنطنیہ جانے لگے
تو ان کو علاء الدین یتیم کی سپردگی میں دے دیا، انھوں نے ان کے پاس رہ کر صرف و نحو اور
منطق میں دستگاہ حاصل کی، اس کے بعد محمد آتسی کی خدمت میں کچھ عرصہ رہے اور ان سے
دو حصے بخاری شریف کے پڑھے اور تمام مسموعات میں اجازت حاصل کی، عوامل،
مصباح اور کافیہ کو اسی دوران انھوں نے حفظ کیا[۳]۔ انھوں نے اپنے چچا قوام الدین
قاسم سے وافیہ شرحِ کافیہ مرفوعات تک پڑھی، چچا جب مدرسۂ خسرویہ میں تدریس کی خدمت پر
مامور ہوئے تو وہاں بھی ان کی معیت میں رہے اور کافیہ مجرورات تک اور الفیہ مالک پوری
پڑھی، ان کے ساتھ بغرضِ تعلیم ان کے بڑے بھائی ابوسعید بھی تھے مگر اسی دوران [illegible]
۹۱۹ھ میں انتقال کر گئے، بھائی کے انتقال سے طاش کبری ملولِ خاطر ہوئے، اس کے
بعد وہ اور ان کے والد بروسا آگئے اور درس دینے لگے تو یہاں شرح شمسیہ، شرح عقائد
حواشی خیالی، ہدایت الحکمت، شرح آداب البحث، شرح الطوالع، شرح المطالع وغیرہ
ان سے پڑھیں، اور اپنے ماموں سے شرح تجرید محی الدین نکساری سے شرح المفتاح،

---

[۱] الشقائق النعمانیہ ۲/۲۷۷، والعقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم ۲/۱۹۹، [۲] العقد المنظوم بحوالہ شذرات الذہب ۸/۳۵۳۔ [۳] معجم المطبوعات ۲/۱۲۲۱ء

محی الدین الفوجوی سے شرح المواقف کا درس لیا اور کشاف سے سورۂ نبا پڑھی، علی محمد القوشجی کی خدمت میں رہ کر شفا قاضی عیاض پڑھی اور ان سے تمام مسموعات کی اجازت حاصل کی، ان کا سلسلۂ سند دو واسطوں سے حافظ العصر علامہ ابن حجر عسقلانیؒ تک پہنچتا ہے، والد نے بھی حدیث میں ان کو اجازت مرحمت کی، یہ اجازت پانچ واسطوں سے ابن حجر عسقلانی تک پہنچتی ہے[1]

درس و افادہ طاش کبریٰ زادہ کے خاندان کو یہ اختصاص رہا کہ خاندان کے بیشتر ارباب کمال نے مسندِ درس کو اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھا، چنانچہ انھوں نے بھی تحصیل علوم کے بعد خاندان کی اس روایت کو برقرار رکھا اور ۹۳۱ھ میں دیمتوقہ میں پہلی بار مسندِ درس کو رونق بخشی، دو سال یہاں تدریس کی خدمت کے بعد مدرسۂ ابن الحاج حسن استانبول میں رجب ۹۳۳ھ میں آگئے، اس مدرسہ میں مختلف علوم و فنون میں اپنی مہارت کا سکہ جما رہے تھے کہ ۹۳۵ھ میں والد کا سانحۂ ارتحال پیش آگیا، اس حادثہ کے وقوع کے بعد مصائب روزگار کا شکار ہو گئے، چنانچہ پریشان خاطری کے سبب استانبول کو خیرباد کہہ کر مدرسۂ اسحاقیہ اسکوب کی مسندِ درس سنبھالی، کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے مدرسۂ قلندریہ استانبول چلے گئے اور وہاں پورے پانچ سال یکسوئی سے رہے، ۹۴۲ھ میں مدرسۂ وزیر مصطفیٰ پاشا میں آگئے، پھر ۹۴۵ھ میں ان کو سرکاری مدرسہ ادرنہ کی خدمت تدریس تفویض ہوئی، ۹۴۶ھ میں مدرسۂ بایزید خاں ادرنہ میں بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف، شرح وقایہ، ہدایہ جیسی امہاتِ کتب کا درس دیا، شرح مطول، شرح تجرید، شرح فرائض جرجانی جیسی ادق کتابوں کا درس بھی اس کے ساتھ شامل ہے[2] اس سے مختلف علوم و فنون میں ان کے تجربہ کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] طرب الاماثل ص ۱۶۷، [2] الشقائق النعمانیہ ۲/ ۸۵۔

مسندِ قضا طاش کبری زادہ کو درس و تدریس سے ہی تعلق خاطر تھا، تحصیل علم کے بعد انھوں نے مسندِ درس کو رونق بخشی اور مختلف مدارس میں یہ خدمت انجام دیتے رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ علم کا بحر بیکراں تھے تمام مدارس کے ارباب حل وعقد آپ سے اپنے مدرسہ کی تدریس کی درخواست کرتے چنانچہ ان کی خاطر یہ خدمت انجام دینے پر آمادہ ہو جاتے، اور پھر کچھ عرصہ بعد دوسرے مدرسہ میں منتقل ہو جاتے، درس و تدریس کو وہ وظیفۂ حیات بنائے ہوئے تھے کہ تا گاہ سلطانِ وقت نے آپ کو رمضان ۹۵۸ھ میں بروسا کی مسندِ قضا پر فائز کر دیا۔ اس منصب کے تفویض کیے جانے کے قبل ہی ایک لطیفۂ غیبی بھی پیش آگیا تھا، اس کی دلچسپ روداد طاش کبریٰ زادہ کی زبانی سننے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں ایک مدرسہ میں خدمت درس انجام دے رہا تھا کہ ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ رسولِ خدا نے مجھے مدینہ منورہ سے ایک تاج بھیجا ہے، یہ ثلث شب کا واقعہ ہے، میں اس خواب کے بعد بیدار ہوا اور اس کے بعد تفسیر بیضاوی کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا، فجر کی نماز کا وقت کا.... ہوا تو میرے پاس شیخ کے پاس سے ایک شخص آیا اس نے سلام کیا اور گویا ہوا کہ شیخ نے کہلایا ہے کہ رات تم نے جو خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم بہت جلد قاضی بنائے جاؤ گے، طاش کبریٰ کہتے ہیں کہ میں نے اس خواب کو اس وقت تک کسی سے ذکر نہ کیا تھا اس لیے میں بہت حیران بھی ہوا لیکن اس پر مجھے یقین ہو گیا کہ شیخ کو کشف ہوا ہے، پھر میں کچھ دیر کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے صورت واقعہ بیان کی اور یہ بھی کہا کہ مجھے منصب قضا کی مطلق طلب نہیں ہے، اس پر شیخ[1] نے فرمایا کہ تم خواہش مت کرو۔

---

[1] یہ شیخ کامل محی الدین محمد بن مولیٰ فاضل بہاؤ الدین تھے جو علم ظاہر و باطن کے جامع تھے، تحصیل علم کے بعد تصوف و سلوک سے شغف ہوا، عارف وقت محی الدین الکلیبی کی صحبت میں حاضر (باقی ص ۱۴۱ پر)

غرض ۹۵۲ھ میں منصبِ قضا کو انھوں نے علی الرغم قبول کیا، یہ عہدہ و منصب آپ کی طبع عالی سے میل نہیں کھاتا تھا اس لیے بہت جلد اس عہدہ سے دست کش ہوکر جب ۹۵۴ھ میں تدریس کے منصب پر واپس آ گئے، مسندِ قضا بڑی ذمہ داری اور جوابدہی کی مسند ہے، ان کے والد کی خدمت میں بھی جب یہ منصب پیش کیا گیا تھا تو انھوں نے اس کو شاہی حکم کی تعمیل میں عارضی طور پر قبول کر لیا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے والد کی وصیت کا اظہار کر کے اس منصب سے کنارہ کش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، طاش کبریٰ زادہ نے اپنے والد کے تتبع اور طبعی رجحان کے نہ ہونے کے سبب اس منصب کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا، لیکن ان کے مرتبے اور ان جیسی فقاہت کے لوگ خال خال تھے، پھر سلطانِ وقت ان کے علم و فضل، تدین و تقویٰ، فقہی مہارت اور دینی بصیرت کا بڑا قدر شناس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم و تدریس کے میدان کو تو دوسرے اہل علم سنبھال

(بقیہ حاشیہ ص۴۱۲) اور ان سے تصوف و سلوک کے مدارج طے کیے، انھوں نے خلافت عطا کی، اس کے بعد شیخ کی اجازت سے قسطنطنیہ کی ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کی اور خدمت خلق اور ان کے اصلاح باطن میں لگ گئے، ان کے مریدین سیکڑوں سے متجاوز ہو گئے، تقویٰ و طہارت پر تھے، حدودِ شرعیہ کی پاسداری کے ساتھ آداب طریقت کی رعایت بھی ہر لحظہ ملحوظ رکھتے، تفسیر، فقہ اور علومِ عربیہ میں کامل دستگاہ تھی، رشد و ہدایت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ان کو خاص ذوق تھا۔ امام اعظمؒ کی فقہ اکبر کی ایک شرح تحریر کی اس میں کلام و تصوف کے مسائل میں تطبیق بہت ہی عالمانہ انداز میں کی، اس کے علاوہ فن تصوف میں دیگر رسائل بھی انھوں نے یادگار چھوڑے، تمام تر عمر عوام الناس کی رشد و ہدایت میں لگے رہے اور ۹۶۲ھ میں انھوں نے قیصریہ میں انتقال کیا۔ (الشقائق ۱/۳۸۴)

سکتے ہیں لیکن مسندِ قضا بہت نازک منصب ہے اور اس میں غیر معمولی احتیاط اور انتہا درجہ کے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے اس کو طاش کبری کی ذات ہی پر کر سکتی ہے اس لیے نہایت اصرار کے ساتھ ان کو قسطنطنیہ کا قاضی ۹۵۸ھ میں بنایا گیا، اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد پوری احتیاط، امانت و دیانت سے اس کو نبھاتے رہے، اس منصب پر فائز ہوتے ہوئے انھوں نے بار بار اس ذمہ داری سے الگ ہونا چاہا لیکن سلطانِ وقت کے الحاح و اصرار سے وہ مجبور ہو جاتے، یہاں تک کہ قدرتی طور پر ۹۶۱ھ میں آشوب چشم میں مبتلا ہوئے، یہ مرض کئی ماہ تک رہا، کچھ عرصہ بعد اس مرض نے سنگین صورت اختیار کر لی اور ان کی بینائی جواب دے گئی، اس طرح اس ذمہ داری سے علیحدگی کے قدرتی اسباب ہو گئے[۱]، صاحبِ شذرات الذہب نے لکھا ہے کہ "ان کا اس مرض میں مبتلا ہونا اس اثر کا مصداق ہوا جس میں آتا ہے کہ

اذا جاء القضاء عمی البصر جب قضا کی ذمہ داری آتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ انھوں نے اس مرض کے بعد اس ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا[۱]، خیر الدین زرکلی نے ان کی حلب کی مسندِ قضا کی ذمہ داری کا بھی ذکر کیا ہے[۲] لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اسی طرح صاحبِ حدائق نے لکھا ہے کہ ۹۵۸ھ میں بھر بروسا کے قاضی ہوئے[۳]، یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، دوبارہ انھوں نے قسطنطنیہ کی قضا کو قبول کیا تھا، تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں اسی کی صراحت ملتی ہے، اس کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے۔

مسلک تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں علامہ طاش کبری کے حالات کے ذیل میں الحنفی کا لفظ بھی بہت نمایاں کرکے ذکر کیا گیا ہے، اس سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اس وقت اقلیم ترکی میں مذہب احناف کو شیوع و قبول حاصل تھا، سلاطین ترکی بھی اسی مذہب کو

---

[۱] شذرات الذہب ۸/۳۵۲، [۲] الاعلام ۱/۸۰ [۳] حدائق الحنفیہ ص ۳۷۹،

اختیار کیے ہوئے تھے، اور ترکی میں سینکڑوں علماء احناف فقہ کی گرانمایہ خدمات انجام دے رہے تھے منصب قضا پر جب فائز ہوئے تو مذہبِ حنفی کے مطابق اس کے رجوع سے مسائل معاملات فیصل کرتے، اور اس سے قبل مختلف مدارس میں فقہ حنفی کی اہاتِ کتب کا درس بھی دیتے رہے، اور مذہب حنفی کی پرزور مدافعت و وکالت کرتے رہے، انھوں نے اپنی یگانۂ روزگار کتاب مفتاح السعادۃ میں جہاں فقہ اور اصولِ فقہ کی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہاں بھی خصوصیت کے ساتھ علماء احناف کے علمی وفقہی کارناموں پران کے قلم نے خوب جولانیاں دکھائی ہیں، یہ اندازِ تحریر ہی مذہب حنفی میں ان کے صلب پر شاہد عدل ہے، مذکورہ بالا کتاب میں امام اعظمؒ کے مناقب وفضائل بہت تفصیل وجامعیت سے بیان کیے ہیں اور ان پر جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کے جوابات بھی بہت ہی سنجیدہ انداز میں رقم کرتے گئے ہیں، امام اعظمؒ کے تلامذہ کے ذکر میں وہ رقمطراز ہیں:

اعلم ان الائمۃ الذین اخذوا العلم من الامام لا یحصون عددا، وقد عرفوا منھم سبعۃ مأتہ وثلثین رجلاً من مشاھیر البلدان وأئمۃ المسلمین الذین وصل الینا العلم سعیھم واجتھادھم جزاھم اللہ عنا وعن الاسلام وعن کافۃ المسلمین خیرا لجزاء وحشرنا معھم وحشرھم مع النبیین والصدیقین والشھداء۔[1]

امام ہمامؒ سے جن ائمہ نے کسب فیض کیا ان کی تعداد بے شمار ہے ان کے صرف سات سو تیس شاگردوں کا پتہ چل سکا ہے اس میں وہ ائمہ عظام اور مشائخ کبار بھی ہیں جن کی سعی وکاوش اور قوتِ اجتہادی سے ہم واقف ہو سکے ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمام مسلمانوں کی طرف سے ان سب کو جزائے خیر عطا کرے اور ہمارا شمار بھی اس نیک زمرہ میں کرے اور ان سب کا حشر انبیاء وصدیقین کے ساتھ کرے۔

---

[1] مفتاح السعادۃ ۲/۱۲۱

ایک دوسری جگہ اپنے مذہب حنفی کا ذکر فخر و مباہات کے انداز میں یوں کرتے ہیں:

"ہم نے علم فقہ کے متون، شروح اور کتب فتاوی کا ذکر اور ان کے مؤلفین کے حالات و کمالات کا ذکر پہلے کر دیا ہے، یہاں بھی اجمال و اختصار کے ساتھ اپنے مذہب حنفی کی معتبر و مستند کتابوں کا ہم ذکر کرتے ہیں ۱؎"

بایں ہمہ مذہب حنفی پر فخر اور الحاق کے انتساب کے باوجود وہ دیگر مسالک و مذاہب کے ائمہ کے ساتھ تحقیر و تضحیک کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ اُن کے ذکر میں بھی انتہائی اعتراف و عجز کا انداز غالب رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے مرتبہ و مقام، ان کے احترام اور ان کے کمالات کے بیان کرنے میں وہ کوئی بخل سے کام نہیں لیتے، اس سے یہ چیز واضح ہوجاتی ہے کہ وہ بے جا عقیدت اور انتہائی غلو کو بالکل پسند نہ کرتے تھے، ائمہ احناف کے بعد ائمہ شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کا ذکر بھی غیر جانبدارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ الشقائق النعمانیہ اور مفتاح السعادۃ میں اس کی بکثرت مثالیں بکھری ہوئی ہیں، عالی ظرفی اور وسعتِ نظر کے ایسے نمونے تذکرہ و تاریخ میں خال خال نظر آتے ہیں۔

اعترافِ فضل و کمال | علامہ طاش کبری زادہ فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ و تذکرہ بلکہ تمام ہی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، لیکن تذکرہ و تاریخ ان کے فکر و نظر کا اصل جولانگاہ اور ان کی کلاہِ افتخار کا طرۂ امتیاز تھے، مؤرخ ابن العماد ان کے علم و فضل پر رقمطراز ہیں:

کان بحرا زاخرا منصفا مصنفا ۲؎ — وہ علم کا بحر زخار اور انصاف پسند مصنف تھے

صاحب معجم المطبوعات کا بیان ہے کہ:

کان بحرا من المعارف والعلوم ۳؎ — وہ علوم و معارف کا بحر ناپیدا کنار تھے،

علامہ نے علوم و فنون میں جامعیت کے متعلق خود یوں روشنی ڈالی ہے:

۱؎ مفتاح السعادۃ ۲/۴۲۸، ۲؎ شذرات الذھب ۸/۳۵۳، ۳؎ معجم المطبوعات۔

میں نے یگانۂ روزگار فضلائے سے کسبِ فیض کیا اور حدیث، تفسیر، فقہ، مناظرہ اور علمِ خلاف میں مہارت تام حاصل کی، اس کے بعد ان اساتذۂ روزگار نے ان علوم میں اجازت سے سرفراز کیا۔[1]

مکارمِ اخلاق | ان کے صحیفۂ کمال میں مکارمِ اخلاق کا باب نہایت نمایاں و تاباں حیثیت رکھتا ہے۔ کم گوئی، شرم و حیا، انکسار، تواضع ان کے نمایاں جوہر تھے، بے نیازی اور پاکبازی اس پر مستزاد، صاحب العقد کا بیان ہے کہ "وہ دنیا سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے، عبادت و ریاضت ان کا وظیفہ تھا، ثباتِ قدمی ان کا شعار، حق گوئی ان کا شیوہ، مداہنت و مجاملت سے گریز کرتے، مقابلہ و مسابقت سے ان کو چڑھ تھی۔"[2]

وہ ایک اور خوبی کا ذکر نہایت ہی عقیدت و احترام کے جذبات سے یوں کرتے ہیں:

"ایک نہایت ثقہ شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک دن علامہ نے اپنے ہاتھ سے زبان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "اس زبان نے تقصیر و گناہ کے بہت سے کام کیے ہیں اور حق و ناحق کا صدور اس سے ضرور ہوا ہے لیکن (خدا کی قسم) دنیوی مناصب کے لیے یہ زبان کبھی وا نہ ہوئی"۔ (العقد المنظوم) ۲/۱۰۰)

علامہ موصوف نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزارا، اور کچھ عرصہ تک منصبِ قضا پر بھی فائز رہے لیکن حرص و آز سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیا، نہایت سادگی، عسرت، عفاف سے زندگی بسر کرتے رہے، اکلِ حلال کے لیے انھوں نے فرصت کے اوقات میں کتابت کا مشغلہ بھی اختیار کر لیا تھا، اس سے ان کو جو یافت ہوتی اس سے طلباء کی امداد اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کرتے، صاحب العقد کہتے ہیں:

---

[1] الشقائق النعمانیہ ۱/۳۸۰، [2] العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم ۲/۹۹-۱۰۰۔

"وہ بہت اچھا اور بہت تیز لکھتے تھے، کتابوں کی نقل بڑی مہارتِ فن سے کرتے۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک کا بیان ہے کہ:

"میں رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات ان کے یہاں کھانے پر حاضر ہوا، اس وقت علامۂ موصوف مدرسۂ قلندریہ میں استاد تھے، ان کی عادت تھی کہ ماہِ مبارک کی ہر رات طلباء کو کھانے پر مدعو کرتے، اسی دوران انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "جب میں مدرسہ اسحاقیہ اسکوب میں درس دیا کرتا تھا تو میں نے سال بھر میں بیضاوی شریف کے ایک نسخہ کی کتابت کی عادت کر لی تھی، اس کو میں تین ہزار درہم میں فروخت کرتا اور اس رقم کو طلباء کے کھانے پر خرچ کرتا ہوں"۔ (العقد المنظوم ۲/۹۹- (باقی)

حضرت مفتی صاحب کا حال

حضرت مفتی صاحب کی مسلسل ۳ ماہ سے زیادہ علالت کا اثر سب قارئین برہان پر ہونا لازمی ہے لیکن خود ہم لوگوں کو اس سلسلے میں جن حالات سے گذرنا پڑ رہا ہے وہ بڑے صبر آزما ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کا حال یہ ہے کہ اگرچہ وہ افاقہ پذیر ہیں لیکن صحت کی رفتار بہت دھیمی اور سست ہے اور اس بنا پر حضرت مفتی صاحب ندوۃ المصنفین اور برہان کے کاروبار کی نگرانی فرماتے تھے اسے بالکل نہیں کر سکتے اور اب یہ سارا بوجھ ہم لوگوں کو اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھانا پڑ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ شاید ہم کو مزید کاروباری الجھنوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ قارئینِ برہان سے درخواست ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کے لیے دعاء صحت کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس آزمائش سے بخوبی عہدہ برآ فرمائے۔

عمید الرحمٰن عثمانی، جنرل منیجر، ندوۃ المصنفین۔ دہلی ملا۔

وشوابھارتی یونیورسٹی کے فارسی، عربی اور اُردو مخطوطات

از جناب عبدالوہاب صاحب بستوی، سنٹرل لائبریری، وشوابھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، مغربی بنگال۔

تصنیفاتِ امیرخسرو کی مذکورہ اطلاعات مسٹر ہرمن ایتھے، مسٹر چارلس ریو اور کچھ دیگر کتب سے ماخوذ ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے لکھا ہے کہ "ہشت بہشت" کا بزبان دکنی ترجمہ ملک خوشنود نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش سے کیا تھا[1] "اعجاز خسروی" کے بارے میں سید سلیمان ندوی مرحوم کی اطلاع ہے کہ اس کی شرح نواب واجد علی شاہ کے درباری شاعر منشی خیالی رام لکھنوی نے کی[2] مولانا عبدالسلام مرحوم ذکر کرتے ہیں کہ "چہار درویش" کا اردو ترجمہ بنام "نوطرز مرصع" میر عطا حسین تحسین باشندۂ اٹاوہ، یوپی نے ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں کیا[3] اور مشہور مشرقیات کے ماہر فرانسیسی اسکالر گارساں دی تاسی (Garcin detassy) کی اطلاع کے بموجب امیرخسرو کی پہیلیوں کا پہلا مجموعہ پنجاب سے طبع ہوا[4]۔ اور مثنویاں تو تقریباً سبھی بیسویں صدی میں اہل علم کی کوششوں سے شائع ہو چکی ہیں۔

امیر موصوف کی ذکر کردہ کتب کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں ہیں، مثلاً بحرالابرار،

---

[1] تاریخ زبانِ اردو: ص ۸۳۔ [2] مقالاتِ سلیمان حصہ اول: ص ۱۷۰۔ [3] گلِ رعنا: ص ۲۶۔ [4] مقالاتِ گارساں دی تاسی (اردو ترجمہ) حصہ ۲: ص ۳۴۱۔

مرآۃ الصفا،[۵] انیس القلوب، خزائن الفتوح، مناقب ہند، تاریخ دہلی اور قانون استیفا وغیرہ۔ چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں اختلافات ہیں، کچھ اہل قلم امیر موصوف کی تصنیف بتاتے ہیں اور کچھ ان کی تردید کرتے ہیں۔ لہٰذا ان مختلف فیہ کتب کا ذکر قصداً قلم انداز کر دیا گیا۔

امیر موصوف کی ۷۵ سالہ زندگی کے کارنامے دیکھیے کہ ابتدائی عمر کے ۱۹ یا ۲۰ سال کے بعد سات بادشاہوں کی ملازمت، جس کے دوران حکومت کی اہم ذمے داریوں کی انجام دہی، اپنے پیر و مرشد شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت بابرکت میں حاضری، اپنے خانگی معاملات کی نگرانی اور خدائے ذوالجلال کی عبادات وغیرہ۔ ان تمام عظیم فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیے جانا اور تقریباً نوّے[۹۰] کتابیں لکھ ڈالنا۔ یہ ایک عبقری انسان ہی سے ممکن تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ امیر خسرو کی یہی سب سے بڑی نشانیہائے ولایت و کرامت ہیں اور اعجاز خسروی بھی۔

نصابِ مثلّث (منظوم) | مصنفہ مولانا یوسف بدیعی، صفحات ۱۶، کاتب روح اللہ، سالِ کتابت ۲۵ جلوس بادشاہ محمد شاہ غازی، طرزِ کتابت خط شکستہ۔

نسخہ مکمل اور کرم خوردہ لیکن قابلِ استفادہ ہے۔ اس میں کل ستانوے[۹۷] اشعار ایک ہی قافیہ پر مرتب ہیں۔ مصنف موصوف نے طلباء کے لیے اسے لغت کے ڈھنگ پر تیار کیا ہے۔ صنعت یہ اختیار کی گئی ہے کہ بہت سے عربی کے ایسے الفاظ ہیں جن کے پہلے حرف کی حرکت زبر، زیر اور پیش کی تبدیلی سے فارسی کے مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"از یکی لفظی سہ معنی خواہ اے صاحب کمال　　رو تو فا را فتح و کسر و ضم بدیں ترتیب فال"

---

[۵] تذکرۃ الشعراء، دولت شاہ: ص ۲۴۶۔

مثال کے طور پر ذیل کا یہ شعر:
"وان سخنہا راکلام و لیس جراحتہا کلام زیر پس کُلام از ارض جای سخت آمد در گماں"
شعر مذکور میں لفظ کلام کے حرف "ک" کی حرکات ثلاثہ کی تبدیلی سے حسب ترتیب "سخن، جراحت اور جای سخت" فارسی معانی کی وضاحت کی گئی ہے۔
نسخہ ہذا کے دیگر نام "نصاب بدیعی" یا "مثلث اللغات" بھی ہیں اور یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتہ اور مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کے سبحان اللہ مجموعہ میں بھی موجود ہے۔ نیز آخر الذکر لائبریری میں ایک شرح بھی ہے جس کے شارح کا نام محمد سعید بتایا گیا ہے۔ لیکن ایچ۔ ایتھے (H-Ethe) نے شارح کا نام ملا سعد تحریر کیا ہے۔[۱] یہی آخری نام زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جو عام طور پر بحیثیت شارح ملا سعد عظیم آبادی کے نام سے مشہور رہیں۔
مصنف موصوف فرغانہ کے ایک مضافاتی مقام اندجان کے باشندہ تھے۔ بچپن ہی میں اپنا پیدائشی مقام ترک کر کے سمرقند آ گئے جہاں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر مرزا سلطان حسین بایقرا کے عہد حکومت میں ہرات تشریف لے آئے۔ مولانا بدیعی خوشگوی اور اس کے رموز و قواعد میں بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آپ کی وفات ۸۹۶ھ/۱۴۹۱ء میں ہوئی۔ بدیعی کی حیات پر زیادہ تفصیل نہیں مل سکی صرف خواندمیر نے حسب ذیل سطریں لکھی ہیں:

"از ولایت اندجان بود در صغر سن از آنجا بسمرقند شتافتہ آغاز کسب فضائل نمود و در زمان فرخندہ نشان خاقان منصور از ماوراء النہر بہراة تشریف آوردہ در ظل عاطفت مقرب حضرت سلطانی آرام یافت۔ از علم

---

[۱] فارسی کیٹلاگ انڈیا آفس لائبریری (لندن)، جلد ۱: ص ۱۲۴۷۔

وصف مصنف کی مطابق خبر وفی سنہ صاحب حبیب السیر عبد الواسع قرامہ ستھا رسالہ مفیدہ تالیف نمود۔ دو فاتحہ سیاح و تسمیہ مخفا نا مخدومی اتفاق افتاد[1]

ابطال ضرورت | مصنف منشی ٹیک چند بہار، صفحات ۲۲۲، کاتب ابوالطاہر ذوالفقار علی، سالِ کتابت [illegible]، کتابت خط شکستہ نستعلیق بہ صاف اور جستہ اچھی حالت میں ہے۔

یہ نسخہ مکمل ہے جس میں فارسی الفاظ کی تحقیق متصرف لفظی و معنوی کی پورے طور پر تشریح کی گئی ہے اور جا بجا استادان شعرائے فارسی کے اشعار بطور ثبوت مذکور ہیں۔ چنانچہ ٹیک چند بہار دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"حضرات اساتذہ کرام خصوصاً بلغای واجب الاعظام در کلمات تصرفہا می کردہ اند منظور از آں تخفیف در لفظ و توسیع در ابنیہ است و ایں از جہت کمال دستگاہ سخن و اقتدار ایشاں بر سخن بود نہ از جہت عجز طبیعت کہ معروف آں را ضرورت گویند"

اس کے بعد بیاناتِ نسخہ کی تفصیل ذکر کرتے ہیں:

"ایں تصرف منقسم می شود بسہ قسم: تصرف[1] در لفظ فقط، تصرف[2] در معنی فقط، تصرف[3] در لفظ و معنی معاً قسم اول در تصرف لفظی فقط و ایں دو گونہ بود: تصرف بحرف و تصرف[4] با عراب و انواع آں یازدہ بود: اسکان، تحریک، تبدیل، تشدید، تخفیف، ترکیب، قلب، ابدال، اماله، حذف، اشباع[5] الخ"

پورے نسخہ میں استادان شعرائے فارسی کے اشعار جا بجا بطور ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔

غرضیکہ یہ نسخہ طلباء اور معلّمین کے لیے بھی بہت ہی کارآمد ہے۔ یہ شرف المطابع دہلی سے ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء (باقی آئندہ)

---

[1] حبیب السیر، جلد ۳: ص ۲۳۶

وفیات

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

سعید احمد اکبرآبادی

حوادث اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

واحسرتا! آخر ۲۴ر مئی کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بھی ہم سے جدا ہو کر قرب دجوارِ خداوندی کے اپنے اس مسکن حقیقی میں پہنچ گئے جہاں جانے کے لیے جیسا کہ آپ کا ہر ندیم و ہمنشین محسوس کر سکتا تھا، برسوں سے آپ کی روح پر فتوح مضطرب و بے قرار تھی اور عالم اسلام گوہر شب چراغ ملت بیضا سے یکسر محروم ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ گزشتہ سال حضرت شیخ نے رمضان المبارک کا پورا مہینہ جنوبی افریقہ کے ایک مقام اسٹینگر میں گذارا تھا، حسن اتفاق سے اپنے ایک عزیز دوست مسٹر موسیٰ پارک کی نجی دعوت پر راقم الحروف بھی رمضان کے آخری ہفتہ میں ڈربن پہنچا، ڈربن سے اسٹینگر کا فاصلہ ڈیڑھ سو کیلومیٹر ہے جو جنوبی افریقہ کی زندگی میں درحقیقت کوئی فاصلہ ہی نہیں اس لیے جب تک حضرت کا قیام اسٹینگر میں رہا تو وہاں اور اس کے بعد جب آپ ڈربن اور اس کے اطراف و اکناف میں ایک ایک دو دو دن کے لیے قیام فرما ہوئے تو ان سب مقامات پر وقتاً فوقتاً خدمت سامی میں برابر حاضر ہوتا رہا اس اثنا میں میں نے حضرت کی صحت اور نقل و حرکت سے مجبوری و معذوری کا جو حال دیکھا اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ حضرت کا پروگرام جنوبی افریقہ، زیمبیا اور نیروبی کا مکمل دورہ کرنے اور اس کے بعد انگلینڈ جانے کا ہے اور پھر یہ مشاہدہ بھی کیا کہ جہاں کہیں پہنچتے ہیں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے ہزاروں بوڑھے اور جوان

پروانوں کی طرح آپ پر گرتے ہیں تو ان سب چیزوں کے پیش نظر مجھے خیال ہوا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کسی غیبی حکم اور اشارہ پر ہو رہا ہے
اور ساتھ ہی اندیشہ اس بات کا ہوا کہ غالباً اب وہ وقت قریب ہے جب کہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ صدائے غیب حضرت کے سامعہ نواز ہوگی، بعد میں یہ خیال اور اندیشہ دونوں صحیح ثابت ہوئے، کل جو اندیشہ تھا، ابھی پورا ایک برس بھی نہ ہوا تھا کہ آج ایک حقیقت بن کر سامنے آیا اور لاکھوں مسلمانوں کو تڑپا گیا، رہا خیال! تو اس کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ ایک دن باتوں باتوں میں میرے ایک سوال کے جواب میں حضرت نے فرمایا: "عجیب شان ہے، جب تک میرے جسم میں طاقت اور اعضا میں توانائی رہی میری دنیا سہارنپور سے دلی تک محدود رہی، لیکن اب جب کہ میں ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں اور نقل و حرکت کے قابل بھی نہیں رہا تو مجھے ملکوں ملکوں لیے پھر رہے ہیں۔"

اس زمانہ میں گم راہی کے سب سے بڑے سرچشمے دو ہی ہیں ایک افراط زر اور دولت و ثروت کی بہتات اور دوسری تہذیب فرنگ، یہی دو چیزیں ہیں جنھوں نے اسلامی اقدار حیات کو نہایت مضمحل اور کمزور کر دیا ہے اور مسلمان اقوام و ممالک بھی بحیثیت مجموعی شعوری یا لاشعوری طور پر اس سیلاب بلا میں بہتے جا رہے ہیں، پہلے فتنہ کا منبع سعودی عربیہ اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک اور دوسری قسم کے فتنہ کا سرچشمہ انگلستان ہے پھر ان فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا اصولی اور بنیادی ذریعہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کا حقیقی عشق اور یوم حساب کا خوف پیدا کیا جائے تاکہ وہ حبِّ دنیا، حب جاہ اور نفس پروری کے شکنجوں سے آزاد ہو کر ایمان کامل اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہو سکیں، اسلام کے مبلغ کا پہلا اور بنیادی کام یہی ہے، اسلامی کیرکٹر کی یکجا

وہ خط اول ہے جس پر اسلامی تعلیمات کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے، چنانچہ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر اپنی توجہ مبذول رکھی ہے اور قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں یہی ایک مضمون بار بار مختلف اسالیب بیان میں کمال بلاغت و فصاحت اور انتہائی جوش و زور خطابت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کا ترک وطن کر کے مدینہ طیبہ میں قیام پذیر ہونا اور تھوڑے سے وقفہ سے انگلینڈ کا دو مرتبہ سفر کرنا اور ساتھ ہی جنوبی افریقہ اور دوسرے ملکوں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کرنا! ہمارے نزدیک یہ سب کچھ محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت قدرت کے نظام ربوبیت اور اس کے دستور ارشاد و ہدایت کا ایک جزء تھا۔ چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ ان اسفار اور مدینہ طیبہ میں مستقل قیام سے ملت اسلامیہ کو کس درجہ اہم دینی فوائد پہنچے ہیں، تبلیغی جماعت کے جو عظیم الشان کارنامے ہیں وہ بھی حضرت شیخ الحدیث کی توجہ اور فیض باطنی کے مرہون منت ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عالم اسلام سے قطع نظر! اگر آج امریکہ، یورپ، افریقہ اور جاپان میں اسلام کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے اور لاکھوں انسانوں کے دل ایمان محکم اور عمل صالح پیہم کے نور سے روشن ہو رہے ہیں تو دوسری فعال اور متحرک جماعتوں کے ساتھ اس میں حضرت شیخ الحدیث کے فیوض روحانی و باطنی کا بھی بڑا اور گرانقدر حصہ ہے، آپ کی دعوت کیا تھی؟ اس کا خلاصہ آپ کے مرتبہ "تبلیغی نصاب" میں آگیا ہے، جس کو لاکھوں مسلمان روزانہ پڑھتے پڑھاتے یا سنتے ہیں،

تبلیغی اور اصلاحی فیوض و برکات کے علاوہ آپ کے علمی کارنامے بھی بہت شاندار ہیں، اگرچہ مدارس عربیہ کے تمام علوم و فنون متداولہ میں استعداد اعلیٰ اور پختہ تھی لیکن علم

حدیث سے عشق تھا، ایک مدت تک حدیث کا درس اس طرح دیا کہ شہرت دور دور پہنچی، حدیث کے علاوہ بذل المجہود شرح ابی داؤد کی تالیف میں اپنے پیر و استاذ حضرت خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے شریک اور معاون رہے، پھر خود مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری کی شرح متعدد ضخیم جلدات میں لکھی، اگرچہ جرح و تعدیل کے باب میں آپ زیادہ سخت نہیں ہیں، لیکن ان شروح کی خصوصیت روایات اختلاف کے استیعاب و استقصا ہے، جس کی وجہ سے حدیث کا ایک طالب علم دوسری کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، پھر عربی زبان اس درجہ شستہ اور شگفتہ ہے کہ پڑھتے جائیے اور جھومتے جائیے، اردو میں بھی چند کتابیں جو مفید اور قابل مطالعہ ہیں، ان میں آپ بیتی، جو تین جلدوں میں ہے سب سے اہم کتاب ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں، تہذیب نفس و تجلیۂ اخلاق کا سامان بھی ہوتا ہے،

حضرت مرحوم سے میری پہلی ملاقات دار العلوم دیوبند میں طالب علمی کے زمانہ میں ہوئی۔ ایک مرتبہ میں اور مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی سہارنپور گئے، تو حضرت سے ملاقات کی غرض سے اُن کے مکان پر بھی حاضر ہوئے، مفتی صاحب اور شیخ الحدیث میں دوستی اور بے تکلفی تھی، صبح کا وقت تھا، شیخ الحدیث بڑے تپاک سے ملے، تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی، مگر یہ صرف چائے تھی، وہ حضرت نے ہمارے سامنے رکھدی ہم نے چائے بنا کر ابھی دو گھونٹ لیے ہوں گے کہ ایک شخص ایک خوان لیے ہوئے آیا، حضرت بہت خوش ہوئے اور وہ خوان جس میں انڈے، توس اور مکھن وغیرہ تھا ہمارے سامنے رکھ کر بولے، یہ لیجیے، آپ کی قسمت سے پورا ناشتہ آگیا، پھر فرمایا، جو چیز جس کی قسمت میں لکھی ہے وہ اس کو ضرور ملے گی، خواہ عنوان کچھ ہی ہو، مثلاً اگر کسی کی قسمت میں موٹر کی سواری لکھی ہے،

تصدیق ضرور بیجئے گا، چاہے شاگرد کی حیثیت سے ہی ہو، یہ زمانہ حضرت کے
عین شباب کا تھا، دوہرا بدن، دراز قامت، نہایت سرخ و سفید، تو ند نکلی ہوئی، عینک
ستونی پر، دو پلیا ٹوپی سر پر، ایک انبا کرتہ اور تہبند بدن پر، آنکھوں اور چہرہ بشری سے
ذہانت برستی ہوئی، گفتگو میں بڑی روانی اور مزاح اور خندہ بھی ساتھ ساتھ، بس یہ تھے
اس وقت شیخ الحدیث، درس دیتے تھے مگر تنخواہ کبھی نہ لی، ایک ان کے والد کا کتب خانہ
تھا، اسی پر گذر بسر تھی۔

اس کے بعد دہلی، علی گڈھ اور سہارنپور میں بارہا خدمت سامی میں حاضری کا شرف
حاصل ہوا اور واما بنعمۃ ربک فحدث کی تعمیل میں عرض کرتا ہوں کہ ہر مرتبہ جب
میں حاضر ہوا حضرت نے میرے ساتھ خصوصی شفقت و محبت کا وہ معاملہ کیا جو میں نے
کسی کے ساتھ نہیں دیکھا، معمول یہ تھا کہ حضرت مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں اور میں پہنچ گیا
تو اگر فرش پر گاؤ تکیہ سے لگے تشریف فرما ہیں تو فوراً مجھ کو اپنے قریب بلایا اور پھر میرا
ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس اور اگر مسہری پر ہوئے تو مسہری پر بٹھالیا۔ جنوبی افریقہ میں بھی
حضرت نے یہی معاملہ کیا، مجھے شرم آتی اور کبھی عرض کرتا کہ حضرت! بڑے بڑے علماء،
مفتی اور مشائخ آپ کی مسہری کے اردگرد نیچے فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے برا لگتا ہے،
اجازت دیجیے کہ نیچے ہی بیٹھ جاؤں، مگر حضرت میرا ہاتھ پکڑ کر اصرار فرماتے کہ نہیں آپ کا
مقام یہی ہے آپ یہیں میرے پاس بیٹھیے" پھر گفتگو نہایت شفقت اور بے تکلفی سے
فرماتے جس کو سب سنتے تھے، اسی درمیان میں کوئی بات راز کی فرمانی ہوتی تو مجھ کو اور
قریب بلا کر چپکے چپکے کان میں فرماتے، ادھر یہ گفتگو ہوتی اور ساتھ ہی انواع و اقسام
کی لذیذ چیزیں فرمائش کر کے طلب کرتے اور باصرار مجھے کھلاتے رہتے، اللہ اکبر! اک
فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں۔

کئی برس کی بات ہے حضرت بستی نظام الدین اولیاء، نئی دہلی میں قیام پذیر تھے، عصر کے بعد کا وقت تھا۔ میں حاضر ہوا، آپ اس وقت فرش پر گاؤ تکیہ کے سہارے تشریف فرما تھے اور ایک بڑا مجمع سامنے تھا۔ میں مجمع کے قریب پہنچا اور حضرت کی نگاہ مجھ پر پڑی تو فوراً اپنے خدام کو آپ نے اشارہ کیا اور ان خدام نے بڑی پھرتی سے آپ کو اٹھا کر پیچھے والے کمرہ میں ایک مسہری پر گاؤ تکیہ سے لگا کر بٹھا دیا، اب حضرت نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا، یہاں تنہائی تھی، موقع پا کر میں نے عرض کیا: حضرت! میرا جی آپ سے بیعت کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن بیعت کا مقصد حاصل کرنے کے لیے جو فراغت اور یکسوئی درکار ہے وہ مجھے حاصل نہیں ہے اور کوئی بھی کام محض رسماً کبھی نہیں کرتا" فوراً ارشاد ہوا: "میں آپ کو خوب جانتا ہوں، آپ کو بیعت ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے، البتہ اپنے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف آدھ گھنٹہ مجھ کو دے دیجیے"۔ میں نے اقرار کر لیا اور حضرت نے چند معمولات بتا دیے میں نے انھیں گرہ میں باندھ لیا، پھر کیا ہوا؟ وہ کسی سے کہنے کی بات نہیں ہے۔

ایک مرتبہ آنکھ بنوانے کی غرض سے علی گڈھ تشریف لائے، عصر کے بعد میں حاضر ہوا، حضرت فرش پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ مجھ کو حسب معمول اپنے قریب قالین پر بٹھا لیا، اب گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر نے آنکھ کا معائنہ کیا؟ فرمایا: جی ہاں! معائنہ کیا اور کہتا ہے کہ آنکھ آپریشن کے لیے بالکل تیار ہے، پرسوں آپریشن ہو جائے گا" اس کے بعد فرمایا: "مگر ایک اشکال پیدا ہو گیا ہے"۔ عرض کیا: "وہ کیا ہے؟" ارشاد ہوا: مولانا محمد منظور نعمانی کا خط آیا ہے اور اس پر علی میاں کی تصدیق بھی ہے کہ یہ ستمبر کا مہینہ آپریشن کے لیے ناموزوں ہے، آپ نومبر یا دسمبر میں کرائیں"۔ یہ کہہ کر آپ نے خط منگوایا اور پڑھوا کر سنایا۔" اس وقت حاضرین سب خاموش تھے، آخر میں نے ہی جرأت

کی عرض کیا: حضرت! یہ بتائیے کہ آپ شیخ ڈاکٹر شکلا (ماہر امراضِ چشم) کے ہیں یا مولانا نعمانی اور مولانا علی میاں کے؟" ارشاد ہوا: "ڈاکٹر شکلا کا" میں نے گزارش کی: تو پھر آپ جس کے مریض ہیں بات اسی کی ماننی چاہیے، میرے یہ کہنے پر حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا: سبحان اللہ! کیا اچھی بات کہی ہے کہ آپ جس کے مریض ہیں اسی کی بات ماننی چاہیے۔" حضرت پر میرے اس قول کا اتنا اثر ہوا کہ دوسرے دن نماز جمعہ کے بعد لوگوں کو خطاب کیا تو اس میں پھر میرا یہ قول دہرایا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق دو تین ہفتے کے بعد آنکھ کا آپریشن ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے بہر وجوہ کامیاب رہا۔

باخبر اصحاب کو معلوم ہے حضرت نے ایک رسالہ "فتنۂ مودودیت" کے نام سے تحریر فرمایا تھا، آپ نے ایک نسخہ میرے پاس بھی بھجوایا اور بینات میں تبصرہ کی خواہش فرمائی، حضرت کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی جس کی تعمیل ضروری تھی، لیکن دوسری طرف ارشاد نبوی "المستشار مؤتمن" کا تقاضہ تھا کہ جو بات میں حق سمجھتا تھا اس کا برملا اظہار کروں، چنانچہ میں نے تبصرہ لکھا اور حضرت کی رائے سے اختلاف کا اظہار کیا، حضرت نے میرا موقف تسلیم کیا یا نہیں؟ اس کا علم تو نہ ہو سکا، البتہ مدینہ طیبہ سے آپ نے ایک مکتوب گرامی میں میری جرأت اظہار رائے کی داد دی اور دعائیں لکھیں، اس کے بعد بارہا خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر کیا مجال کہ حضرت کی غیر معمولی شفقت میں میں نے کوئی ادنیٰ سا تغیر بھی محسوس کیا ہو، اس سے بہت پہلے جماعت اسلامی ہی کے بارہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آپ کا اختلاف ہوا تھا اور آپ کا بھی معاملہ یہی رہا بلکہ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کے ایک مرید نے میرے خلاف ایک سخت مضمون لکھا، مولانا کو اس کا علم ہوا تو مضمون نگار پر سخت خفا ہوئے اور مضمون تلف کرا دیا۔ عبرت کا مقام ہے، ایک یہ بزرگانِ دین تھے جو اپنے نیازمندوں کے اختلاف رائے کو کس عالی حوصلگی اور فراخدلی سے انگیز کرتے تھے اور ایک

آب وگل کے حضرات ہیں کہ آپ نے ندوان سے اختلاف کیا اور آپ ان کے دشمن قرار دے دیے گئے۔

" بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں حضرت شیخ الحدیث کی ذات گرامی آیۃٌ من آیات اللہ اور ایک حجت ربّانی تھی۔ جتنا باطنی وروحانی فیض اس زمانہ میں آپ سے پہنچا کسی سے نہیں پہنچا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی طرح عجیب دلآویز ودلکش شخصیت تھی۔ دکھ اور درد کے مارے لوگ آتے اور آپ کو دیکھتے ہی سارے غم بھول جاتے اور تسلّی وتشفی پاتے تھے، آپ پر نظر پڑتے ہی خدا یاد آتا اور عشق ومحبت نبوی کی لہریں دل میں دوڑنے لگتی تھیں۔"

اہل دنیا کے لیے ایک مومن کامل اور عارف باللہ کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ شاہی میں فقیری کرتا ہے اور فقیری میں شاہی، حضرت کی زندگی اس کی بہترین مثال تھی آپ کا وجود سر تا سر خیر وبرکت اور بے شبہ ایک موہبت الٰہی تھا۔ اب دنیا اس سے محروم ہو گئی۔ یہ عالم اسلام کا بڑا المیہ ہے، تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔ جہاں اکا[بر] صحابہ آسودۂ خاک ہیں۔

الارواحُ جنود مجندہ کے ارشاد گرامی کے مطابق عالم ارواح میں تو ہم جنس روحوں میں ربط واتصال ہوتا ہی ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ عالم آب وگل میں اگر جسما[نی] اتصال نہیں ہو سکتا تو بعد وفات کم از کم مٹی سے مٹی مل جاتی ہے اور اسی کے لیے کسی شاعر نے کہا ہے ۔ پہنچی وہیں پہ خاک کہ جہاں کا خمیر تھا

رحمۂ اللہ رحمۃً واسعۃً

تبصرے

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، از ڈاکٹر معین الدین عقیل، تقطیع متوسط، ضخامت ۴۲۸ صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت -/27 روپے، پتہ: تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور، پاکستان -

غیر منقسم ہندوستان کی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) اور پھر تحریک آزادی (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۷ء) میں مسلمانوں کا جو رول رہا ہے اور ان میں جس ہمت ومردانگی اور جوش وخروش سے انھوں نے .... حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ بے شبہ ان کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز ووقار ہے، اس کا یہ پہلو دنیا کی تاریخ انقلابات کا ایک نیا باب ہے کہ جنگ وتحریک آزادی، دونوں محاذوں پر قیادت کے علمبردار وہ مردان مجاہد تھے جنھوں نے نہ انقلاب فرانس کا مطالعہ کیا تھا اور نہ حکومت وسیاست کے کسی مکتب میں انھوں نے زانوئے تلمذ کبھی تہ کیا تھا، بلکہ یہ مدرسہ وخانقاہ کے فقیر گوشہ نشین وبے نوا تھے جن کا مشغلہ دن میں قال اللہ وقال الرسول اور شب میں ذکر و تسبیح تھا۔ ملک نے آزادی کے لیے ان کو آواز دی تو اپنے زمانہ کی ایک ترقی یافتہ اور طاقتور قوم سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ بے خوف وخطر اور بے جھجک و بے دھڑک اپنے خلوت خانوں سے باہر نکل آئے اور برادران وطن کے دوش بدوش اس عالی حوصلگی اور بلند ہمتی سے داد شجاعت ومردانگی دی کہ دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے۔ جنگ آزادی میں شکست کے بعد یہ حضرات پھر مسند خانقاہ میں گوشہ نشین ہوگئے، لیکن استخلاص وطن کی کوششوں سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہوئے، چنانچہ ابھی برادران

وطن عزیز کا نگریس نے مکمل آزادی کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے یہ تحریک شروع کردی، لیکن یہ تحریک انگریزوں نے ناکام کر دی، پھر اس کے بعد جب جدوجہد آزادی کا میدان کانگریس کا پلیٹ فارم بنا تو مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی پہلے شخص تھے جنھوں نے اس پلیٹ فارم پر مکمل آزادی کا نعرہ لگایا اور اس کے لیے تجویز پیش کی، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسٹر محمد علی جناح بھی کانگریس کے ممبر تھے اور کانگریس کا مطمح نظر صرف چند حقوق اور اصلاحات کا مطالبہ تھا۔ مولانا حسرت موہانی کے اس نعرہ نے ملک میں آگ لگا دی، جو عافیت کوش تھے انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور جو استقلال وطن کے جذبہ سے سرشار تھے وہ طوق وسلاسل کو مرحبا کہنے کے لیے میدان میں آگئے، پھر کیا کچھ نہیں ہوا؟ حرب وضرب، قید وبند، جائدادوں کی ضبطی، جرمانے اور قرقی، یہ سب کچھ ہوا، مگر مسلمانوں کا قدم تحریک آزادی کے کسی ایک مرحلہ میں بھی کسی سے پیچھے تو کیا آگے ہی رہا، اس عالم دار وگیر میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں علم قیادت تھا ان میں علماء بھی تھے اور اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ بھی، جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کی والہانہ شرکت کا یہ پہلو بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ مسلمان اقلیت میں تھے اور بعضوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً جس تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ ہوتا رہتا تھا اس کی وجہ سے مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے تھے لیکن اس کے باوجود تحریک پاکستان سے قبل محض اللہ پر بھروسہ اور اپنی قوتِ عمل پر اعتماد کے باعث انھوں نے ملک کے بٹوارے یا آزادی کے بعد اپنے حقوق کی تعیین وتشخیص کا سوال نہیں اٹھایا، غرض کہ یہ تھے جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے وہ شاندار کارنامے جو برصغیر کی تاریخ آزادی کا روشن باب ہیں۔

لیکن نہایت افسوس اور شرم کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تاریخ تحریک آزادی پر چھوٹی بڑی جو متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب میں مسلمانوں اور خصوصاً غیرمنقسم

مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ تاریخ نہ ہندو ہوتی ہے اور نہ مسلمان، وہ نہ کانگریسی ہے اور نہ لیگی، وہ جو کچھ سنتی ہے سناتی اور جو کچھ دیکھتی ہے کہتی ہے، لیکن یہ تاریخیں قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، چنانچہ ایک اپنی داستان راجہ اشوک کے عہد سے شروع کرتا ہے اور دوسرا احمد بن قاسم کے فتح سندھ سے افسوس ہے زیر تبصرہ کتاب بھی اس سقم سے پاک نہیں ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا بیان ہوا اور اس میں سر آغاخان، سید امیر علی، پیر مانکی شریف، چودھری رحمت علی وغیرہم کا تذکرہ تو ہو مگر مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم جنھوں نے آزادی کے لیے جانیں کھپا دیں ان کا کہیں نام بھی نہ آئے، غیروں کو کیا کہیے جب خود اپنوں کی کم نگہی کا یہ عالم ہو، ان حضرات کی ارواح عالم بالا میں شکایت کر سکتی ہیں :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر میں تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بہرحال یہ نقص کتاب کا ہے لائق مصنف کا نہیں، کیونکہ کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ کتاب دراصل ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو وہ مسلسل کئی ماہ تک پانچ منٹ فی تقریر کے حساب سے ریڈیو پاکستان سے نشر کرتے رہے تھے، اس بنا پر ظاہر ہے ان کا قلم آزاد کس طرح ہو سکتا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں: "بعض قائدین اس فہرست میں لازمی قبولیت کے حقدار تھے، لیکن سرکاری مصلحتیں آڑے آ رہی تھیں اور چونکہ یہ منصوبہ بنیادی طور پر ریڈیو پاکستان کا تیار کردہ تھا اس لیے ان مصلحتوں سے مفر ممکن نہ تھا" ہمارے خیال میں جب یہ تقریریں ریڈیو سے اس کے ایک خاص فیچر: "تحریک پاکستان —— منزل بہ منزل" کے زیر عنوان نشر ہوئی تھیں تو مناسب تھا کہ کتاب کا نام بھی یہی ہوتا۔ اور اس میں شک نہیں کہ جس عنوان کے

تحت یہ تقریریں ریڈیو کاسٹ ہوئی ہیں اس کے اعتبار سے بہت کامیاب اور معلومات افزا ہیں، اس میں لائق مصنف نے حضرت مجدد الف ثانی سے اپنی داستان شروع کی ہے اور پھر شاہ ولی اللہ کی تحریک، حضرت سید احمد شہید کا جہاد اور بنگال کی اصلاحی تحریکوں، سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی جنگوں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد پاکستان بننے تک کی روئداد مختصر مختصر طور پر بیان کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب عام قارئین اور خصوصاً طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہے۔

<u>محمد تقی میر</u>　از ڈاکٹر جمیل جالبی، تقطیع متوسط، ضخامت ۹۴ صفحات، طباعت وکتابت بہتر، قیمت -/25 روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی — ۱

لائق مصنف اردو زبان وادب کے نامور محقق، مصنف اور نقاد ہیں اور ان کے فطری ذوق تحقیق وادب کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود اب تک متعدد اور ضخیم و بلند پایہ کتابیں ان کے قلم سے شائع ہو کر ارباب علم میں مقبول ہو چکی ہیں، زیر تبصرہ کتاب اُن دو توسیعی خطبات کا مجموعہ ہے جو موصوف نے ۱۹۸۲ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام "بابائے اردو میموریل لیکچرز پروگرام" کے ماتحت دیے تھے، پہلا لیکچر میر کی حیات، سیرت اور شخصیت پر ہے اور دوسرے لیکچر میں میر کے فن اور کلام پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، متقدمین مصنفین کو متاخرین پر تقدم کا شرف تو حاصل ہوتا ہی ہے مزید ایک شرف یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے رہنما کا کام کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی تاخر زمانی کا فائدہ یہ ہے کہ متاخرین متقدمین کی کوششوں سے مستفید ہوتے اور نئے معلومات اور جدید ذرائع و وسائل کی روشنی میں ان پر اضافہ بھی کرتے ہیں،

اس کتاب کا پہلا لکچر اس کی بہترین مثال ہے، اس میں میر کے خاندان، والد میر کی

ولادت اور اس کے سنہ کی تعیین، تعلیم و تربیت، گیارہ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے باعث تلاش معاش میں آگرہ سے دلی آنا، سراج الدین خاں آرزو جو سوتیلے ماموں تھے ان کے پاس سات برس تک قیام کرنا اور انھیں کی تحریض و ترغیب سے شعر گوئی پر مائل ہوتا اور پھر ایک طویل مدت تک در بدر کی خاک چھانتے پھرتا اور کہیں قرار و سکون نہ پاتا، ان سب کے بیان کے بعد بتایا گیا ہے کہ میر نے اپنی آنکھوں سے دلی کی تباہی و بربادی، ملک میں طوائف الملوکی اور شرفا کی زبوں حالی کے دردناک مناظر دیکھے اور خود ان سے گذرے تھے ان سب نے مل جل کر میر کی شخصیت پر کیا اثر ڈالا جس کے خمیر سے ان کی شاعری کا ہیولیٰ تعمیر ہوا ہے، پھر میر کی تصنیفات کا تذکرہ ہے اور اس سلسلہ میں نکات الشعرا کا تحلیلی و تنقیدی مطالعہ کر کے جو داد تحقیق دی گئی ہے وہ بہت قابل قدر و لائق تحسین ہے، دوسرا لکچر میر کی شاعری پر ہے، میر اگرچہ غزل کے شہنشاہ کج کلاہ تھے، لیکن نہایت پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے، انھوں نے ہر قسم کی مثنویاں لکھی ہیں اور قصیدہ نگاری بھی کی ہے، ڈاکٹر جالبی نے ان سب کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر میر کے تغزل کی صوری و معنوی خصوصیات اور اس کے اسباب و عوامل پر بحث کرنے کے بعد میر کی مثنویوں، قصائد اور مراثی کا تحلیلی و تجزیاتی مطالعہ کیا اور ان اصناف سخن میں میر کے مرتبہ و مقام کا تعین کیا۔

لیکن ہم کو لائق مصنف سے ہی نہیں آج کل کے تمام تنقید نگاروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ شعر پر بھی عمل جراحی اس طرح کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی کوئی منطق یا ریاضی کا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ قطعی اور یقینی ہونا چاہیے، حالانکہ یہ طرز فکر غلط ہے کیونکہ اگرچہ شعر جذبات کا ترجمان ہوتا ہے، لیکن ہمارے ہاں بعض اوقات ایک شاعر شعر محض رسماً و روایۃً کہتا ہے اور اس وقت اس کے دل میں کوئی جذبہ نہ ہوتا۔ مثلاً طرحی مشاعرہ کے لیے ایک غزل اپنے لیے اور چار پانچ غزلیں شاگرد

کے لیے لکھنا، پھر اگر شعر کا محرک درحقیقت کوئی جذبہ ہو بھی تو اس کی کیفیتیں اور مظاہر مختلف اور گوناگوں اور بعض اوقات متضاد ہوتے ہیں مثلاً ایک ہی شخص کا غم کبھی مثبت ہوتا ہے اور کبھی منفی، مثلاً حالی صاحب لکھتے ہیں: میر کے غم میں تلخی، بیزاری، زہر بھری یاسیت کے بجائے صبر، تسلیم و رضا اور جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے اور " میر کا غم بھی مثبت اور حیات افزا ہے" (ص ۱۰۵) حالانکہ کلیات میر میں ایسے اشعار بھی کم نہیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا غم منفی بھی تھا، مثلاً یہ شعر: ~

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

پھر موصوف کی رائے میں تضاد بھی ہے، میر کا غنائی شاعری میں حافظ سے موازنہ کرتے ہوئے (جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے، کیونکہ حافظ کا جواب تو فارسی شاعری میں بھی پیدا نہیں ہوا) ایک جگہ لکھتے ہیں: میر کے ہاں یہ وصف (زبان اور لگاوٹ کی قدرتی آمیزش) اردو کے سب شاعروں سے زیادہ ہے اور انھیں حافظ کے برابر لا کھڑا کرتا ہے" (ص ۱۰۶) لیکن دوسری جگہ لکھتے ہیں: " حافظ کی غنائی قوتوں کو کوئی شاعر نہیں پہنچا اور میر بھی وجد آفرینی میں ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں" (ص ۱۲۴) حالی صاحب نے میر کا شعر: جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے، کئی جگہ نقل کیا ہے، اس شعر کا دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے: اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے، یہ میر کی زبان سے زیادہ قریب اور بلیغ بھی ہے۔

علاوہ ازیں ہم اپنا یہ خیال بھی صفائی سے پیش کر دینا چاہتے ہیں کہ میر نے بچپن میں جو فقر و فاقہ اور آلام و مصائب کی جو زندگی بسر کی تھی اس نے جہاں ان کی فکری قوتوں کو ابھارا میر کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی جارحانہ انا اسی کا نتیجہ تھی اور اسی کی وجہ سے ان کے مزاج میں چڑچڑاپن اور جھنجھلاہٹ کے عیوب پیدا ہو گئے تھے، فحش گوئی، اور بدکلامی جس کا اظہار ان کی نظم و نثر دونوں سے ہوتا ہے وہ بھی اسی نفسیاتی مرض کا شاخسانہ تھی، بہرحال ان چند معمولی فروگذاشتوں سے قطع کتاب بڑی تحسین اور دقت نظر سے لکھی گئی ہے اور اس سے میریات کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ

سنہ ۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ [illegible]
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم الفقہ، تاریخ ملت حصہ [illegible]
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث، اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید مع اضافہ و ترتیب)، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند [illegible]

سنہ ۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات [illegible]

سنہ ۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء [illegible]

سنہ ۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

سنہ ۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے [illegible]
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

سنہ ۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ، سرکشی ضلع بجنور، علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں،
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

سنہ ۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ [illegible]۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

سنہ ۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم۔ تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

No. D. (DN) 231 PHONE : 26 28 15 JUNE 1982

Subs. 25.00 Per Copy Rs. 2-50

حمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر "برہان" اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا